مسائل اجتہاد

مولانا وحید الدین خاں

فہرست مضامین

تقلید اور اجتہاد

تقلید اور اجتہاد

انسانی ذہن کی دو قسمیں ہیں ـــــــ تقلیدی اور اجتہادی۔ تقلیدی ذہن اور اجتہادی ذہن کے فرق کو سادہ طور پر اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ تقلیدی ذہن سے مراد بند ذہن ہے اور اجتہادی ذہن سے مراد کھلا ذہن۔ تقلیدی انسان کا ذہنی سفر ایک حد پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ اس کے برعکس اجتہادی انسان کا ذہنی سفر برابر آگے کی طرف جاری رہتا ہے، وہ موت سے پہلے کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اس فرق کو ایک مثال سے سمجھئے۔

شیکسپئر انگریزی زبان کا بہت بڑا ادیب ہے۔ اس کی وفات ۱۶۱۶ء میں ہوئی۔ دوسرا، بعد کے زمانہ کا انگریزی ادیب جارج برناڈ شا ہے، جس کی پیدائش ۱۸۵۶ء میں ہوئی۔ زمانۂ عمل کے اعتبار سے دونوں کے درمیان تقریباً تین سو سال کا فاصلہ ہے۔ برناڈ شا کا مقام انگریزی ادب کی تاریخ میں شیکسپئر سے کم ہے۔ برناڈ شا نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ: میرا قد اگرچہ شیکسپئر سے چھوٹا ہے مگر میں شیکسپئر کے کندھے پر کھڑا ہوا ہوں۔

I am samller in stature than Shakespeare, but I stand upon his shoulder.

یہ مجتہدانہ طرزِ فکر کی ایک مثال ہے۔ اس طرزِ فکر سے بلند نظری اور حوصلہ مندی پیدا ہوتی ہے۔ جس معاشرہ کے لوگوں میں یہ مزاج ہو وہاں ذہنی ارتقاء کا سفر کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رہے گا۔ ہر نسل کے افراد پچھلے لوگوں کے علمی سرمایہ پر اضافہ کریں گے اور اس کو مزید ترقی دے کر اگلی نسل تک پہنچاتے رہیں گے۔

موجودہ مسلم معاشرہ

اب مسلم معاشرہ کو لیجئے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اندر ذہنی ارتقاء کا عمل تقریباً رک گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر مقلدانہ طرزِ فکر کا رواج ہو گیا، اور مجتہدانہ طرزِ فکر کا اس طرح خاتمہ ہو گیا جیسے کہ وہ کوئی برائی ہو اور جس کو چھوڑ دینا ہی بہتر ہو۔ عام طور پر لوگوں کا ذہن یہ بن گیا کہ علم

وتحقیق کا سارا کام علمائے سلف کر چکے ہیں۔ اب ہمارے لئے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ہم ان کی کتابوں کو پڑھیں اور ان کا اتباع کریں۔ مگر اس قسم کی سوچ فکری ترقی کے لئے ایک مستقل رکاوٹ ہے۔ اس معاملہ میں مسلمانوں کے لئے طرزِ فکر کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ یہ دونوں صورتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ میرا قد اسلاف سے چھوٹا ہے مگر میں اسلاف کے کندھے پر کھڑا ہوا ہوں۔

۲۔ میرا قد اسلاف سے چھوٹا ہے اس لئے میں اسلاف کے قدموں میں پڑا ہوا ہوں۔

مذکورہ تقسیم میں پہلا طرزِ فکر مجتہدانہ ہے۔ وہ مسلم گروہ کے علمی اور ذہنی سفر کو مسلسل ترقی کی طرف لے جانے والا ہے۔ جس گروہ کے اندر یہ فکری روایت ہو اس کی ہر اگلی نسل اپنی پچھلی نسل کا مکمل احترام کرتے ہوئے اس کی ترقی کو زینہ کے طور پر استعمال کرے گی۔ اس طرح ہر اگلی نسل اپنی پچھلی نسل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آگے بڑھتی رہے گی۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا طرزِ فکر مقلدانہ ہے۔ وہ مسلمانوں کے ذہنی سفر کو ایک حد پر روک دینے والا ہے۔ اس طرزِ فکر کا بیک وقت دو نقصان ہوگا۔ ایک یہ کہ ایسے لوگ اسلام کے اعلیٰ فکری درجات پر پہنچنے سے محروم رہ جائیں گے۔ وہ اضافہ پذیر معرفت سے آشنا نہ ہوسکیں گے۔ اس کا مزید نقصان یہ ہوگا کہ وہ علمی وفکری میدان میں دوسری قوموں سے پچھڑ جائیں گے۔ انسانیت کے رواں دواں قافلہ میں وہ گردِ راہ بن کر رہ جائیں گے۔

یہ تقلیدی طرزِ فکر عین وہی ہے جس کو جاہلی دور کے مشہور شاعر **عنترہ بن شداد العبسی** (وفات ۶۱۵ء) نے اپنے معلّقہ کے مطلع میں ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

هل غادر الشعراء من متردم

اس کا مطلب یہ ہے کہ پچھلے شعراء نے کیا کوئی جگہ پیوند لگانے کی باقی چھوڑی ہے۔ یعنی وہ سب کچھ کہہ گئے ہیں، اب کسی شاعر کے لئے کوئی چیز باقی نہیں رہی کہ اس پر وہ کچھ اضافہ کرسکے۔

ادب کی دنیا کا یہ طرزِ فکر جب مذہب میں داخل ہوجائے تو اسی کو تقلیدی فکر کہا جاتا ہے۔ اس قسم کا تقلیدی فکر ذہنی ترقی کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ لوگوں کو ذہنی جمود میں مبتلا کر دینے والا

ہے۔اور بلاشبہہ ذہنی جمود سے زیادہ مہلک کوئی اور چیز کسی فرد یا گروہ کے لئے نہیں۔اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے یہاں میں ذخیرۂ حدیث سے چند مثالیں دوں گا۔

احترامِ انسانیت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک واقعہ مختلف راویوں کے ذریعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔صحیح البخاری میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے ایک جنازہ گزرا۔اس وقت آپ بیٹھے ہوئے تھے۔جنازہ کو دیکھ کر اس کے احترام میں آپ کھڑے ہوگئے۔آپ کے ساتھ آپ کے اصحاب بھی کھڑے ہوگئے۔آپ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ تھا (وہ مسلمان کا جنازہ نہ تھا)۔آپ نے فرمایا: **أليست نفساً** (فتح الباری ۳/ ۲۱۴) یعنی کیا وہ انسان نہیں۔

امام البخاری کا یہ ایک عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے لاکھوں حدیثیں جمع کیں۔پھر غیر معمولی محنت کے ذریعہ (مکررات سمیت) ان میں سے ۷۵۶۳ حدیثیں منتخب کیں اور وہ قیمتی مجموعۂ احادیث تیار کیا جو صحیح البخاری کے نام سے ہمارے پاس موجود ہے اور جس کو '**أصح الكتب بعد كتاب الله**' کہا جاتا ہے۔اس اعتبار سے امام البخاری کا کارنامہ اتنا عظیم ہے کہ شاید اس کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔

لیکن بعد کی نسلوں کو یہیں رک جانا نہیں ہے، بلکہ اور آگے بڑھنا ہے۔مثلاً امام البخاری نے مذکورہ حدیث کو اپنے مجموعہ میں کتاب الجنائز (**باب من قام لجنازة يهودي**) کے تحت درج کیا ہے۔اب اگر بعد کے لوگ اپنی سوچ کو امام البخاری کے قائم کردہ ترجمۂ باب تک محدود کرلیں تو وہ اس حدیث کو صرف جنازہ کا ایک معاملہ سمجھیں گے اور اُس سے جنازہ کے مسائل نکالنے پر اکتفا کریں گے۔ان کا ذہنی سفر، اس حدیث کے تعلق سے مسئلۂ جنازہ سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔

اس کے بعد دوسرا گروہ شارحین کا ہے۔جیسا کہ معلوم ہے، احادیث کی شرحیں کثرت سے لکھی گئیں۔ان شارحین نے حدیث اور روایت کے مختلف پہلوؤں پر قیمتی بحثیں کی ہیں۔انہوں نے اس

سلسلے میں بے حد ضروری مواد فراہم کیا ہے۔ یہ مواد بے حد اہم ہے۔ اس سے حدیث کی مختلف جہتیں معلوم ہوتی ہیں جو حدیث کو گہرائی کے ساتھ سمجھنے کے لیے بلاشبہہ ضروری ہیں۔

لیکن اگر بعد کے لوگ حدیث کی ان شرحوں کو حرف آخر قرار دے دیں تو پیغمبر اسلام کی احادیث پر مزید غور وفکر کا عمل رک جائے گا۔ اور یہ فکری ارتقاء کے اعتبار سے بہت بڑے نقصان کا باعث ہوگا۔ مثلاً مذکورہ حدیث کی شرح کرتے ہوئے مختلف علماء نے اس کا جو مفہوم بتایا ہے اس میں حدیث کا ایک اہم پہلو بیان ہونے سے رہ گیا۔ ان مختلف اقوال کو ابن حجر العسقلانی اور دوسرے شارحینِ حدیث کے یہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے مطابق، کسی شارح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا سبب ملائکہ کو بتایا ہے۔ کسی نے لکھا ہے کہ آپ نے کراہت بخور (دھونی) کے لیے ایسا کیا۔ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایسا کیا تھا مگر اب یہ عمل منسوخ ہو چکا ہے۔ (فتح الباری ۳/ ۲۱۵۔۲۱۶)۔ ایک قول کے مطابق، آپ نے اس کو پسند نہیں کیا کہ یہودی کا جنازہ آپ کے سر کے اوپر سے گذرے اس لئے آپ کھڑے ہوگئے (وکرہ أن تعلو رأسہ جنازۃ یہودی، فقام) حدیث کی یہ تمام شرحیں علمی اور اصولی اعتبار سے درست نہیں۔ یہ تمام شرحیں ذاتی قیاس پر مبنی ہیں نہ کہ کسی واقعی علمی دلیل پر۔ حدیث کا ظاہری متن واضح طور پر بتاتا ہے کہ آپ نے اس یہودی کو انسان کی حیثیت سے دیکھا اور بحیثیت انسان آپ اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔ یہ حدیث اپنے متن کے مطابق، احترامِ انسانیت کی ایک عظیم مثال ہے۔

اب اس معاملہ کو موجودہ زمانہ کی نسبت سے دیکھئے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں احترامِ مسلم تو ہے مگر اس میں احترام انسانیت نہیں۔ یہ اعتراض بلاشبہہ غلط ہے۔ قرآن وحدیث کے مختلف حوالوں سے اس کی تردید کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں بلاشبہہ ایک اہم حوالہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ واقعہ میں ملتا ہے۔ اس کو لے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں انسان کا احترام کامل درجہ میں موجود ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان جس کو خدا نے پیدا کیا ہے وہ ہر حال میں قابلِ احترام ہے، خواہ وہ اپنے مذہب

کا ہو یا غیر مذہب کا، خواہ وہ ایک قوم سے تعلق رکھتا ہو یا دوسری قوم سے، حتیٰ کہ اگر وہ بظاہر دشمن قوم کا فرد ہو تب بھی انسان کی حیثیت سے اس کا احترام کیا جائے گا۔ جب کہ مذکورہ شرح کی صورت میں اسلامی تعلیم کا یہ اہم اصول اوجھل ہو جاتا ہے۔

حالات کی رعایت

صحیح البخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ قریش نے بعد کو جب کعبہ کی تعمیر کی تو انہوں نے اس کو حضرتِ ابراہیمؑ کی اساس پر نہیں بنایا بلکہ اس کو بدل کر بنایا (حضرت ابراہیم نے کعبہ کو لمبائی میں بنایا تھا مگر قریش نے اس کو مربع صورت میں بنا دیا۔ انہوں نے قدیم کعبہ کے ایک حصہ کو خالی چھوڑ دیا جس کو اب حطیم کہا جاتا ہے) حضرت عائشہ بتاتی ہیں کہ میں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، آپ کیوں نہیں کعبہ کو دوبارہ ابراہیمی اساس پر بنا دیتے۔ رسول اللہ نے جواب دیا کہ تمہاری قوم (قریش) ابھی جلد ہی کفر کو چھوڑ کر اسلام میں داخل ہوئی ہے۔ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اس سے بھڑک نہ جائے۔ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو میں ضرور ایسا کرتا (فتح الباری ۳/ ۵۱۳)

امام البخاری نے یہ حدیث کتاب الحج (باب فضل مكة و بنيانها) میں درج کی ہے۔ اب اگر بعد کے لوگ امام البخاری کے قائم کردہ اس ترجمۂ باب پر اکتفا کر لیں تو وہ اس حدیث سے صرف فضائل مکہ جیسے مسائل اخذ کریں گے، اس کے علاوہ اور کوئی تعلیم وہ اس حدیث میں دریافت نہ کر سکیں گے۔ حالانکہ اس حدیث میں اسلام کی ایک نہایت اہم تعلیم بیان کی گئی ہے۔

اس تعلیم کو ایک لفظ میں حکمتِ حیات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ صحیح بات یہ تھی کہ کعبہ کی اساس کو دوبارہ حضرت ابراہیمؑ کی اصل اساس پر قائم کیا جائے۔ اس کو مشرکین کی اساس پر چھوڑنا بظاہر ایک غیر صحیح فعل تھا۔ اس کے باوجود آپ نے اس کی تصحیح کی کوشش نہیں کی، کیوں کہ اس وقت کے حالات میں کعبہ کی تعمیر میں یہ تصحیح نئے مسائل پیدا کر سکتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی اس سنت سے یہ اصول اُخذ ہوتا ہے کہ زندگی میں بعض اوقات ایسی صورتِ

حال پیش آتی ہے جب کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ کیا درست ہے (what is right) اور کیا نادرست (what is wrong)۔ بلکہ یہ دیکھا جائے کہ کیا ممکن ہے(what is possible) اور کیا ممکن نہیں ہے(what is impossible)۔

یہ بے حد اہم بات ہے، حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اس اصول کا لحاظ انتہائی ضروری ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی اکثر ناکامیاں اسی لئے پیش آئی ہیں کہ انہوں نے ممکن اور ناممکن کے اعتبار سے معاملہ کو نہیں دیکھا بلکہ اس کو صرف درست اور نادرست کے اعتبار سے دیکھا اور پھر جو انہیں درست نظر آیا اس کی طرف وہ فوراً دوڑ پڑے۔ حالانکہ حالات کے اعتبار سے اس کا حصول ان کے لئے ممکن ہی نہ تھا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بے نتیجہ قربانیاں تمام تر اسی اصول کو ترک کرنے کا نتیجہ ہیں۔

اس مہلک انجام کا واحد سبب تقلید ہے۔ انہوں نے مذکورہ حدیث کو البخاری کے ترجمۂ باب کی بنا پر صرف فضائل مکہ کے اعتبار سے دیکھا، وہ اس کو حکمتِ حیات کے اصول کے طور پر اخذ نہ کر سکے، وہ تقلید کے دائرہ میں بند ہو کر رہ گئے، وہ اجتہاد کی اگلی منزلیں طے نہ کر سکے جس کے بغیر ترقی کا سفر ممکن ہی نہیں۔

نفاذِ احکام میں تدریج

صحیح البخاری کی ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ حضرتِ عائشہؓ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ قرآن میں پہلے جو کلام اترا وہ اس کی مفصّل سورتیں تھیں، ان میں جنت اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگوں کے دل اسلام پر مطمئن ہو گئے تو اس کے بعد حلال وحرام کی آیتیں اتریں۔ اس کے بعد حضرتِ عائشہ کہتی ہیں: **ولو نزل أوّل شئ لا تشربوا الخمر لقالوا لا ندع الخمر ابداً، ولو نزل لا تزنوا لقالوا لا ندع الزنا ابداً!** (فتح الباری ج ۸ ص ۶۵۵) یعنی اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو ضرور لوگ یہ کہتے کہ ہم کبھی شراب نہیں چھوڑیں گے، اور اگر پہلے ہی یہ اترتا کہ تم لوگ زنا نہ کرو تو ضرور لوگ یہ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔

امام بخاریؒ نے اس روایت کو اپنی صحیح میں کتاب فضائل القرآن (باب تالیف القرآن) کے تحت درج کیا ہے۔ اب اگر بعد کے لوگ حضرت عائشہ کی اس روایت کا مطالعہ صرف امام بخاری کے ترجمۂ باب کے تحت کریں تو وہ اس سے صرف فضائلِ قرآن یا تالیفِ قرآن کے مسائل اُخذ کریں گے، اس سے زیادہ کوئی اور چیز انہیں اس روایت میں نہ مل سکے گی۔ حالانکہ اگر غور وفکر کے سفر کو بخاری کے ترجمۂ باب پر روکا نہ جائے بلکہ اس کو مزید آگے جاری رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس روایت میں اسلام کا ایک نہایت اہم مسئلہ بیان ہوا ہے۔

اس روایت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چیز جس کو تطبیقِ شریعت یا نفاذِ شریعت کہا جاتا ہے، اس کے لئے ایک حکمت کا لحاظ کرنا ضروری ہے۔ یہ حکمت تدریجی عمل (gradual process) کی حکمت ہے۔ اسلام کے دورِ اول میں شرعی قانون کا نفاذ ایک تدریجی حکمت کے تحت کیا گیا۔ وہ حکمت یہ تھی کہ پہلے لوگوں کے دلوں میں اطاعتِ احکام کی آمادگی پیدا کی جائے، اور جب یہ داخلی آمادگی پیدا ہو جائے تو اس کے بعد خارجی احکام کا نفاذ کیا جائے۔

اس روشنی میں موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صحیح البخاری کی مذکورہ حدیث کو بس اس کے ترجمۂ باب کے تحت پڑھتے رہے، وہ ترجمۂ باب سے آگے بڑھ کر اس پر غور نہ کر سکے۔ اس تقلیدی طرزِ فکر کا نقصان یہ ہوا کہ وہ اسلام کی اس اہم حکمتِ تدریج کو سمجھنے سے قاصر رہے جو اس حدیث میں بتائی گئی تھی۔

موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں لمبی مدّت سے تطبیقِ شریعت یا نفاذِ شریعت کے نعروں کا شور سنائی دے رہا ہے۔ مثلاً مصر، پاکستان، ایران، سوڈان، افغانستان، الجزائر، انڈونیشیا، نائجیریا، بنگلہ دیش، وغیرہ وغیرہ۔ مگر بے شمار قربانیوں کے باوجود کسی بھی مسلم ملک میں اب تک شرعی قوانین کا نفاذ عمل میں نہ آسکا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں طُول اُمد (الحدید ۱۶) کے نتیجہ میں ضعفِ ایمان پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے اندر وہ ذہنی موافقت اور قلبی آمادگی باقی نہیں رہی تھی جو شرعی احکام کو عملی

طور پر قبول کرنے کے لئے لازمی طور پر ضروری ہے۔ ان کا حال مذکورہ روایت کے مطابق، یہ ہو گیا تھا کہ جب ان کو خمر اور زنا کے احکام کا مخاطب بنایا جائے تو وہ کہہ دیں کہ: **لاندع الخمر ابداً و لاندع الزنا ابداً۔**

مثال کے طور پر اکثر مسلم ملکوں میں پُرجوش مسلم رہنماؤں نے یہ کیا کہ میڈیا کو اسلامائز کرنے کے لئے ٹی وی کے نظام پر قبضہ کیا اور پھر اس کے ذریعہ ''اسلامی پروگرام'' دکھانا شروع کر دیا۔ لیکن وہ عملاً مکمل طور پر بے فائدہ رہا۔ کیوں کہ مسلم گھروں میں ٹی وی سیٹ پر جب یہ اسلامی پروگرام آتے تو گھر والے اس کو دیکھتے ہی نہ تھے۔ وہ اس وقت ٹی وی سیٹ کی سوئی گھما کر دوسرا کوئی تفریحی پروگرام دیکھنے لگتے۔

نفاذِ شریعت کی ہنگامہ خیز کوششوں کے باوجود اس کی مکمل ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں میں اجتہادی فکر موجود نہ تھی۔ وہ صرف تقلیدی فکر کا سرمایہ لے کر میدانِ سیاست میں کود پڑے۔ اس قسم کے تقلیدی فکر کا انجام وہی ہوسکتا تھا جو عملاً پیش آیا۔

میدان عمل کی تبدیلی

صحیح البخاری میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے ایک روایت ان الفاظ میں نقل ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **اُمرتُ بقریةٍ تأکل القری، یقولون: یثرب، وھی المدینه** :(فتح الباری ۴/ ۱۰۴) یعنی مجھے ایک بستی (کی طرف ہجرت) کا حکم دیا گیا ہے، وہ بستیوں کو کھا جائے گی۔ لوگ اس کو یثرب کہتے ہیں اور وہ مدینہ ہے۔

امام بخاری نے یہ حدیث اپنی صحیح میں کتاب فضائل المدینہ (**باب فضل المدینة و أنھا تنفی الناس**) کے تحت درج کی ہے۔ اب بعد کے لوگ اگر اس کو تقلیدی ذہن کے تحت دیکھیں تو وہ اس سے صرف فضائل مدینہ کا مسئلہ نکالیں گے، چنانچہ حدیث کے شارحین نے اس روایت کے تحت زیادہ تر اسی قسم کی بحثیں کی ہیں۔ مثلاً اکثر شارحین حدیث اس کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ مدینہ کو یثرب کہنا مکروہ ہے اس کو صرف مدینہ یا مدینہ منورہ کہنا چاہئے۔

جیسا کہ معلوم ہے، قرآن میں مدینہ کے لئے یثرب کا لفظ استعمال ہوا ہے (الاحزاب ۱۳) اس قرآنی استعمال سے مذکورہ تاویل پر زد پڑتی ہے۔ چنانچہ اس کی توجیہہ محض ذاتی قیاس کے تحت یہ کرلی گئی کہ وہ صرف غیر مسلموں کے قول کی حکایت ہے (فتح الباری ۴/۱۰۵)۔

لیکن اگر تقلیدِ اسلاف سے آگے بڑھ کر اس حدیث پر مجتہدانہ انداز سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی طریقِ کار کا ایک اہم اصول بیان کیا ہے۔ اس اصول کو ایک لفظ میں، میدانِ عمل کی تبدیلی کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مکہ میں اہل اسلام کے لئے احوال سخت ہوگئے تو اللہ نے حکم دیا کہ تم مکہ سے نقلِ مکانی کرکے عرب کے دوسرے شہر یثرب چلے جاؤ۔ وہاں تم کو مکہ کے مقابلہ میں موافق حالات ملیں گے، یہاں تک کہ وہ اسلام کا مرکز بن جائے گا اور لوگ اس کو یثرب کے بجائے مدینۃ الرسول یا مدینۃ الاسلام کہنے لگیں گے۔

موجودہ دنیا میں عملی کامیابی کا یہ ایک نہایت قیمتی اصول ہے۔ اس اصول کو ''ہجرت'' کہا جاسکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک مقام پر تم کو موافق حالات نہ مل رہے ہوں تو تم وہاں سے نکل کر دوسرے مقام پر چلے جاؤ۔ ٹکراؤ کے طریقہ سے مقصد حاصل نہ ہو رہا ہو تو مفاہمت کے طریقہ سے اپنا مقصد حاصل کرو۔ تشدد کے ذریعے کامیابی نہ مل رہی ہو تو امن کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

واقعات بتاتے ہیں کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اپنے تقلیدی ذہن کی بنا پر اس عظیم حکمت کو دریافت نہ کرسکے۔ اس کے نتیجہ میں انہیں زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ مثلاً وہ مختلف مقامات پر اسلام کے نام سے پُرتشدد تحریکیں چلا رہے ہیں جس کے نتیجہ میں مسلمان بے شمار جانی اور مالی نقصان سے دوچار ہو رہے ہیں۔ مگر اپنے تقلیدی ذہن کی بنا پر وہ مذکورہ حکمتِ نبوی کو دریافت نہ کرسکے۔ حالاں کہ اگر ان کے اندر اجتہادی ذہن ہوتا تو مذکورہ حدیث میں ان کو اس کا حل معلوم ہو جاتا۔ اس کے بعد وہ پر تشدد طریق کار کو چھوڑ کر پر امن طریق کار کا انداز اختیار کر لیتے اور پھر قانونِ فطرت کے مطابق، وہ کامیابی کے مرحلے تک پہنچ جاتے۔

مذکورہ مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقلیدی فکر کیا ہے اور اجتہادی فکر کیا۔ ایک لفظ میں تقلیدی فکر گویا پہلے زینہ پر رک جانے کا نام ہے۔ اس کے مقابلہ میں اجتہادی فکر اگلے زینوں کو طے کرتے ہوئے اوپر کی منزل تک پہنچ جانا ہے۔ پہلا زینہ اگر چہ ابتدا میں ہوتا ہے مگر اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر پہلا زینہ نہ ہوتو اگلے زینوں کا وجود بھی نہ ہوگا۔

مطالعۂ حدیث کے درجات

ابتدائی دور کے محدثین کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ انہوں نے حدیثوں کی جمع اور تدوین کا انتہائی مشکل کام انجام دیا۔ یہ گویا مطالعۂ حدیث کا ابتدائی درجہ تھا۔ اس کے بعد اگلی نسل کا یہ کام ہے کہ وہ حدیثوں کا جامع انڈکس (index) تیار کر کے حدیثوں سے علمی استفادہ کو آسان بنادے۔ اس کے بعد اس معاملہ کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کے زمانہ میں احادیث کی جو تشریحات کی گئیں ان کو مرتب کیا جائے تاکہ ان احادیث کو سمجھنے کے لئے ابتدائی بیک گراؤنڈ معلوم ہو سکے۔

اس کے بعد اس معاملہ کا چوتھا درجہ یہ ہے کہ ان احادیث کا مطالعہ زمانی حالات کے پس منظر میں کیا جائے تاکہ ان احادیث کا توسیعی مفہوم معلوم کیا جا سکے۔ احادیث کے توسیعی مفہوم سے کیا مراد ہے، اس کے چند نمونے اوپر کی مثالوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح اس معاملہ کا پانچواں درجہ یہ ہوسکتا ہے کہ تمام صحیح احادیث کا مکمل انسائیکلوپیڈیا تیار کیا جائے، تاکہ جدید انسان کے لئے اس کے اپنے مانوس اسلوب میں حدیثوں کا مطالعہ ممکن ہو سکے، وغیرہ۔

حدیث کے مطالعہ کے درجات جو یہاں بتائے گئے، وہ حتمی درجات نہیں ہیں۔ یہ مثالیں صرف اس مسئلہ کو بتانے کے لئے دی گئی ہیں کہ تقلیدی مطالعہ کے مقابلہ میں اجتہادی مطالعہ کا فرق کیا ہے اور اس سے انسان کو کیا فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔

اجتہادی عمل کی اہمیت

اجتہاد محض ایک ذہنی مشغلہ نہیں، اجتہاد اہل اسلام کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ اجتہادی عمل کے ذریعہ اہل اسلام ہر زمانہ میں اپنی دینی حیثیت کو ازسرنو قائم کرتے رہتے ہیں۔ وہ بدلے

ہوئے حالات میں اسلام کو از سر نو منطبق کر کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام ایک ابدی مذہب ہے۔ وہ ہر آنے والے زمانہ میں اتنا ہی مناسب (relevant) ہے جتنا کہ کسی قدیم زمانہ میں۔ گویا کہ اجتہاد کا عمل اسلامی فکر کو مسلسل طور پر مطابقِ وقت (update) بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔

اجتہاد کیا ہے

اجتہاد سے مراد آزادانہ رائے قائم کرنا نہیں ہے۔ اجتہاد سے مراد یہ ہے کہ قرآن وسنت جو اسلام کے اصل مصادر (sources) ہیں، ان پر غور کر کے قیاسی یا استنباطی طور پر شریعت کے نئے احکام معلوم کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد بھی تقلید ہی کی ایک قسم ہے۔ عام مقلد فقہاء کی تقلید کرتا ہے، اور مجتہد وہ ہے جو خدا اور رسول کی تقلید کرے اور قرآن وحدیث کے نصوص پر غور کر کے براہ راست طور پر احکام کا استنباط کرے۔

اجتہاد سے مراد وہی فکری عمل ہے جس کو قرآن میں استنباط (النساء ۸۳) کہا گیا ہے۔ فقہاء کی اصطلاح میں اسی کا نام قیاس ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس بات کو اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اجتہاد سے مراد بالواسطہ اخذِ احکام ہے، جب کہ براہ راست اخذ احکام کی صورت بظاہر موجود نہ ہو۔

استنباط کا لفظ نبط سے ماخوذ ہے۔ نبط کے لفظی معنی ہیں زمین کے اندر سے پانی کا نکلنا۔ استنبط البئر کے معنی ہوتے ہیں کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا۔ اسی سے یہ کہا جاتا ہے کہ "استنبط الفقیہ"، یعنی فقیہ نے قرآن وحدیث پر غور کر کے اس کے پوشیدہ معنی کو نکالا۔ مفسر القرطبی نے لکھا ہے:

الاستنباط فی اللغة، الاستخراج و ھو یدل علی الاجتھاد اذا عدم النص والاجماع (الجامع لأحکام القرآن ،۵/ ۲۹۲) یعنی استنباط کے معنی استخراج کے ہیں۔ اس کا مطلب ہے نص اور اجماع کی غیر موجودگی میں اجتہاد کر کے شریعت کا حکم معلوم کرنا۔

فقہاء اسلام نے دوسری صدی ہجری میں اجتہاد کا یہی کام کیا۔ عباسی خلافت کے زمانہ میں کثرت سے نئے مسائل پیدا ہوئے۔ ان مسائل کا براہ راست یا منصوص جواب بظاہر قرآن وسنت میں موجود نہ تھا۔ اس وقت فقہاء اسلام نے اجتہاد کے ذریعہ اس مسئلہ کو حل کیا۔ انہوں نے قرآن وسنت

کے نصوص سے قیاس یا استنباط کے ذریعہ نئے حالات کے لئے شرعی احکام معلوم کئے۔ اسی اجتہاد کا یہ فائدہ تھا کہ اہل اسلام کے قافلہ نے بدلے ہوئے حالات میں اپنے لئے شرعی رہنمائی پالی۔ تاریخ میں ان کا سفر کسی رکاوٹ کے بغیر مسلسل جاری رہا۔

مگر دوسری اور تیسری صدی ہجری کے بعد اہلِ اسلام کے درمیان بعض اسباب سے ایک غلط تصور قائم ہو گیا، وہ یہ کہ قرآن وسنت سے براہِ راست طور پر جو اجتہاد یا استنباط کرنا تھا وہ اس ابتدائی دور کے فقہاء نے تکمیلی طور پر انجام دے دیا۔ اب براہِ راست نصوص سے احکام اخذ کرنے کی ضرورت نہیں۔ بعد کے مسلمانوں کے لئے کرنے کا جو کام ہے وہ یہ ہے کہ وہ ان فقہاء کی کتابوں کو پڑھیں اور ان پر غور کر کے بعد کے زمانوں کے لئے شرعی احکام معلوم کرتے رہیں۔ اس طرح اسلام کی علمی تاریخ میں عباسی دور کے فقہاء کو مجتہد مطلق کا درجہ مل گیا اور بعد کے دور کے فقہاء کو صرف مجتہدِ مقید کا۔ دور اول کے فقہاء کا اجتہاد قرآن وسنت پر مبنی ہوتا تھا مگر بعد کے علماء کے لئے اجتہاد کا مطلب صرف یہ رہ گیا کہ وہ دور اول کے فقہاء کے دائرہ میں محدود رہتے ہوئے اپنے لئے شرعی احکام کا تعین کریں۔

فکری اُلمیہ

یہی وہ مقام ہے جہاں سے مسلمانوں کے فکری اُلمیہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس فکری موقف نے مسلمانوں کو ایک ٹھہرا ہوا قافلہ بنا دیا۔ امیر شکیب ارسلان (وفات ۱۹۴۶) نے اپنی کتاب ''**لماذا تأخر المسلمون و تقدم غيرهم**'' میں جو بحث چھیڑی تھی، اس کا اصل جواب یہی ہے کہ زمانۂ جدید میں مسلمانوں کے پچھڑے پن کا واحد سبب یہ تھا کہ ان کے درمیان اجتہاد کا عمل رک گیا۔

اجتہاد کوئی اختیاری عمل نہیں، وہ ایک ناگزیر فطری عمل ہے۔ ایسا نہیں کہ اجتہاد خواہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد کے عمل کو روکنا گویا فطرت کے عمل کو روکنا ہے، اور فطرت کے عمل کو روکنا صرف اس قیمت پر ہوتا ہے کہ خود روکنے والا اپنی ترقی کے سفر کو ختم کر دے۔

دریا کی زندگی اس کی روانی میں ہے۔ دریا کے جاری پانی کو اگر روک دیا جائے تو اس کے بعد وہ دریا نہ رہے گا بلکہ وہ ایک متعفن گڑھے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اسی طرح کوئی گروہ اگر اپنے درمیان

اجتہاد کے عمل کو روک دے تو اس کے اندر ایسا جمود پیدا ہوگا جو اس کے لئے ہر قسم کی ترقی کو ناممکن بنا دے گا، صرف مادی ترقی نہیں بلکہ خود مذہبی اور روحانی ترقی بھی۔

ازسرنوغور کرنے کی صلاحیت

مقلد انسان، عوامی مقولہ کے مطابق، صرف لکیر کا فقیر ہوتا ہے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی معاملہ کا ازسرنو اندازہ (reassessment) کر سکے۔ وہ ایک ہی مانوس ڈگر پر چلتا رہتا ہے، خواہ عملاً وہ سراسر بے نتیجہ کیوں نہ ہو۔ اس کے برعکس اجتہادی مزاج رکھنے والا آدمی بار بار معاملات پر نظر ثانی کرتا ہے۔ وہ ماضی اور حال کا مطالعہ کر کے اپنے عمل کا نیا منصوبہ بناتا ہے۔ مقلد انسان اگر ماضی بیں ہوتا ہے تو مجتہد انسان اس کے مقابلہ میں مستقبل بیں۔

اس کی ایک مثال برصغیر ہند کے حالات میں ملتی ہے۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں جب ہندستان میں انگریزوں کا غلبہ ہوا تو اس زمانہ کے مسلم رہنما صرف ایک ہی بات سوچ سکے۔ اور وہ انگریزوں سے مسلح ٹکراؤ تھا۔ دارالحرب اور جنگ وقتال کے قدیم نظریات کے تحت ان کا جو ذہن بنا تھا وہ ان کو صرف ایک ہی سبق دیتا تھا اور وہ یہ کہ انگریزوں سے لڑ کر ان بیرونی دشمنوں کا خاتمہ کریں۔

اس مزاج کے تحت ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو انگریز کی فوجوں سے لڑ گئے۔ اگرچہ اس کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ وہ خود بھی ہلاک ہوئے اور ان کی وسیع سلطنت بھی ختم ہوگئی۔ انہی نظریات کے تحت ۱۸۵۷ء میں مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف مسلّح جنگ چھیڑ دی۔ یہ جنگ مختلف شکلوں میں نصف صدی سے زیادہ لمبی مدت تک جاری رہی۔ اس کا نتیجہ بھی معلوم طور پر مسلم رہنماؤں کی یک طرفہ تباہی کی صورت میں نکلا۔ اس خونیں جنگ کا کوئی بھی فائدہ نہ اسلام کو ملا اور نہ مسلمانوں کو۔

یہ ان لوگوں کی مثال تھی جنہوں نے انگریزوں کے معاملہ کو مقلدانہ نظر سے دیکھا۔ تاہم ٹھیک اسی معاملہ میں مجتہدانہ نظر کی ایک مثال بھی تاریخ میں موجود ہے۔ یہ سید محمد رشید رضا مصری (وفات ۱۹۳۵ء) کی مثال ہے۔ وہ ۱۹۱۲ء (۱۳۳۰ھ) میں مولانا شبلی نعمانی کی دعوت پر لکھنؤ آئے تھے تاکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کر سکیں۔ اس کے بعد وہ دارالعلوم دیوبند آئے جو اس

وقت گویا انگریزوں کے خلاف تحریک کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اس موقع پر دارالعلوم دیوبند میں ایک خصوصی جلسہ ہوا۔ دارالعلوم کی طرف سے مولانا انور شاہ کشمیری نے تقریر کی۔ اس کے بعد سید محمد رشید رضا نے جلسہ کو خطاب کیا۔ انہوں نے اس موقع پر عربی زبان میں جو تقریر کی، وہ دارالعلوم دیوبند کی روداد (۱۳۳۰ھ) میں چھپی ہوئی موجود ہے۔ اس تقریر کا ایک حصہ یہ تھا:

''اسلام کی اشاعت کا دوسرا حصہ غیر مسلموں سے متعلق ہونا چاہئے۔ ہندستان میں صدہا قسم کے بت پرست ہیں، یہاں بتوں کو پوجنے والے، درختوں اور پتھروں کے پوجنے والے، چاند، سورج، ستاروں اور نہایت لغویات اور خرافات کو پوجنے والے بھی موجود ہیں۔ پس اگر ہمارے پاس دعاۃ اور مبلّغین کی ایک مضبوط جماعت موجود ہو تو ان لوگوں میں اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہوگی جو اس وقت ہمارے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ ہمیں عیسائیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ کامیابی ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص بات اور ہے جو ہر ایک دور اندیش مسلمان کی توجہ کے لائق ہے اور وہ یہ کہ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں کے مقابلہ میں اس قدر کم ہے کہ ان کی ہستی کو اس ملک میں ہمیشہ معرض خطر میں سمجھنا چاہئے۔ انگریزی حکومت نے، جو عقل وعدل کی حکومت ہے، غیر مسلموں اور مسلمانوں کے درمیان موازنہ قائم کر رکھا ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ موازنہ کسی وقت ٹوٹ جائے تو آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ کیا نتیجہ ہوگا؟ غالبًا مسلمانوں کا وہی حشر ہوگا جو اندلس میں ہوا تھا۔ اس لئے ایک جماعت ہم میں ایسی ہونی چاہئے جو ان شبہات کو رفع کرے جو اسلام پر عائد کئے جاتے ہیں۔ یہ شبہات جو موجودہ زمانہ کے علوم وفنون کی بنا پر پیدا ہوگئے ہیں، ان کا دور کرنا بہت ضروری ہے۔ مگر ان شبہات کا رفع کرنا بغیر فلسفۂ جدید کی واقفیت کے ناممکن ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس داعی جماعت کے اشخاص فلسفۂ جدید کے اہم مسائل سے واقفیت رکھتے ہوں''۔

(الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۶ فروری، ۱۹۷۰ء، صفحہ ۱۰)

سید محمد رشید رضا کی یہ تقریر مجتہدانہ بصیرت کی ایک مثال ہے۔ حالات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرکے انہوں نے پیشگی طور پر یہ جان لیا تھا کہ غیر منقسم ہندستان میں مسلم اقلیت اور غیر مسلم

اکثریت کے درمیان بظاہر جو موازنہ (balance) قائم ہے وہ ایک تیسری طاقت (انگریز) کی موجودگی کی بنا پر ہے۔ اس تیسری طاقت کے ہٹتے ہی اس کا قائم کردہ موازنہ اچانک ٹوٹ جائے گا۔ اس کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگی وہ اس سے بالکل مختلف ہوگی جو ۱۹۱۲ء میں بظاہر دکھائی دے رہی تھی۔ گویا سیاسی آزادی کا آنا مسلمانوں کے لئے ایک نئے مسئلہ کا آنا ہوگا نہ کہ مسئلہ کا ختم ہونا۔

اس دوررس اندازہ کی بنا پر سید رشید رضا نے ہندستان کے مسلم رہنماؤں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ میدانِ جنگ کے بجائے میدان دعوت میں سرگرم ہوں۔ وہ جنگی تیاری کے بجائے علمی تیاری کریں تاکہ وقت کے تقاضوں کے مطابق مؤثر انداز میں دعوت وتبلیغ کا کام کرسکیں۔ مگر اس وقت کے مسلم رہنما انگریز سے نفرت میں اتنا زیادہ گم تھے کہ وہ یہ سوچ ہی نہ سکے کہ انگریز کی موجودگی میں کوئی مثبت کام کرنا بھی ان کے لئے ممکن ہوسکتا ہے۔ ایک عظیم تاریخی امکان استعمال ہوئے بغیر ختم ہوگیا۔ اور اس کا سبب صرف اجتہادی بصیرت کا فقدان تھا۔ یہاں ہم اجتہادی تأخر کی چند مثالیں دیں گے جن سے اندازہ ہوگا کہ مقلدانہ فکر کو اختیار کرنے کے نتیجہ میں مسلمان کس قسم کے نقصانات سے دوچار ہوئے۔ اجتہادی عمل کو موقوف کرنے کے نتیجہ میں کس طرح وہ دور جدید میں ایک پچھڑا ہوا قافلہ بن کر رہ گئے۔

فقہ کی تدوین دور اقتدار میں

اس حادثہ کی جڑ یہ ہے کہ ہماری موجودہ فقہ خلافت عباسیہ کے زمانہ میں مدون ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اہل اسلام کو عالمی دبدبہ حاصل تھا، ان کو دنیا میں سب سے بڑی سیاسی طاقت کی حیثیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس صورت حال کو ایک شاعر نے اپنے ان الفاظ میں نظم کیا ہے:

ہمیں چھائے ہوئے تھے شرق سے تا غرب دنیا میں　　　نہ تھا پلّہ کسی ملت کا دنیا میں گراں ہم سے

موجودہ فقہ اسی حاکمانہ دور میں مدون ہوئی، اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے دور کا مزاج ان کے اندر داخل ہوگیا۔ یہ مدون فقہ ایک قسم کی حاکمانہ فقہ بن گئی۔

نمونہ موجود نہیں

میں نے ایک مشہور عالم اور مفکر کی تقریر سنی، یہ تقریر ہندستان کے ایک شہر میں ہوئی تھی۔ ان کی

تقریر کا موضوع ''جدید دور میں اسلام'' تھا۔ تقریر کے آخر میں حاضرین میں سے ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ بتائیے کہ ہندستان جیسے ملک میں ہمارے لئے شریعت میں کیا رہنمائی ہے۔ مذکورہ مسلم رہنما یہ سوال سن کر کچھ دیر خاموش رہے، اس کے بعد کہا کہ اس سوال کا جواب بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ اسلامی شریعت میں طاقتور حالت (position of strength) کا ماڈل تو موجود ہے، مگر اسلام میں متواضع حالت (position of modesty) کا ماڈل موجود نہیں۔

میں عرصہ تک یہ سوچتا رہا کہ مذکورہ مسلم رہنما کو اسلامی شریعت میں متواضع حالت کا ماڈل کیوں نہیں ملا۔ آخرکار یہ سمجھ میں آیا کہ مذکورہ مسلم رہنما (دور جدید کے دوسرے مسلم رہنماؤں کی طرح) شریعت اسلام کے نام سے صرف مدوّن فقہ کو جانتے تھے، یعنی وہ فقہ جو اس وقت تیار ہوئی جب کہ اہل اسلام ہر اعتبار سے طاقت اور اقتدار کی حالت میں تھے۔ اس بنا پر اس زمانہ میں بننے والی اسلامی فقہ شعوری یا غیر شعوری طور پر، گویا طاقتوروں کی فقہ ہوگئی۔ وہ طاقت اور اقتدار کی حالت کی نمائندگی کر رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جب مسلم رہنماؤں نے دیکھا کہ اب وہ مطلق اقتدار سے محروم ہو گئے ہیں تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی شریعت انہیں ان کی متواضع حالت کے لئے کوئی مثبت رہنمائی نہیں دے رہی ہے۔ اس بنا پر موجودہ زمانہ میں انہیں اس کے سوا کوئی اور کام نظر نہ آیا کہ وہ اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے دوسروں سے لڑائی چھیڑ دیں۔

دور اقتدار میں مدون ہونے والی فقہ میں بلاشبہہ یہ رہنمائی موجود نہ تھی مگر دور اول میں جو قرآن اترا وہ بلاشبہہ ابدی تعلیمات پر مشتمل تھا۔ اس میں ہر حالت کے لئے رہنمائی موجود تھی، حتیٰ کہ اُس حالت کے لئے بھی جس کو مذکورہ مسلم رہنما نے متواضع حالت سے تعبیر کیا ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ مسلمان ہمیشہ یکساں حالت پر نہیں رہیں گے۔ ان کو کبھی ایک حالت سے سابقہ پیش آئے گا اور کبھی دوسری حالت سے۔ جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: اگر تم کو کوئی زخم پہنچے تو دوسروں کو بھی ویسا ہی زخم پہنچا ہے اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں، تا کہ اللہ ایمان لانے والوں کو جان لے اور تم میں سے کچھ لوگوں کو گواہ بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا (آل عمران ۱۴۰)

پیغمبر اسلام ﷺ پر یہ دونوں حالتیں گزریں۔ آپ کا مکی دور گویا آپ کے لئے متواضع حالت کا دور تھا اور آپ کا مدنی دور گویا آپ کے لئے طاقتور حالت کا دور۔ یہ دونوں حالتیں یکساں طور پر مطلوب حالتیں ہیں، اور دونوں حالتوں کے لئے پیغمبر کی سیرت میں یکساں نمونہ موجود ہے۔ دونوں نمونوں میں سے کوئی نمونہ نہ کمتر نمونہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی برتر نمونہ۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں سارا فیصلہ داخلی نیت پر ہوتا ہے نہ کہ خارجی اعتبار سے سیاسی یا غیر سیاسی حالت پر۔

شتم رسول کا مسئلہ

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ پر شتم کرے، خواہ وہ اشارۃً ہی کیوں نہ ہو، اس کی لازمی سزا قتل ہے۔ شاتم رسول کو بطور حد قتل کیا جائے گا (یقتل حداً) اس معاملہ میں بہت کم کسی قابل ذکر فقیہہ کا استثناء پایا جاسکتا ہے۔ اس حکم کی تفصیل کے لئے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کیجئے:

۱۔ **الصارم المسلول علی شاتم الرسول، ابن تیمیه**

۲۔ **السیف المسلول علی من سب الرسول، تقی الدین ابو الحسن علی السبکی**

۳۔ **تنبیه الولاة والحکام علی أحکام شاتم خیر الأنام أو احد اصحابه الکرام، ابن عابدین الشامی**

اس مسئلہ پر جب بھی کوئی شخص کوئی مضمون یا کتاب لکھتا ہے تو وہ ہمیشہ یہی کرتا ہے کہ ان فقہاء کا حوالہ دے کر یہ ثابت کرتا ہے کہ شتمِ رسول کی سزا اسلام میں قتل ہے، اور یہ کہ یہ ایک ایسا متفق علیہ مسئلہ ہے جس پر شاید کسی فقیہہ کا کوئی اختلاف نہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شریعت کا مسئلہ یہی ہے کہ شاتم رسول کو لازماً بطور حد قتل کیا جائے تو یہ مسئلہ دور اول کے اسلام میں کیوں موجود نہ تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ اُس زمانہ میں بہت سے ایسے افراد موجود تھے جو شتمِ رسول کا فعل کر رہے تھے، مگر انہیں قتل نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایک انتہائی واضح مثال مدینہ کے عبد اللہ بن ابی ابن سلول کی ہے۔ وہ ایک کھلا

ہوا شاتم رسول تھا۔ وہ رات دن شتم رسول کے کام میں مشغول رہتا تھا۔اس کا شاتم ہونا غیر مشتبہ طور پر ثابت تھا۔ پھر بھی لوگوں کے اصرار کے باوجود، رسول اللہ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم نہیں دیا یہاں تک کہ وہ اپنی طبعی موت مرا۔

اس عدم قتل کا سبب کیا تھا۔ علامہ ابن تیمیہ (وفات ۷۲۸ھ) نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ — **وانما ترك النبی صلی علیه وسلم قتله لما خیف فی قتله من نفور الناس عن الاسلام لما کان ضعیفاً (الصارم المسلول علی شاتم الرسول ،۱۷۹)** یعنی رسول اللہ ﷺ صرف اس لیے اس کے قتل سے باز رہے کیوں کہ یہ اندیشہ تھا کہ اس کے قتل سے لوگ اسلام سے برگشتہ ہوجائیں گے، کیوں کہ (اس وقت) اسلام ضعیف تھا۔ دور اول کے زمانہ میں اور عباسی خلافت کے زمانہ میں بننے والی فقہ کے درمیان یہ فرق کیوں۔

جیسا کہ معلوم ہے، فروری ۱۹۸۹ ء میں ایران کے آیت اللہ خمینی نے یہ فتویٰ دیا کہ سلمان رشدی نے اپنی کتاب سیٹینک ورسیز (Satanic Verses) کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی توہین کی ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اس کو قتل کردیں۔ یہ فتویٰ جب چھپا تو غالباً راقم الحروف کے واحد استثناء کو چھوڑ کر دنیا بھر کے تمام مسلمانوں نے اس فتویٰ کی تائید کی۔اس کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ مگر مسلمانوں کی عالمی تائید کے باوجود سلمان رشدی کو قتل کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ مزید یہ کہ قتل کے اس فتویٰ اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی حمایت کے نتیجہ میں اسلام ساری دنیا میں بدنام ہوگیا۔ اور اس کی تصویر یہ بن گئی کہ اسلام خدانخواستہ ایک وحشیانہ مذہب ہے۔

موجودہ زمانہ میں آزادی رائے کو انسان کا سب سے بڑا حق سمجھا جاتا ہے۔ یہ گویا ان کا مذہب ہے۔ اس بنا پر پوری جدید دنیا نے اس فتویٰ کو اپنے مذہب (آزادی) پر براہ راست حملہ سمجھا۔ یہ لوگ پوری طاقت کے ساتھ رُشدی کے دفاع پر آ گئے۔ اسی کے ساتھ جدید میڈیا نے اس معاملہ کو اتنا پھیلایا کہ اس کی خبر ساری دنیا کے تمام انسانوں تک پہنچ گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس اندیشہ کی بنا پر مدینہ کے عبداللہ بن ابی کے قتل سے پرہیز کیا، وہ اندیشہ سلمان رشدی کے خلاف قتل کے

فتویٰ کے نتیجہ میں ہزار گنا زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل اسلام کے لیے پیش آ گیا۔

اب ان دو متقابل نظیروں پر غور کیجئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی نظیر بتاتی ہے کہ شتم رسول کے معاملہ میں، خواہ وہ کتنے ہی زیادہ بڑے پیمانہ پر ہو، یہ دیکھا جائے گا کہ شاتم کو اگر قتل کیا جائے تو اس کا عملی نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر حالات پر اہل اسلام کا اتنا کنٹرول نہ ہو کہ وہ قتل کے منفی نتائج کو روک سکیں تو اہل اسلام قتل کا اقدام نہیں کریں گے۔ وہ اس معاملہ کو اللہ کے حوالہ کر دیں گے۔ اس کے برعکس فقہاء کی مثال بتاتی ہے کہ جب کوئی شخص شتم کا فعل کرے تو اس کو فوراً قتل کر دیا جائے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیوں ایسا ہوا کہ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کی نظیر سے اپنے لیے ہدایت نہیں لی۔ ان کی نظر فقہاء کے مسلک پر اٹک کر رہ گئی۔ فقہاء کی پیروی میں متحد ہو کر وہ قتل شاتم کے علم بردار بن گئے۔

اس سوال کا جواب تقلید ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان متفقہ طور پر یہ رائے بنا چکے تھے کہ اب امت کے لیے براہ راست قرآن وسنت سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ اب صرف اجتہاد مقید ہی کا دروازہ ان کے لیے کھلا ہوا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اب مسلمان براہ راست قرآن اور سنت سے مسائل اخذ نہیں کر سکتے۔ اب ان کے لیے صرف ایک ہی ممکن صورت ہے، اور وہ یہ کہ وہ فقہاء کے فتووں کو جانیں اور پورے تقلیدی جذبہ کے ساتھ اُس پر قائم ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے رشدی کے معاملہ میں یہی کیا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، موجودہ فقہ کی تدوین اس وقت ہوئی جب کہ اہل اسلام کو مکمل اقتدار حاصل تھا۔ ان کو حالات پر اتنا زیادہ کنٹرول تھا کہ کسی قوم کی طرف سے اگر باغیانہ روش کا اندیشہ ہوتا تو خلیفہ صرف دھمکی کا ایک خط لکھتا اور باغی گروہ پست ہمت ہو کر خاموش ہو جاتا۔ اسی قسم کے ایک واقعہ پر عربی شاعر نے یہ پُرفخر شعر کہا تھا:

إذا ما أرسل الأمراء جيشاً الى الاعداء أرسلنا الكتابا

مگر موجودہ زمانہ میں حالات بدل چکے تھے۔ اب اہل اسلام کو پہلے کی طرح حالات پر کنٹرول

حاصل نہ تھا۔ مزید یہ کہ ان کے لیے بہت سے ناموافق حالات پیدا ہو چکے تھے۔ مثلاً آزادی کا موجودہ زمانہ میں خیر اعلیٰ (summum bonum) کی حیثیت اختیار کر لینا اور اظہار رائے کی آزادی کو مقدس حق کے طور پر مان لیا جانا۔ اسی طرح جدید میڈیا کا ظہور میں آنا جو گویا گرم خبر (hot-news) کی عالمی ایجنسی ہے، وغیرہ۔

انہی نئے حالات کا یہ نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کی عالمی حمایت کے باوجود سلمان رشدی کو قتل کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ مزید یہ ناقابل تلافی نقصان ہوا کہ اسلام ساری دنیا میں بدنام ہو گیا۔ جدید انسان کی نظر میں اسلام کی یہ تصویر بن گئی کہ اسلام خدانخواستہ دہشت گردی کا مذہب ہے، وہ اپنے پیروؤں کو مذہبی جنون (fanaticism) کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ نتیجہ تھا بدلے ہوئے زمانہ میں حاکمانہ دور کی فقہ کو نافذ کرنے کا۔

سلمان رشدی کے معاملہ میں موجودہ زمانہ کے مسلمان اگر اجتہاد مطلق کا طریقہ اختیار کرتے تو وہ اس معاملہ میں براہ راست قرآن وسنت سے روشنی حاصل کرتے اور پھر انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس مسئلہ کا حل قتل کا فتویٰ نہیں ہے بلکہ ردّعمل سے بچتے ہوئے پُرامن دائرہ میں اپنی دعوتی کوشش کرنا ہے۔ مگر چونکہ وہ اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر دور اقتدار میں بننے والی فقہ کے اندر اٹکے ہوئے تھے اس لیے ان کو وہی حاکمانہ مسئلہ نظر آیا جو فقہ کی ان کتابوں میں لکھا ہوا تھا، یعنی: **الشاتم يقتل حداً۔**

امن کی طاقت

جدید صنعتی انقلاب کے بعد جب نوآبادیاتی دور آیا اور مغربی قومیں تمام دنیا میں سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے غالب آ گئیں تو یہ مسلمانوں کے لیے ایک نیا مسئلہ تھا۔ ساری مسلم دنیا میں کثرت سے مسلم لیڈر پیدا ہوئے۔ ان تمام لیڈروں کا مشترک ذہن یہ تھا کہ: **الجهاد هو الحل الوحيد** (جہاد ہی واحد حل ہے)۔ مگر تقریباً دوسو سال کی غیر معمولی جدوجہد اور قربانی کے باوجود اس مسلّح جہاد کا کوئی مثبت فائدہ مسلمانوں کو نہیں ملا۔

اس مسئلہ پر اگر قرآن وحدیث کی روشنی میں غور کیا جائے تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حل پُر امن دعوت ہے۔قرآن میں اسی طرح کی صورتحال میں پیغمبر کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ تم اللہ کی دی ہوئی تعلیمات کولوگوں تک پہنچاؤ۔ یہ عمل تمہارے لیے حفاظت کا ضامن ہوگا۔(المائدہ ۶۷) قرآن میں بتایا گیا ہے کہ حکمت کے ساتھ دعوت وتبلیغ کا کام کرو،اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو تمہارا دشمن ہے وہ تمہارا دوست بن جائے گا۔(حم السجدہ ۳۴)

یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قرآن اپنی خاموش زبان میں پکار کر یہ کہہ رہا تھا کہ:**الدعوۃ ھی الحل الوحید** (دعوت ہی واحد حل ہے)۔اس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ دور جدید کے مسلمان قرآن کے اس واضح بیان میں ہدایت نہ پاسکے۔وہ دعوت کے بجائے جہاد(بمعنی قتال) کے میدان میں سرگرم ہو گئے۔جب کہ حالات کے اعتبار سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس قسم کے متشددانہ اقدام کا نتیجہ مزید تباہی کے سوا کچھ اور نکلنے والا نہیں۔

پھر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں سے یہ بھیانک غلطی کیوں ہوئی کہ انہوں نے **الجھاد ھو الحل الوحید** کا غیر قرآنی نظریہ قائم کرلیا۔اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اجتہاد مطلق یعنی قرآن وسنت سے براہ راست اخذِ احکام کو اپنے لئے امر ممنوع قرار دے چکے تھے۔وہ اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر صرف یہ جانتے تھے کہ موجودہ مدون فقہ سے اپنے لیے احکام حاصل کرتے رہیں۔

اب صورت حال یہ تھی کہ فقہ کی یہ کتابیں جہاد وقتال کے احکام سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر فقہی کتاب میں اس کے احکام موجود تھے۔دوسری طرف فقہ کی ان کتابوں کا حال یہ تھا کہ وہ دعوت الی اللہ کے مسائل واحکام سے یکسر خالی تھیں۔ان میں کتاب الجہاد تو تفصیلی طور پر موجود تھا مگر کتاب الدعوۃ یا کتاب التبلیغ سرے سے وہاں موجود ہی نہ تھا۔دعوت کا حکم وہ قرآن میں پاسکتے تھے مگر قرآن کو انہوں نے ماخذ احکام کی حیثیت سے چھوڑ رکھا تھا۔ وہ اخذ احکام کا ذریعہ صرف فقہ کو سمجھتے تھے،اور کتب فقہ کے صفحات دعوتی رہنمائی سے بالکل خالی تھے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتہاد، بالفاظ دیگر،قرآن وسنت سے براہ راست احکام اخذ کرنا

کتنا زیادہ مفید ہے اور تقلید، بالفاظ دیگر، مدون فقہ کو احکام اخذ کرنے کا واحد ذریعہ سمجھ لینا، کتنا زیادہ نقصان دہ ہے۔

یہی غلطی برصغیر ہند کے مسلم رہنماؤں سے اس وقت ہوئی جب کہ انگریزوں کے غلبہ کے بعد انہوں نے ہندستان کے دارالحرب ہونے کا اعلان کیا۔ شاہ عبدالعزیز دہلوی نے ۱۸۲۳ میں یہ فتویٰ دیا کہ ہندستان دارالحرب ہو چکا ہے۔ اس کے بعد پانچ سو علماء نے اپنے مشترک دستخطوں سے یہ فتویٰ جاری کیا کہ مسلمانوں پر جہاد فرض ہو چکا ہے۔ مسلمانان ہند کو چاہئے کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد (قتال) کا آغاز کردیں۔

مسلم رہنماؤں کے ان فتووں اور اپیلوں کے بعد ہندستان کے مسلمان ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد میں مشغول ہوگئے۔ سو سالہ جنگ کے باوجود یہ جہاد عملاً سراسر بے نتیجہ ثابت ہوا۔ مگر عجیب بات ہے کہ آج بھی یہ مسلمان اعلان کے ساتھ یا بلا اعلان یہی سمجھتے ہیں کہ ہندستان دارالحرب ہے اور انہیں جہاد کے ذریعہ اپنے مسائل کو حل کرنا چاہئے۔

یہ عجیب وغریب صورت حال کیوں ہے، اس کا سبب یقینی طور پر یہی ہے کہ اجتہاد اور تقلید کے بارے میں اپنے مذکورہ مقلدانہ مسلک کی بنیاد پر ان کا ذہن بعد کو مدون ہونے والی فقہ میں اٹکا ہوا ہے۔ اور اس فقہ میں ملکوں کی جو تعریف وتقسیم کی گئی ہے، اس کے مطابق، ہندستان جیسا ملک دارالحرب ہی قرار پاتا ہے۔

یہ مسلم رہنما اگر فقہ اور فقہاء کے درمیانی دور سے پیچھے جاتے اور قرآن وسنت کی روشنی میں یہ سمجھنے کی کوشش کرتے کہ ہندستان کی شرعی حیثیت کیا ہے تو یقینی طور پر وہ جان لیتے کہ موجودہ ہندستان ان کے لیے دارالدعوۃ کی حیثیت رکھتا ہے، جیسا کہ دور اول میں اس قسم کے تمام علاقے اہل اسلام کے لیے دار الدعوۃ کی حیثیت رکھتے تھے۔ مگر اجتہاد (براہ راست قرآن وسنت سے مسئلہ اخذ کرنا) ان کے لیے امر ممنوع بنا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر صرف مدون فقہ پر انحصار کیا۔ اور جیسا کہ معلوم ہے، موجودہ مدون فقہ میں صرف دارالحرب کا باب ہے، اس میں دارالدعوۃ کا تصور سرے سے موجود ہی نہیں۔

موجودہ فقہ کافی نہیں

دوسری اور تیسری صدی ہجری میں جو فقہ مدون ہوئی اس کے بارہ میں بعد کو مسلمانوں کا یہ عمومی عقیدہ ہو گیا کہ یہ ایک مکمل فقہ ہے۔ انسانی زندگی سے متعلق قرآن وحدیث کی تمام تعلیمات مفصل اور مکمل طور پر اس میں شامل ہیں۔ یہ عقیدہ اس نظریہ کو حق بجانب ثابت کرتا تھا کہ فقہ کی تدوین کے بعد اب اجتہاد مطلق کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اب صرف اجتہاد مقید (یا مقلدانہ اجتہاد) کا دروازہ مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہے۔

یہ عقیدہ قدیم زمانہ میں بظاہر درست تھا مگر جب حالات بدلے، خاص طور پر جب روایتی دور ختم ہوا اور جدید سائنسی دور آیا تو یہ عقیدہ مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوا۔ مسلمان اپنے تصور کے مطابق، فقہ کو مکمل قانونی نظام سمجھ بیٹھے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں اپنے مسائل کے لئے مدون فقہ سے باہر دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اس بنا پر دور جدید کے مسلمان بہت سی ان قیمتی ہدایات سے محروم ہو گئے جو قرآن وسنت میں تو موجود تھیں مگر مدون فقہ میں ان کو جگہ نہیں ملی تھی۔ چند مثالوں سے اس معاملہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو سیاسی انقلاب آیا اس کے نتیجہ میں ایک نیا سیاسی نظام پیدا ہوا جس کو جمہوریت (ڈیما کریسی) کہا جاتا ہے۔ ہماری موجودہ فقہ اس سے پہلے بادشاہت کے دور میں بنی۔ اس لئے اس میں جدید جمہوریت کا کوئی تصور شامل نہ تھا۔ چنانچہ مدون فقہ کے ڈھانچہ میں سوچنے والے اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں سکے۔ کسی نے اس کو لادینی نظام قرار دے کر اس کو حرام بتایا۔ کسی نے اس کو صرف ''سرشاری'' سمجھا اور یہ کہہ کر اس کا مذاق اڑایا:

جمہوریت ایک طرز حکومت ہے کہ جس میں　　بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مگر اصل حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت مسلمانوں کے لئے ایک سیاسی نعمت کی حیثیت رکھتی تھی۔ قدیم بادشاہت کے برعکس جمہوریت شرکت اقتدار (power sharing) کے اصول پر مبنی ہے۔ جمہوری نظام مسلمانوں کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ حسن تدبیر سے ہر ملک میں سیاسی نفوذ حاصل کر

سکیں۔مگر مسلمان اجتہادی طرزفکر سے محرومی کی بناپر ایسانہ کر سکے۔ان کے مقلدانہ ذہن نے یہ تو سوچا کہ وہ امریکہ جیسے ملک میں خلافت قائم کرنے کی تحریک چلائیں اور کیلی فورنیا کو خیلی فورنیا میں تبدیل کرنے کا مضحکہ خیز خواب دیکھیں۔مگر ان کی سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ وہ شرکت اقتدار کے جدید اصول کواستعمال کرکے امریکہ میں اپنی سیاسی جگہ حاصل کریں۔

موجودہ زمانہ میں مسلم فکر کی اس پس ماندگی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے مجتہدانہ طرزِ فکر، بالفاظ دیگر مدون فقہ سے باہر آکر، براہ راست قرآن وحدیث سے رہنمائی لینے کا دروازہ اپنے اوپر بند کرلیا۔ اگر یہ فکری حادثہ نہ پیش آتا اور وہ کھلے ذہن کے ساتھ قرآن میں تدبر کرتے تو انہیں معلوم ہوتا کہ قرآن اس معاملہ میں انہیں واضح رہنمائی دے رہا ہے۔

یہ رہنمائی قرآن کی سورۃ نمبر ۱۲ میں موجود ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے پیغمبر یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں مصر میں ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ یہ بادشاہ اگر چہ مشرک تھا اور مشرک ہی مرا،مگر اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر وہ اس کے لئے راضی ہوگیا کہ حضرت یوسف کو اپنے سیاسی نظام میں ایک با اختیار شریک کی حیثیت سے شامل کرے۔ یوسف علیہ السلام اپنے ہم عصر بادشاہ کی اس پیش کش پر راضی ہوگئے اوراس کے سیاسی نظام میں ایک حکومتی عہدہ قبول کرلیا۔ یہ عہدہ بظاہر بادشاہ کے تحت وزیر غذاوزراعت کا عہدہ تھا مگر عملاً وہ نائب سلطنت کا عہدہ تھا۔ کیوں کہ قدیم زراعتی دور میں کسی ملک کی تمام اقتصادی اور غیر اقتصادی سرگرمیاں زراعت (ایگریکلچر) پر مبنی ہوتی تھیں۔ اس لحاظ سے حضرت یوسف کو جو عہدہ ملا وہ گویا ملک کے سب سے زیادہ کلیدی عہدہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

دورجدید کے مسلمان اگر فقہی تقلید سے گزرکر براہ راست قرآن پر مجتہدانہ غوروفکر کرتے تو وہ جان لیتے کہ قرآن میں حضرت یوسف کا مذکورہ واقعہ ان کے لئے ایک عظیم پیغمبرانہ نظیر ہے۔ وہ انہیں یہ رہنمائی دیتا ہے کہ وہ جمہوریت کے نئے دور میں شرکت اقتدار کے اصول کو اپنے حق میں استعمال کریں اور یہ یقین رکھیں کہ ان کا ایسا کرنا پیغمبر کے اسوہ کے عین مطابق ہے۔

جدید امکانات کا استعمال

موجودہ زمانہ کے مسلمان عجیب وغریب طور پر ایک استثنائی محرومی سے دوچار ہوئے ہیں۔ اس محرومی میں شاید کوئی بھی دوسری قوم یا دوسرا گروہ ان کا شریک نہیں۔ وہ ہے ـــــ دورِ جدید کے عظیم امکانات کو استعمال کرنے میں ناکام رہنا۔

موجودہ زمانہ میں جن امکانات (opportunities) کا دروازہ انسان کے لئے کھلا، ان میں سے ایک نہایت قیمتی امکان وہ تھا جس کو آزادی (freedom) کہا جاتا ہے۔ فرانس کے انقلابی مفکر روسو نے اپنی کتاب معاہدۂ عمرانی (Social Contract) کا آغاز اس جملہ سے کیا تھا: انسان آزاد پیدا ہوا تھا، مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا پاتا ہوں۔ یہ قول دور جدید کا کلمہ بن گیا۔ یہ تصور اتنا بڑھا کہ موجودہ زمانہ میں مسلّمہ طور پر یہ مان لیا گیا کہ آزادی ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔ ہر انسان کا یہ ناقابل تنسیخ حق ہے کہ وہ جس چیز کو درست سمجھتا ہے اس کو اختیار کرے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اس مطلق آزادی کو مقید کرنے والی صرف ایک چیز تھی، وہ یہ کہ آدمی اپنی آزادی کے استعمال میں جارح نہ بنے، وہ تشدد کے بجائے پرامن ذرائع سے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی وضاحت کے لئے دو متعلق قصے کا ذکر مفید ہوگا جو اس معاملہ کو بخوبی طور پر واضح کرتا ہے۔

۳۰۰ سال پہلے جب امریکہ انگریزوں کے سیاسی غلبہ سے آزاد ہوا تو ایک امریکی شہری خوشی منانے کے لئے ایک سڑک پر نکلا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو زور زور سے ہلاتا ہوا جا رہا تھا۔ اس دوران اس کا ایک ہاتھ ایک راہ گیر کی ناک سے ٹکرا گیا۔ راہ گیر نے غصہ ہو کر کہا کہ یہ کیا نامعقول حرکت ہے (What is this nonsense)۔ امریکی شہری نے جواب دیا کہ اب امریکہ آزاد ہے، اب میں جو چاہوں کروں۔ راہ گیر نے نرمی کے ساتھ جواب دیا کہ بیشک تم آزاد ہو مگر تمہاری آزادی وہاں ختم ہو جاتی ہے جہاں سے میری ناک شروع ہوتی ہے:

Your freedom ends where my nose begins.

یہ قصہ آزادی کے جدید تصور کو نہایت خوبی کے ساتھ واضح کر رہا ہے۔ جدید دور انسان کو مکمل

آزادی دیتا ہے، اس واحد شرط کے ساتھ کہ وہ دوسروں کے ساتھ تشدد نہ کرے۔

مہاتما گاندھی جو اپنی مغربی تعلیم کے دوران اس حقیقت کو جان چکے تھے۔ انہوں نے اس کو ہندستان کی تحریک آزادی میں استعمال کیا۔ جیسا کہ معلوم ہے ۱۸۵۷ میں ہندستان کے مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کے خلاف تحریک آزادی کا آغاز کیا تھا۔ انہوں نے یہ تحریک پرتشدد طریقِ کار کے اصول پر چلائی۔ ۶۰ سال سے زیادہ لمبی مدت تک خونیں جنگ کرنے کے باوجود یہ تحریک ناکام رہی۔ اس کے بعد ۱۹۱۹ میں مہاتما گاندھی نے اس تحریک کی قیادت سنبھالی۔ انہوں نے طریقِ کار کو بدل کر آزادی کی اس تحریک کو پُر امن جدوجہد کے اصول پر چلایا۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں ہندستان آزاد ہو گیا۔

اس فرق کا سبب کیا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ مسلم رہنما اپنے مقلدانہ فقہی ذہن کی بنا پر طریق کار کے نام سے صرف ایک ہی طریقہ کو جانتے تھے اور وہ مسلح جہاد ہے۔ مدون فقہ کی تمام کتابیں پر امن جدوجہد (peaceful struggle) کے تصور سے خالی ہیں۔ یہ کتابیں صرف ایک ہی طریقہ کا تعارف کراتی ہیں اور وہ پرتشدد جدوجہد ہے۔ کیوں کہ یہ کتابیں اس دور میں لکھی گئیں جب کہ انسان طاقت کے نام سے صرف تلوار کو جانتا تھا۔ عربی کا ایک قدیم مقولہ ہے: جنگ کو جنگ کاٹتی ہے (الحرب انفی للحرب)۔ ایک فارسی شاعر نے اس قدیم تصور کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے۔ جو شخص تلوار مارتا ہے اسی کے نام کا سکہ چلتا ہے:

ہر کہ شمشیر زند سکہ بنامش خوانند

یہ عسکری طرز فکر موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں اس طرح سرایت کئے ہوئے ہے کہ شاید کوئی بھی مسلمان اس سے خالی نہیں۔ مختلف شکلوں میں ہر جگہ اس کو دہرایا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ایک فلسطینی ترانہ کا ایک شعر یہ ہے کہ آؤ ہم لڑیں، آؤ ہم لڑیں۔ کیوں کہ لڑائی ہی کامیابی کا راستہ ہے:

هلم نقاتل هلم نقاتل　　فان القتال سبيل الرشاد

قدیم فقہ پر مبنی یہ ذہنی ڈھانچہ (mental framework) اتنا زیادہ عام ہوا کہ نام نہاد جدید

مفکرین بھی اس کے خول سے باہر نہ آسکے۔ مثلاً سید جمال الدین افغانی، سید قطب، ڈاکٹر اقبال، سید ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ۔ یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر موجودہ زمانہ میں ہمارے رہنماؤں کی تمام قربانیاں رائگاں ہو کر رہ گئیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلّح طریقِ کار کے مقابلہ میں پر امن طریقِ کار کس طرح زیادہ نتیجہ خیز ہے اس کا اندازہ مہاتما گاندھی کی ایک مثال سے ہوتا ہے۔ وہ ہندستان کی تحریکِ آزادی میں 1919 میں شریک ہوئے۔ اس وقت تک ہندستان کی تحریک آزادی تشدد کے اصول پر چلائی جارہی تھی۔ برٹش حکومت اس تشدد کو جوابی تشدد سے کچل دیتی تھی۔ مہاتما گاندھی نے اچانک یہ اعلان کیا کہ ہم تشدد کے بجائے عدم تشدد کے اصول پر اپنی تحریک چلائیں گے۔ طریقِ کار کی اس تبدیلی نے برٹش حکومت کو بے بس کر دیا۔ کیوں کہ غیر متشددانہ تحریکِ آزادی کو کچلنے کے لئے اس کے پاس کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ جب مہاتما گاندھی نے تحریکِ آزادی کے لیڈر کی حیثیت سے نیا اعلان کیا تو ایک انگریز کلکٹر نے اپنے سکریٹریٹ کو یہ ٹیلی گرام بھیجا کہ —— براہ کرم یہ بتائیں کہ ایک شیر کو تشدد کے بغیر کیسے ہلاک کیا جائے:

Kindly wire instructions how to kill a tiger non-violently.

خلاف زمانہ روش

موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اور دانشور اپنے مقلدانہ فکر کی بنا پر ایک قسم کی خلاف زمانہ روش (anachronistic attitude) میں مبتلا ہو گئے۔ جن قدیم شخصیتوں کے وہ ذہنی مقلد بنے ہوئے تھے ان کے یہاں پر امن طریقِ کار یا پر امن جدو جہد کا تصور سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ یہ تصور قرآن و سنت میں واضح طور پر موجود تھا مگر براہ راست قرآن وسنت سے حکم اخذ کرنے کے لئے اجتہاد درکار تھا اور انہوں نے پہلے ہی اجتہاد کا دروازہ اس طرح بند کر دیا تھا کہ ایک صاحب کے بقول اب اس کی کنجی بھی گم ہو گئی تھی۔

قرآن میں فطرت کا ایک ابدی قانون ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: ’’الصلح خیر‘‘ (النساء ۱۲۸)

یعنی ٹکراؤ کے طریقہ کے مقابلہ میں مصالحانہ طریقہ زیادہ بہتر ہے۔ یہ واضح طور پر تشدد کے مقابلہ میں عدم تشدد کی اہمیت کی تعلیم ہے۔اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان اللہ یعطی علی الرفق مالا یعطی علی العنف** (صحیح مسلم، کتاب البر) یعنی اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ متشددانہ طریقِ کار کے مقابلہ میں پرامن طریقِ کار زیادہ نتیجہ خیز ہے۔

پرامن طریقِ کار (peaceful method) کے حق میں قرآن وسنت میں اس قسم کی واضح تعلیمات موجود تھیں۔مگر دور جدید کے مسلم رہنما اور دانشور اپنے مقلدانہ ذہن کی بنا پر ان کو دریافت نہ کر سکے، وہ تشدد کی چٹان سے بے فائدہ طور پر اپنا سر ٹکراتے رہے اور بطورِ خود یہ سمجھتے رہے کہ وہ قربانی اور شہادت کی مثالیں قائم کر رہے ہیں۔

اس مقلدانہ ذہن نے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو بے شمار نقصانات پہنچائے اور فائدہ کچھ بھی نہیں دیا۔مثال کے طور پر فلسطین کے عربوں کو اگر یہ راز معلوم ہوتا تو وہ ۱۹۴۸ کے بعد اپنی تباہ کن مسلح جدوجہد نہ چھیڑتے بلکہ وہ پرامن طریقِ کار کو استعمال کرتے ہوئے جدید امکانات سے فائدہ اٹھاتے۔اس کے بعد فلسطین میں ان کو مزید اضافہ کے ساتھ وہی پر عظمت حیثیت حاصل ہو جاتی جو اسی اصول کو استعمال کر کے یہودیوں کو امریکہ میں حاصل ہوئی ہے۔

اسی طرح کشمیر کے مسلمان اگر اس قیمتی راز سے واقف ہوتے تو وہ کشمیر میں گن کلچر اور بم کلچر نہ چلاتے بلکہ اس کے بجائے وہ پیس کلچر چلاتے۔وہ امن کے دائرے میں رہتے ہوئے جدید امکانات کو استعمال کرتے۔اس کے بعد وہ نہ صرف کشمیر میں بلکہ پورے ہندستان میں ایسی باعظمت حیثیت حاصل کر لیتے جو نام نہاد آزاد کشمیر کے مقابلہ میں ان کے حق میں ۱۰۰ گنا زیادہ بہتر ہوتی۔اسی طرح موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما جو مختلف مسلم ملکوں میں ''لڑ کر اقتدار کی کنجی'' چھیننے میں مشغول ہیں، اور اپنے ملکوں کو صرف تباہی میں اضافہ کا تحفہ دے رہے ہیں، وہ اگر پرامن طریق کار کی اہمیت کو جانتے تو وہ اپنے ملکوں کو اب تک اسلامی چمنستان بنا چکے ہوتے۔جیسا کہ سیکولرزم کا عقیدہ رکھنے والوں نے اسی

اصول کواستعمال کرتے ہوئے مختلف ملکوں میں انجام دیا ہے، مثال کے طور پر سنگاپور، وغیرہ۔

تقلیدی نظر اور اجتہادی نظر کا فرق

مولانا سید حسین احمد مدنی (وفات ۱۹۵۷ء) نے لکھا ہے کہ —'' تاریخ بتاتی ہے کہ ہند میں جب مسلمان آئے تو عام طور سے اہل ہند بودھ مذہب رکھتے تھے اور چھوت چھات تو درکنار بیاہ شادی تک بخوشی کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اختلاط نے نہایت قوی تاثیر کی، خاندان کے خاندان مسلمان ہوگئے۔ اس کے بعد جب محمود غزنوی کا زمانہ آیا ہے تو ہندوؤں میں مختلف احوال کی وجہ سے اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ اور شنکراچاریہ لوگوں کو بدھ مذہب سے نکال کر برہمنی مذہب کو اختیار کروانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ اور پھر برہمنی مذہب سارے ملک میں پھیل جاتا ہے۔ برہمن چونکہ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کا سیلاب اختلاط کی بنا پر ان کے مذہب کو مٹا رہا ہے۔ اس لئے انہوں نے عوام میں نفرت کا پروپیگنڈہ پھیلایا اور مسلمانوں کو ملیچھ کا خطاب دیا۔ اکبر نے اس تفریقی خیال اور اس عقیدہ کو جڑ سے اکھاڑنا چاہا۔ اگر اکبر کی جاری کردہ پالیسی جاری رہنے پاتی تو ضرور بالضرور برہمنوں کی یہ چال مدفون ہوجاتی۔ اور اسلام کے دلدادہ آج ہندستان میں اکثریت میں ہوتے۔ اکبر نے عام ہندو ذہنیت اور منافرت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ اکبر نے (اپنی کم علمی کے باعث) نفس دین اسلام میں بھی کچھ غلطیاں کیں، جن سے مسلم طبقہ میں اس سے بدظنی ہوئی، اگرچہ بہت سے بدظنی کرنے والے غافل اور کم سمجھ تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے، صلح حدیبیہ ہی فتح مکہ اور فتح عرب کا پیش خیمہ ہے۔ جس روز صلح حدیبیہ تمام کو پہنچی ہے اسی روز **انا فتحنا لك فتحاً مبينا** کی آیت نازل ہوئی۔ آپس میں اختلاط کا ہونا، نفرت میں کمی آنا، مسلمانوں کے اخلاق اور ان کی تعلیمات کا معائنہ کرنا، دلوں سے ہٹ اور ضد کا اٹھ جانا، یہی امور تھے جنہوں نے قریش کو کھینچ کھینچ کر صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان بناتے ہوئے مکہ سے مدینہ پہنچا دیا۔ الغرض اختلاط باعث عدم تنافر ہے اور وہ اقوام کو اسلام کی طرف لانے والا ہے اور تنافر باعث ضد اور عدم اطلاع علی المحاسن ہے۔ اور وہ اسلامی ترقی میں سدراہ ہونے والا ہے۔ چونکہ اسلام تبلیغی مذہب ہے۔ اس لئے اس کا فریضہ ہے کہ جس قدر ہوسکے غیر کو اپنے میں شامل کرے نہ یہ کہ ان کو دور کرے۔ اس

لئے اگر ہمسایہ قومیں ہم سے نفرت کریں تو ہم کو ان کے ساتھ نفرت نہ کرنا چاہئے۔ اگر وہ ہم کو نجس اور ملچھ کہیں تو ہم کو انہیں یہ نہ کہنا چاہئے۔ اگر وہ ہم سے چھوت چھات کریں تو ہم کو ان سے ایسا نہ کرنا چاہئے۔ وہ ہم سے ظالمانہ برتاؤ کریں تو ہم کو ان کے ساتھ ظالمانہ اور غیر منصفانہ برتاؤ نہ کرنا چاہئے۔'' (مکتوبات شیخ الاسلام، حصہ اول، مکتوب نمبر ۶۳، مطبوعہ مکتبہ دینیہ، دیوبند، صفحہ ۱۴۱۔ ۱۴۶)

مولانا سید حسین احمد مدنی کے اس بیان پر غور کیجئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقلدانہ نظر کس طرح چیزوں کو صرف ان کے ظاہر (face value) پر لیتی ہے، اور مجتہدانہ نظر کس طرح چھپی ہوئی حقیقتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مغل بادشاہ اکبر اگرچہ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر وہ بے حد ذہین تھا۔ اس نے اس راز کو سمجھا کہ اسلام اپنی فطری کشش کی بنا پر ہر انسان کو اپیل کرتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان ضد اور نفرت کی فضا نہ پائی جا رہی ہو۔ اس نے مزید اس حقیقت کو سمجھا کہ برہمنوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری پیدا کر کے اسلام کی اشاعت کو مصنوعی طور پر روک دیا ہے۔ اس دریافت کی بنا پر اکبر نے یہ کیا کہ اس نے کچھ بے ضرر ہندو رسموں کو اپنے دربار میں رائج کر دیا۔ اکبر کی یہ روش ہندو مذہب کو اپنانے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ صرف تالیفِ قلب کے لئے تھی۔ اس کا اصل مقصد اسلام کی اشاعت میں پیدا ہونے والی رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔

لیکن اکبر کے کچھ معاصر علماء اس راز کو سمجھ نہ سکے۔ ان کی نگاہ صرف اکبر کے گیروے کپڑے کو دیکھ سکی۔ اکبر نے جس گہری پالیسی کے تحت وقتی طور پر گیروے کپڑے کو اختیار کیا تھا اس حکمت کو سمجھنے سے وہ قاصر رہے۔ انہوں نے اکبر کے خلاف اتنا طوفان اٹھایا کہ اکبر کا منصوبہ اپنی تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اس معاملہ کو غلط رنگ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندستانی تاریخ کا سفر اسلام کی موافقت میں جاری ہونے کے بجائے اسلام کے خلاف جاری ہو گیا۔ مولانا سید حسین احمد مدنی نے اس معاملہ پر جو تبصرہ کیا ہے وہ مجتہدانہ نظر کی ایک واضح مثال ہے۔ وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت کی بنا پر اس راز کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ معتدل حالات میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اختلاط ہمیشہ اسلام کی اشاعت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔ چھری اور خربوزہ کے درمیان اگر ٹکراؤ ہو تو

جیت ہمیشہ چھری کی ہوگی۔ خواہ چھری کو خربوزہ کے اوپر رکھا گیا ہو یا خربوزہ کے نیچے، حتی کہ اس وقت بھی جب کہ چھری نے بظاہر اپنے آپ کو خربوزہ کے رنگ میں رنگ لیا ہو۔

تنقید اور اجتہاد

تنقید اور تقلید دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ جہاں تقلید ہوگی وہاں تنقید نہیں ہوگی۔ اور جہاں تنقید ہوگی وہاں تقلید نہیں ہوگی۔ اجتہاد کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ اجتہاد لازمی طور پر تنقید چاہتا ہے۔ جہاں تنقید کا ماحول نہ ہو وہاں کبھی اجتہاد کا عمل جاری نہیں ہوسکتا۔

تاہم تنقید کو تنقید ہونا چاہئے نہ کہ تنقیص۔ تنقید علمی اور منطقی تجزیہ کا نام ہے۔ اس کے برعکس تنقیص کا سارا انحصار عیب جوئی اور الزام تراشی پر ہوتا ہے۔ تنقید اگر تنقیص کی صورت اختیار کرلے تو وہ سبّ وشتم ہوگا نہ کہ حقیقی معنوں میں تنقید۔

مثال کے طور پر صلیبی جنگوں کے بعد مسیحی پادریوں نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کتابیں لکھیں۔ انہوں نے عربوں کی تصویر یہ بنائی کہ وہ ایک وحشی قوم ہیں۔ اس کا ایک ثبوت ان کے بیان کے مطابق یہ تھا کہ دوسرے اسلامی خلیفہ عمر فاروق نے جب مصر فتح کیا تو اس وقت وہاں کے شہر اسکندریہ میں ایک بڑا کتب خانہ تھا۔ خلیفہ اسلام کے حکم سے یہ پورا کتب خانہ جلا دیا گیا۔ اس کی تمام قیمتی کتابیں تباہ ہوگئیں۔

اس معاملہ میں مسیحی پادریوں کے جواب کی ایک صورت یہ تھی کہ یہ کہا جائے کہ یہ لوگ اسلام کے دشمن ہیں۔ وہ صلیبی جنگوں میں شکست کا بدلہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے سازش کے تحت کتب خانہ جلانے کی یہ کہانی بنائی ہے، وغیرہ۔ اس قسم کی باتیں تنقید نہیں ہیں بلکہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ صرف سبّ وشتم ہیں۔ اس طرح کی باتیں مسیحی پادریوں کے الزام کا علمی جواب نہیں۔

مگر بعد کو بعض اہل علم نے اس معاملہ کی تحقیق کی اور خالص تاریخی شواہد کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے کہ حضرت عمر فاروق کے حکم سے اسکندریہ کا کتب خانہ جلایا گیا۔ اصل یہ

ہے کہ اسلامی فتح کے وقت یہ کتب خانہ سرے سے موجود ہی نہ تھا۔ واقعات بتاتے ہیں کہ عربوں نے ۶۴۲ھ میں مصر کو فتح کیا۔

جب کہ اس سے بہت پہلے ۴۸ء میں رومی حاکم جولیس سیزر کے حکم سے اسکندریہ کے اس کتب خانہ کو تباہ کیا جا چکا تھا۔ جواب کا یہ دوسرا طریقہ علمی تنقید کی مثال ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے فلپ کے ہٹی کی کتاب 'ہسٹری آف دی عربس' صفحہ ۱۶۶)

تنقید کوئی برائی نہیں، تنقید ذہنی ترقی (intellectual development) کا ذریعہ ہے۔ تنقیدی ماحول کے بغیر ذہنی ترقی کا عمل جاری نہیں ہوسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لئے جو انتخاب (choice) ہے وہ تنقید اور بے تنقید میں نہیں ہے بلکہ تنقید اور ذہنی جمود میں ہے۔ تنقید کو ختم کرنے کے بعد جو چیز ہمارے حصہ میں آئے گی وہ ذہنی ارتقاء کا خاتمہ ہوگا نہ کہ سادہ طور پر صرف تنقید کا خاتمہ۔

اجتہاد کا عمل بحث و مباحثہ (discussion) کے درمیان جاری ہوتا ہے۔ اجتہاد دراصل معلوم سے نامعلوم تک پہنچنے کا دوسرا نام ہے۔ کچھ باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ کچھ مسائل ہوتے ہیں جن کا جواب ہمیں درکار ہوتا ہے۔ اب اگر کھلے اظہار خیال کا ماحول ہوتو ہر شخص آزادانہ طور پر اپنی رائے کو بیان کرے گا۔ اب افکار کا ٹکراؤ وجود میں آئے گا۔ اس طرح آزادانہ فکری تبادلہ کے دوران معاملہ کے نئے پہلو سامنے آئیں گے۔ اس کے بعد تنقیح کا عمل شروع ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ تحقیقی رائے سامنے آجائے گی جو ہماری فکری تلاش کا اصل مقصود تھی۔ اسی فکری عمل کا نام اجتہاد ہے۔

نظری اور عملی دونوں پہلوؤں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اجتہاد زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ اجتہاد کسی گروہ کے لئے ترقی کا ضامن ہے۔ جس گروہ میں اجتہاد کا عمل رک جائے اس کے درمیان ترقی کا عمل بھی رک جائے گا۔ مگر اجتہاد کے عمل کو درست طور پر جاری ہونے کے لئے تنقید لازمی طور پر ضروری ہے۔ اجتہاد کا فائدہ انہی لوگوں کو مل سکتا ہے جو تنقید کو گوارا کریں۔ جن لوگوں کے اندر یہ مزاج نہ ہو کہ وہ تنقید کو کھلے طور پر سنیں اور کھلے دل کے ساتھ اس کو قبول کرلیں ان کے حصہ میں

کبھی وہ فکری خوش قسمتی نہیں آئے گی جس کو مجتہدانہ رائے قائم کرنا کہا جاتا ہے۔ اس معاملہ کی وضاحت کے لئے یہاں دو متقابل مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

میدان بدر کا انتخاب

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ۲ ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اس وقت آپ مدینہ میں تھے۔ آپ کو خبر ملی کہ قریش کا ایک لشکر مدینہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آپ نے اس کے مقابلہ کے لئے ایک فوج تیار کی اور اس کو لے کر اس رخ پر روانہ ہوئے جدھر سے قریش کا لشکر آ رہا تھا۔ بدر سے پہلے ایک مقام پر آپ نے اپنے اصحاب کے ساتھ پڑاؤ ڈالا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر دشمن آگے بڑھتا ہے تو اسی مقام پر اس سے مقابلہ کیا جائے گا۔ اس وقت ایک صحابی خباب بن منذر اٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جا کر کہا کہ اے اللہ کے رسول، یہ جگہ جہاں آپ ٹھہرے ہیں یہ اللہ کے حکم سے ہے یا یہ ایک رائے ہے اور جنگی تدبیر ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ ایک رائے ہے اور جنگی تدبیر ہے۔ یہ سن کر صحابی نے کہا: **فان هذا ليس بمنزلِ**۔ یعنی پھر یہ تو کوئی پڑاؤ ڈالنے کی جگہ نہیں۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء الثانی، صفحہ ۲۵۹)۔

یہ واضح طور پر ایک اعتراض کا معاملہ تھا۔ مگر آپ نے اس اعتراض کو برا نہیں مانا بلکہ صحابی سے صرف یہ کہا کہ تمہاری یہ مخالف رائے کیوں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی رائے کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے اور دشمن کے درمیان کئی پانی کے کنویں ہیں۔ اگر ہم یہاں ٹھہریں اور دشمن کو آگے بڑھنے کا موقع دیں تو سارے کنویں دشمن کے قبضہ میں آجائیں گے۔ اس لئے ہمیں یہ کرنا چاہئے کہ ہم یہاں سے چل کر آگے کے مقام پر ٹھہریں اور ان سارے کنوؤں پر اپنا قبضہ کر لیں۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ ہم پانی پئیں گے اور وہ لوگ پانی نہ پی سکیں گے (**فنشرب ولا يشربون**) رسول اللہ ﷺ نے یہ سن کر کہا کہ تم نے بہت اچھی رائے دی (**لقد اشرت بالرائی**)۔

یہ پوری گفتگو انتہائی معتدل ماحول میں ہوئی۔ آخر کار رسول اللہ ﷺ نے رائے دینے والے کی رائے کو پسندیدگی کے ساتھ قبول فرمایا اور اس کے مطابق عمل کیا۔ اس کے بعد جو نتیجہ ہوا وہ

یہ تھا کہ اہل اسلام کو اس مقابلہ میں فیصلہ کن کامیابی حاصل ہوئی۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی معاملہ میں صحیح رائے تک پہنچنے کے لئے آزادانہ اظہار خیال کا ماحول کتنا زیادہ ضروری ہے، اختلافی رایوں سے کس طرح معاملہ کے نئے گوشے سامنے آتے ہیں جو صحیح رائے تک پہنچنے کے لئے بے حد مددگار ہیں۔ اس معاملہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اختلاف رائے اگر بالفرض جارحانہ انداز میں ہو تب بھی اس کو خوش دلی کے ساتھ گوارا کرنا چاہئے۔

تنقید نہ سننے کا نقصان

سید احمد شہید بریلوی نے ۱۸۳۱ء میں مسلمانوں کی ایک فوج کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جہاد کیا۔ یہ واقعہ بالاکوٹ (پنجاب) میں پیش آیا۔ اس جنگ میں سید احمد شہید بریلوی اور ان کے اکثر ساتھی رنجیت سنگھ کی فوجوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ یہ پرجوش جہاد عملی اعتبار سے مکمل ناکامی پر ختم ہوا۔

سید احمد شہید بریلوی کی فوج میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو ان سے بیعت کئے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک مولانا میر محبوب علی الدہلوی (وفات ۱۲۸۰ھ) تھے۔ وہ اپنے وقت کے ایک مشہور عالم تھے۔ وہ سید احمد شہید بریلوی کی فوج میں شریک ہو کر روانہ ہوئے۔ چارسدہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ یہاں پہنچ کر مولانا میر محبوب علی صاحب کو سید صاحب سے اختلاف ہو گیا۔

مولانا میر محبوب علی صاحب نے اپنی اس اختلاف کی روداد اپنی عربی کتاب "**تاریخ الأئمة فی خلفاء الأمة**" میں درج کی ہے۔ یہ کتاب دہلی میں جامعہ ہمدرد (تغلق آباد) کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میر محبوب علی صاحب نے چارسدہ کے مقام پر سید احمد شہید بریلوی سے خلوت میں ملاقات کی۔ انہوں نے سید صاحب سے پوچھا کہ آپ نے سکھوں کے خلاف جہاد کا یہ اقدام کس بنیاد پر کیا ہے۔ سید صاحب نے بتایا کہ کشف اور خواب کی بنیاد پر۔ میر محبوب علی صاحب نے کہا کہ جہاد کا فیصلہ کشف اور خواب کی بنیاد پر نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن میں ہے کہ " **وامرھم شوریٰ**

بینهم ‘‘(الشوریٰ ۳۸)۔رسول اللہ ﷺ ہمیشہ جہاد کا فیصلہ مشورہ کے ذریعہ کیا کرتے تھے۔آپ کو بھی مشورہ کرنا چاہئے اور اقدام سے پہلے اس معاملہ کی پوری تحقیق کرنا چاہئے۔

مگر سید احمد شہید بریلوی نے میر محبوب علی صاحب کی اس بات کو نہیں مانا۔انہوں نے کہا کہ تم اپنی اس تنقید سے میرے کام میں خلل ڈال رہے ہو،تمہاری اطاعت خاموشی کے ساتھ سننے کی ہونی چاہئے،ایسی خاموشی جیسی اِس سامنے والے پہاڑ کی ہے۔سید صاحب سے میر محبوب علی صاحب کی یہ گفتگو ناکام رہی چنانچہ وہ واپس ہو کر دہلی آ گئے۔سید صاحب نے اس پر سخت ردّعمل ظاہر کرتے ہوئے کہا: **من ذهب من عندی الی وطنه مراجعا فقد ذهب ایمانه۔**

اس واقعہ کو بعض کتابوں میں میر محبوب علی صاحب کی ’’گمراہی‘‘ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ مولانا سید عبدالحئیٰ صاحب (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے لکھا ہے کہ مولانا میر محبوب علی صاحب اپنے وقت کے مشہور علماء میں سے ایک تھے۔انہوں نے سید احمد شہید بریلوی کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کی اور سید صاحب اور ان کے ساتھیوں کے ہمراہ یاغستان کا سفر کیا۔مگر شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا چنانچہ انہوں نے سید صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور ہندستان واپس آ گئے۔(**وبایع السید المجاهد احمد بن عرفان البریلوی بیعة الجهاد و سافر إلی یاغستان مع أصحابه لینصره فی الجهاد، ولکن الشیطان و سوس فی صدره فتأخر ورجع الی الهند**) **نزهة الخواطر و بهجة المسامع والنواظر، الجزء السابع**،صفحہ ۴۰۶۔۴۰۷۔

سید احمد شہید بریلوی نے اپنے اقدام کے بارے میں کوئی مشورہ نہیں کیا۔انہوں نے یہ تحقیق بھی نہیں کی کہ پنجاب میں اسلامی شعائر کی بے حرمتی کی خبریں جو انہوں نے سنی ہیں وہ کس حد تک درست ہیں۔انہوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوجی طاقت کتنی زیادہ ہے اور ان کے اپنے مریدوں کی غیر تربیت یافتہ فوج کس حد تک اس کا مقابلہ کر سکتی ہے۔وہ محض خوش عقیدگی کے تحت مہاراجہ رنجیت سنگھ کی ریاست میں داخل ہو گئے،جب کہ یہاں کے جغرافیہ کا بھی انہیں پوری طرح علم نہ تھا۔فطری طور پر اس کا انجام یہ ہوا کہ سید صاحب اور ان کے بیشتر ساتھی

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج کے ہاتھوں مارے گئے۔ان کی یہ مہم مسلمانوں کی یک طرفہ تباہی کے ساتھ ختم ہوگئی۔

اس دوسری مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اجتماعی معاملات میں درست رائے تک پہنچنے کے لیے یہ کتنا ضروری ہے کہ اختلاف رائے کا کھلا ماحول ہو،لوگوں کی تنقیدیں خوش دلی کے ساتھ سنی جائیں اور علمی بحث و مذاکرہ کے بعد درست فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے۔

شخصیت نہیں بلکہ اصول

ایک عالم نے ایک علمی مسئلہ میں اپنے شیخِ طریقت پر تنقید کی۔کسی نے کہا کہ آپ اپنے شیخ پر تنقید کررہے ہیں۔عالم نے جواب دیا: **نحن نحب شيخنا ولكن الحق أحب إلينا من الشيخ** (ہم اپنے شیخ سے محبت کرتے ہیں مگر حق ہم کو شیخ سے بھی زیادہ محبوب ہے)۔

مذکورہ عالم کا یہ قول ایک اہم حقیقت کو بتاتا ہے۔وہ یہ کہ جب کسی مسئلہ میں کوئی تنقیدی بات کہی جائے تو خواہ بظاہر وہ کسی متعین شخص کے حوالہ سے کہی گئی ہو،مگر وہ ایک اصول پر تنقید ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید میں شخصیت کا حوالہ ضروری ہے، کیوں کہ شخصی حوالہ کے بغیر تنقید ایک مجہول اظہار رائے بن جائے گی اور تنقید کا اصل مقصد حاصل نہ ہوگا۔

تنقید یا اختلاف رائے کا عمل اسلام کی پوری تاریخ میں ہمیشہ جاری رہا ہے۔صحابہ کے درمیان آپس میں بہت سے اختلافات تھے اور اکثر کھلے انداز میں اس کا اظہار ہوتا تھا۔اسی طرح تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء وغیرہ، کے درمیان ہمیشہ اختلافات رہے ہیں اور ان کا کھلا اظہار بھی ہمیشہ کیا جاتا رہا ہے۔مگر کبھی کسی نے ان اختلافات کو بُرا نہیں بتایا اور نہ یہ کہا کہ اختلاف اور تنقید کا طریقہ ختم کر دینا چاہئے۔اسلامی تاریخ کے پورے قدیم دور میں تنقید اور اختلاف کو ہمیشہ گوارا کیا جاتا رہا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ تنقید واختلاف کو اصول کی نسبت سے دیکھتے تھے نہ کہ شخصیتوں کی نسبت سے۔(تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب دینِ انسانیت، باب ''حریت فکر'')

تنقید کو ٹھنڈے ذہن کے ساتھ سننا اور اس پر غور کرنا اس بات کی علامت ہے کہ آدمی شخصیتوں

کی عظمت میں گم نہیں ہے۔اس کے نزدیک اصل اہمیت اصول کی ہے نہ کہ شخصیت کی۔ایسا آدمی کسی شخصیت کے مجروح ہونے کو گوارا کرلے گا مگر حق کا مجروح ہونا اس کو گوارا نہ ہوگا۔ایسا اس وقت ہوتا ہے جب کہ لوگوں کے اندر حقیقی دینی روح زندہ ہو۔مگر جب کسی قوم پر زوال کا دور آجائے تو اس وقت شخصیتیں ہی لوگوں کا مرجع بن جاتی ہیں۔اب لوگ اصول کے بارے میں حسّاس نہیں ہوتے۔البتہ وہ اپنی محبوب شخصیتوں کے بارے میں بے حد حسّاس ہو جاتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ دور زوال میں تنقید لوگوں کے لئے ایک مبغوض چیز بن جاتی ہے۔یہ لوگ جب بھی کوئی ایسی تنقید سنتے ہیں جس کی زد ان کے مفروضہ اکابر پر پڑ رہی ہو تو وہ سخت برہم ہو جاتے ہیں، ان کی یہ برہمی بظاہر ناقد کے خلاف ہوتی ہے، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ وہ ابھی تک معرفتِ حق کی لذت سے آشنا نہ ہو سکے۔حق کے نام سے وہ صرف کچھ شخصیتوں کو جانتے ہیں نہ کہ خود حق وصداقت کو۔

تنقید کا فائدہ

تنقید کوئی برائی نہیں، تنقید ایک نعمت ہے۔تنقید علم کے نئے گوشوں کو کھولتی ہے۔تنقید کے ذریعہ معاملہ کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔تنقید کوئی عیب زنی نہیں۔تنقید اپنی حقیقت کے اعتبار سے ناقد شخص اور زیر تنقید شخص کے درمیان ایک قسم کی تفکیری شرکت (intellectual sharing) ہے جو دونوں ہی کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔تنقید یکساں طور پر دونوں کے ذہنی افق کو وسیع کرتی ہے۔ سچی تنقید ایک انسان کی طرف سے دوسرے انسان کے لئے علمی تحفہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خلیفۂ دوم عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ اس شخص پر رحم کرے جو مجھ کو میرے عیوب کا ہدیہ بھیجے (رحم اللہ إمرأً اھدی الی عیوبی)

تنقید کا انتہائی مفید ہونا راقم الحروف کے لیے صرف ایک نظری بات نہیں۔وہ میرے لئے ایک عملی تجربہ ہے۔اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ میں پیدائشی طور پر ایک تنقید پسند آدمی ہوں۔اپنے اس مزاج کی بنا پر میں اپنے قریبی ساتھیوں سے ہمیشہ یہ امید کرتا ہوں کہ وہ میرے اوپر علمی تنقید کریں۔اس معاملہ میں میرا مزاج کیا ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔میرے ایک رفیق کار

مولانا انیس لقمان ندوی تقریباً ۸ سال تک میرے ساتھ تھے۔ اب وہ ایک عرب ملک میں ہیں۔ پہلی بار جب وہ عرب گئے تو ایک شیخ نے ان سے پوچھا کہ تم ہندستان میں کیا کام کرتے ہو۔ انہوں نے جواب دیا: **انا ناقد اکبر ناقد فی الھند** (میں ہندستان کے سب سے بڑے ناقد کا ناقد ہوں) اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تنقید کے معاملہ میں میرا ذوق کیا ہے۔

ایک صاحب علم کے لئے سب سے زیادہ لذیذ چیز علمی تبادلۂ خیال ہے۔ تنقید میں بظاہر ایک شخص سامنے آتا ہے۔ مگر حقیقۃً تنقید کا نشانہ شخص نہیں ہوتا بلکہ موضوع ہوتا ہے۔ سچی تنقید دو شخصوں کے درمیان ایک موضوع پر ڈسکشن ہے، خواہ بظاہر وہ کسی فرد کے حوالہ سے کیا گیا ہو۔

یہی وجہ ہے کہ سچی تنقید کبھی کسی شخص کے لئے ذاتی وقار کا سوال نہیں بنتی۔ کیوں کہ سچی تنقید میں کوئی ذات سرے سے نشانہ پر ہوتی ہی نہیں۔

تنقید اگر صحیح ہو تو وہ آدمی کو یہ موقع دیتی ہے کہ وہ اپنے ذہن کو درست کرلے۔ وہ غلط فکر کے اندھیرے سے نکل کر صحیح فکر کی روشنی میں آجائے۔ وہ اپنے آپ کو علمی اعتبار سے پہلے سے زیادہ درست انسان بنالے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تنقید کرنے والے کی تنقید صحیح نہ ہو تب بھی اس میں یہ فائدہ ہے کہ اس سے موضوع کے مزید گوشے واضح ہوتے ہیں۔ زیر تنقید شخص اگر تنقید کو سن کر برہم نہ ہو تو تنقید اس کی قوت فکر کو بڑھائے گی۔ وہ اس کے اندر تخلیقی فکر (creative thinking) لانے کا سبب بنے گی۔ وہ اس کو موقع دے گی کہ وہ اپنی بات کو زیادہ واضح اور زیادہ مدلل انداز میں پیش کرسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید ہر حال میں مفید ہے، خواہ وہ صحیح تنقید ہو یا غلط تنقید۔

۱۹۶۵ کا واقعہ ہے۔ اس وقت میں لکھنؤ میں تھا۔ میری ملاقات ایک غیر مسلم اسکالر سے ہوئی۔ وہ مذاہب یا مذہبی شخصیتوں کو نہیں مانتے تھے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے پیغمبر اسلام پر تنقید کی۔ آپ کے خلاف بولتے ہوئے انہوں نے کہا: محمدؐ کو اگر تاریخ سے نکال دیا جائے تو تاریخ میں کیا کمی رہ جائے گی۔

ان کے یہ الفاظ یقیناً اشتعال انگیز تھے۔ اگر میں اس پر غصہ ہو جاتا تو میں صرف یہ کرتا کہ ان کو لعن طعن کرتا اور لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہوئے وہاں سے واپس چلا آتا۔ مگر اللہ کے فضل سے میں نے اپنے ذہنی اعتدال کو باقی رکھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ میرے ذہن میں فکری عمل مثبت انداز میں جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک لمحہ کے بعد میری زبان پر ان کی بات کا یہ جواب آ گیا: وہی کمی جو محمدؐ سے پہلے تاریخ میں تھی۔

مذکورہ تنقید نے مجھے پیغمبر اسلام کی سیرت کے ایک ایسے پہلو پر سوچنے پر مجبور کر دیا جو اس سے پہلے میرے ذہن میں واضح نہ تھا۔ اس طرح مذکورہ اسکالر کی تنقید میرے لئے سیرت کے ایک نئے اور بے حد اہم گوشہ کی دریافت کا سبب بن گئی۔ جب میں نے سوچا کہ موجودہ دنیا کی تمام سائنسی اور تہذیبی ترقیاں پیغمبر اسلام کی بعثت کے بعد ظہور میں آئی ہیں، آپ سے پہلے ان چیزوں کا کوئی وجود ہی نہ تھا تو یہ سوچ میرے لئے ایک نئی دریافت تک پہنچنے کا ذریعہ بن گئی۔ میں نے یہ دریافت کیا کہ دونوں واقعات میں ایک گہرا رشتہ ہے۔ اس دریافت کے بعد میں نے اس موضوع پر باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا۔ اس مطالعہ کا نتیجہ راقم الحروف کی وہ کتاب تھی جو ''اسلام دور جدید کا خالق'' (Islam the Creator of the Modern Age) کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آدمی اگر تنقید کو سن کر برہم نہ ہو، وہ اپنے ذہنی اعتدال کو برقرار رکھے تو تنقید اس کے لئے کتنی زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے۔

صحیح معیار اور غلط معیار

مقلدانہ فکر کے بہت سے نقصانات ہیں۔ ان میں شاید سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ایسے لوگ حق کو خود حق سے نہیں پہچانتے بلکہ وہ اس کو رجال کی نسبت سے پہچانتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا سب سے بڑا مرجع ان کے مفروضہ بزرگ بن جاتے ہیں۔ یہ مفروضہ بزرگ جس چیز کو حق بتائیں اس کو وہ حق مان لیتے ہیں۔ کوئی شخص جو ان کے مفروضہ بزرگوں کی فہرست میں شامل نہ ہو وہ خواہ کتنے ہی زیادہ دلائل کے ساتھ کسی بات کو پیش کرے، وہ اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے، کیوں کہ ان کے اندر یہ

ذاتی صلاحیت ہی نہیں ہوتی کہ وہ دلیل کے ذریعہ کسی چیز کو پہچانیں اور اس کو اختیار کر لیں۔

یہی واحد سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ہر دور میں پیغمبروں کا انکار کیا گیا۔ پیغمبر اپنے معاصرین کو ایک نیا شخص دکھائی دیتا تھا جو ان کے مفروضہ بزرگوں کی فہرست سے باہر تھا، اس لئے وہ پیغمبر کو اس کی زندگی میں قابل لحاظ شخص کا درجہ نہ دے سکے۔ مزید یہ کہ پیغمبر جب ان کی محبوب شخصیتوں پر تنقید کرتا تو وہ اس سے اور بھی زیادہ بھڑک جاتے اور اس کے پیغام پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔

مقلدانہ ذہن اور مجتہدانہ ذہن کے درمیان سب سے زیادہ اہم فرق یہ ہے کہ مقلدانہ ذہن رکھنے والے لوگ حق کو صرف اپنی شخصیتوں کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ اس کے برعکس مجتہدانہ ذہن رکھنے والے لوگوں میں یہ صفت ہوتی ہے کہ وہ حق کو خالص دلیل کے زور پر پہچانیں اور اس کو پوری آمادگی کے ساتھ اختیار کر سکیں۔

اسی فرق کا یہ نتیجہ ہے کہ مقلدانہ ذہن رکھنے والے لوگ عین اسی چیز سے محروم ہو جاتے ہیں جس کو دین میں سب سے زیادہ اہم حیثیت حاصل ہے، یعنی معرفت والا ایمان۔ معرفت والے ایمان کا سرچشمہ ذاتی دریافت (self-discovery) ہے۔ مقلدانہ ذہن رکھنے والے لوگ خود اپنے ذہن کو آزادانہ طور پر استعمال ہی نہیں کرتے، اس لئے وہ معرفت والے اسلام سے آشنا نہیں ہوتے۔

مجتہدانہ ذہن رکھنے والوں کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایسے لوگوں کے ذہن کی کھڑکیاں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ آزادانہ طور پر غور وفکر کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ اگر کسی چیز کا حق ہونا ظاہر ہو تو وہ فوراً اس کو پہچان لیں اور کسی تردد کے بغیر اس کو مان لیں۔

موجودہ دنیا میں کسی انسان کے لئے سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ وہ حق کو دریافت کرے۔ یہ احساس کہ میں نے سچائی کو پا لیا ہے، بلاشبہہ اس دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ مگر یہ عظیم ترین نعمت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو مجتہدانہ فکر کے حامل ہوں۔ جو لوگ مقلدانہ فکر کے اندھیروں میں گم ہوں وہ کبھی معرفت والی سچائی کا تجربہ نہیں کر سکتے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات ۱۷۶۲) نے اپنی کتاب عقد الجید میں اجتہاد اور مجتہد کے مسئلہ پر کلام کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مجتہد وہ ہے، جس کے اندر پانچ قسم کے علوم موجود ہوں ـــــ کتاب اللہ کا علم، سنت رسول کا علم، علماء سلف کے اقوال یعنی ان کے اتفاقات اور اختلافات کا علم، زبان کا علم، اور قیاس واستنباط کا علم (**المجتهد من جمع خمسة انواع من العلم علم كتاب الله عز وجل وعلم سنة رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم، واقاويل علماء السلف من اجماعهم و اختلافهم وعلم اللغة وعلم القياس**)۔

شاہ ولی اللہ دہلوی (اور دوسرے علماء) نے مجتہد کی جو شرطیں لکھی ہیں وہ بجائے خود درست ہیں۔ مگر یہ شرطیں صرف مقید اجتہاد کے لئے کارآمد ہیں، غیر مقید اجتہاد کے لئے یہ شرطیں کافی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں۔ ایک عام اجتہاد اور دوسرا، خاص اجتہاد۔ عام اجتہاد سے مراد وہ اجتہاد ہے جو احوال ظاہری سے تعلق رکھتا ہو۔ اور خاص اجتہاد سے مراد وہ اجتہاد ہے جس کا تعلق احوال باطنی سے ہے۔ یعنی وہ حالات جو اوپری سطح (face value) پر دکھائی نہ دیتے ہوں مگر وہ گہری سطح (under current) میں موجود ہوں۔ ان دونوں کے فرق کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ اجتہادِ عام کا تعلق بصارت سے ہے، اور اجتہاد خاص کا تعلق بصیرت سے۔

مثال کے طور پر اگر مجتہد کے سامنے یہ مسئلہ ہو کہ مسح علی الخفین (چمڑے کے موزوں پر مسح) کی جو رعایت شریعت میں دی گئی ہے، کیا وہ رعایت موجودہ زمانہ کے صنعتی موزوں پر بھی ہے، تو اس قسم کے اجتہاد کے لئے مذکورہ ۵ علوم کی واقفیت کافی ہے۔ اسی طرح اگر یہ سوال ہو کہ انجکشن کی سوئی جسم میں داخل ہونے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں تو اس مسئلہ کا حکم معلوم کرنے کے لئے بھی مذکورہ پانچ علوم میں واقفیت کافی ہو سکتی ہے۔ ایسا آدمی اپنے اس علم کی بنیاد پر قدیم فقہی ذخیرہ میں ایک ایسا جزئیہ پا سکتا ہے جس میں فقیہہ نے یہ فتویٰ دیا ہو کہ بچھو کسی کے جسم میں ڈنک داخل کر دے تو اس کی وجہ سے اس کا وضو ٹوٹے گا یا نہیں۔

مگر اجتہاد خاص کے لئے مذکورہ پانچ شرطوں کے علاوہ ایک اور شرط لازمی طور پر ضروری ہے۔ یہ مزید شرط حدیث کے الفاظ میں یہ ہے: **وعلی العاقل ان یکون بصیراً بزمانہ** (**جامع العلوم والحکم، ابن رجب الحنبلی**، صفحہ ۹۸) یعنی دانا شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانہ کو جاننے والا ہو۔

حدیث میں جس مزید شرط کا ذکر ہے اس کو ایک لفظ میں حالات زمانہ سے واقفیت کہا جا سکتا ہے۔ یعنی مجتہد جس زمان ومکان میں اجتہاد کر رہا ہے، اس زمان ومکان سے وہ بھرپور واقفیت رکھتا ہو۔ وہ تقلیدی علوم میں دستگاہ کے ساتھ غیر تقلیدی علوم پر گہری نظر رکھتا ہو۔ یہ دوسری صلاحیت خارجی معلومات اور غور وفکر اور حقائق کی معرفت کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔

اسلامی تاریخ میں غیر مقید اجتہاد یا تخلیقی اجتہاد کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔ اس قسم کی ایک مثال مدنی دور میں کی جانے والی صلح حدیبیہ ہے۔ اس صلح کے وقت بظاہر جو حالات تھے وہ تمام تر اہل اسلام کے خلاف تھے۔ کیوں کہ یہ ۱۰ سالہ ناجنگ معاہدہ مخالفین کی یک طرفہ شرطوں کو مان کر کیا جا رہا تھا۔ صلح کے اس ظاہری پہلو کی بنا پر اس کو قبول کرنا صحابہ پر سخت گراں گزر رہا تھا۔ حتی کہ عمر فاروق نے اس معاہدہ کو دنیۃ (ذلت) قرار دیا۔

اس معاملہ کی حقیقت قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں اس معاملہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے: **فعلم ما لم تعلموا** (الفتح ۲۷) اس آیت کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ: پس جانا اللہ نے جو کچھ نہ جانا تم نے۔ مگر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم صرف دکھائی دینے والی باتوں کو جانتے تھے مگر اسی کے ساتھ کچھ بظاہر نہ دکھائی دینے والی باتیں بھی وہاں موجود تھیں اور اللہ کی رہنمائی سے اللہ کے رسول نے ان بظاہر نہ دکھائی دینے والی باتوں کی بنیاد پر صلح کا یہ معاہدہ کیا۔

حدیبیہ کے وقت ظاہری باتیں تو یہ تھیں کہ یہ صلح مخالفین کی یکطرفہ شرطوں پر کی جارہی تھی۔ مگر غیر ظاہری (under current) بات یہ تھی کہ اہل اسلام اور غیر اہل اسلام کے درمیان جنگی حالات کی بنا پر معتدل فضا میں اختلاط (interaction) ختم ہو گیا تھا۔ اب اگر دونوں فریقوں کے درمیان ناجنگ

معاہدہ ہوجائے تو معتدل حالات میں لوگ ایک دوسرے سے ملنے لگیں گے اور دونوں فریقوں کے درمیان کھلا تبادلۂ خیال (open dialogue) شروع ہوجائے گا۔ اس عمل کے دوران اسلام کی خوبیاں اپنے آپ لوگوں کے اوپر ظاہر ہونے لگیں گی اور وہ واقعہ پیش آئے گا جس کو قرآن میں **یدخلون فی دین اللہ افواجا (النصر)** سے تعبیر کیا گیا ہے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ صلح حدیبیہ کے وقت اہل اسلام کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے بھی کم تھی مگر اس کے بعد امن کے حالات میں اسلام کی جو اشاعت ہوئی اس کے نتیجہ میں دو سال سے بھی کم مدت میں اہل اسلام کی تعداد ۱۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد یہ معجزاتی واقعہ ہوا کہ کسی جنگ کے بغیر صرف عددی طاقت کے ذریعہ اہل اسلام کو غلبہ حاصل ہوگیا۔

یہی واقعہ تیرہویں صدی میں ایک اور صورت میں پیش آیا۔ جنگجو تاتاری ہتھیار کی طاقت سے مسلم دنیا میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے سمرقند سے حلب تک مسلم بستیوں کو تباہ کیا اور عباسی خلافت کا خاتمہ کردیا۔ یہ فتنہ اتنا شدید تھا کہ مسلمانوں میں یہ مقولہ مشہور ہوگیا کہ: **اذا قیل لک ان التتر انھزموا فلا تصدق** (اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاری شکست کھا گئے تو تم اس کو نہ ماننا) یہ ظاہری صورت حال تھی۔ مگر اس کی تہہ میں ایک اور چیز چھپی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ تاتاری نیزہ اور تلوار کی طاقت ضرور رکھتے تھے مگر وہ نظریۂ حیات (ideology) سے خالی تھے۔

مسلمانوں سے اختلاط کے دوران وہ اسلام کے نظریہ سے متعارف ہوئے۔ چونکہ ان کے پاس اس سے مقابلہ کے لئے کوئی جوابی نظریہ موجود نہ تھا، وہ تیزی سے اسلامی نظریہ سے متاثر ہونے لگے۔ یہاں تک کہ وہ انقلابی واقعہ پیش آیا جس کو ایک مشہور مستشرق فلپ کے ہٹی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہوگئے تھے:

The religion of Muslims have conquered where their arms had failed.

اب بعد کے زمانہ کو دیکھئے۔ اس سلسلہ میں پہلی سبق آموز مثال شاہ ولی اللہ دہلوی کی ہے۔ ان کے زمانہ میں ہندستان کی مغل سلطنت کمزور ہوگئی تھی۔ اور یہ آثار نظر آنے لگے تھے کہ جلد ہی وہ زوال کا

شکار ہوکر ختم ہو جائے گی۔ اس وقت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنی کوشش اس پر لگا دی کہ یہ مسلم سلطنت کسی نہ کسی طرح دوبارہ مستحکم ہو جائے۔ انہوں نے اس وقت کے مسلم حکمرانوں کو جوش دلایا کہ تم لوگ تلوار لے کر اٹھو اور اپنے دشمنوں سے لڑ کر ان کا خاتمہ کر دو۔ دوسری طرف انہوں نے کابل کے حاکم احمد شاہ ابدالی کو ترغیب دی کہ وہ ہندستان پر حملہ کر کے سکھوں اور مرہٹوں کا زور توڑ دے تا کہ مغل سلطنت محفوظ ہوکر قائم رہ سکے۔

مگر شاہ ولی اللہ کی یہ کوششیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اپنے صرف قریبی اور ظاہری حالات کو دیکھتے تھے۔ عالمی اعتبار سے حالات کا جو نیا سیلاب آرہا تھا اس سے وہ قطعاً بے خبر تھے۔ نئے سیلاب سے میری مراد ڈیما کریسی کا دور ہے۔ شاہ ولی اللہ کا یہ خیال تھا کہ وہ قائم الزمان ہیں۔ مگر ان کی ساری سوچ جانے والے دورِ بادشاہت میں کام کر رہی تھی۔ آنے والے دور جمہوریت میں کیا صورت پیش آئے گی، اس سے وہ مطلع نہ ہو سکے۔ دور بادشاہت میں ایک شخص پورے ملک کا حاکم ہوا کرتا تھا مگر دور جمہوریت میں عوامی حاکمیت کا اصول رائج ہونے والا تھا۔ اور وہ مسئلہ پیدا ہونے والا تھا جس کو اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہ اگر حالات کے رخ کو دیکھ پاتے تو وہ اپنی ساری طاقت دعوت کے محاذ پر لگا دیتے۔ جس میں گویا اقلیت کو اکثریت میں بدلنے کا راز چھپا ہوا تھا۔ دعوت کا مطلب یہ تھا کہ مغل سلطنت اگر ختم ہو جائے تب بھی اہل اسلام اپنی عددی برتری کے زور پر غالب حیثیت کے حامل ہوں گے۔ مگر شاہ ولی اللہ دہلوی دعوت کی اس انقلابی اہمیت سے بالکل بے خبر تھے۔ حتی کہ ان کی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں ہر قسم کے ابواب ہیں مگر کتاب الدعوۃ یا کتاب التبلیغ اس کے اندر موجود نہیں۔

اب سید جمال الدین افغانی (وفات ۱۸۹۷) کی مثال لیجئے۔ ان کے زمانہ میں انگریز اور فرانسیسی تقریباً پوری مسلم دنیا پر سیاسی اعتبار سے غالب آ گئے تھے۔ سید جمال الدین افغانی نے اپنی پوری زندگی اس سیاسی غلبہ کو ختم کرنے میں لگا دی۔ ان کا نعرہ تھا: **الشرق للشرقیین** (مشرق مشرقیوں کے لئے ہے) بظاہر دیکھئے تو آج مغربی قوموں کا سیاسی تسلط ختم ہو چکا ہے اور تقریباً ساٹھ

آزاد مسلم ممالک دنیا کے نقشہ پر وجود میں آچکے ہیں۔ مگر حقیقی حالات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہوا۔ مسلم قومیں آج بھی اہل مغرب کی بالاتری کے تحت جینے پر مجبور ہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی حالات کو صرف ظاہر کے اعتبار سے دیکھ سکے، وہ گہری حقیقتوں سے آشنا نہ ہو سکے۔ وہ انگریز اور فرانسیسیوں کے غلبہ کو صرف سیاسی غلبہ کے ہم معنیٰ سمجھتے رہے۔ مگر یہ اصل معاملہ کا صرف ایک ظاہری پہلو تھا۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ مغربی قوموں نے علم میں تقدم حاصل کرلیا تھا، وہ سائنس اور ٹکنالوجی میں مسلمانوں سے آگے بڑھ گئے تھے۔ سید جمال الدین افغانی اپنے قدیم سیاسی ذہن کی بنا پر معاملہ کے ان گہرے پہلوؤں کو نہ دیکھ سکے۔

سید جمال الدین افغانی اگر جدید زمانہ میں علم کی اہمیت کو سمجھتے تو وہ بیرونی غلبہ کو ایک وقتی چیز سمجھ کر نظر انداز کر دیتے اور اپنی ساری طاقت اس راہ پر لگا دیتے کہ مسلمان علمی اعتبار سے اس طرح آگے بڑھ سکیں جس طرح مغربی قومیں اس میدان میں آگے بڑھ گئی ہیں۔ اگر وہ بے فائدہ سیاسی جہاد کو چھوڑ کر علمی جہاد میں سرگرم ہو جاتے اور اپنے ساتھیوں کو اس راہ پر لگا دیتے تو یقینی ہے کہ مسلم ملکوں کی تاریخ اس سے مختلف ہوتی جو آج ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔

یہ چند مثالیں بتاتی ہیں کہ مذکورہ پانچ شرطیں مقید اجتہاد کے لئے بلاشبہہ کافی ہیں۔ مگر مقید اجتہاد یا مطلق اجتہاد کے لئے ایک اور شرط لازمی طور پر ضروری ہے اور وہ ہے زمانہ کے حالات سے گہرائی کے ساتھ باخبر ہونا۔ اس مزید شرط کے بغیر جو اجتہاد کیا جائے گا وہ سراسر بے نتیجہ رہے گا۔ ایسا اجتہاد کبھی ملت کو نتیجہ خیز رہنمائی نہیں دے سکتا۔

اجتہادی مسائل

تفسیر بالرائے

قرآن کی تفسیر اپنی رائے سے کرنا ایک گناہ کا فعل ہے۔ اگر کوئی شخص جان بوجھ کر قرآن کی کسی آیت کا غلط مفہوم بیان کرے تو یہ تحریف ہے، (البقرہ ۷۵) اور قرآن میں اس قسم کی تحریف بلاشبہہ ایک ناقابل معافی جرم ہے۔

یہ معاملہ اتنا زیادہ نازک ہے کہ محض اپنی رائے کے تحت کی ہوئی تفسیر اگر بالفرض درست ہو، تب بھی یہ اندیشہ ہے کہ وہ آدمی کے لئے گناہ کا سبب نہ بن جائے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''**من قال فی کتاب اللہ عزو جل برأیه فأصاب فقد أخطأ**'' (سنن ابی داؤد، کتاب العلم ۳/۳۱۹) یعنی جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی کتاب میں اپنی رائے سے کہا اور اس نے صحیح کہا تب بھی اس نے غلطی کی۔

ضروری تفسیری تقاضوں کو پورا کئے بغیر محض اپنی رائے سے قرآن کا مفہوم بیان کرنا ایک غیر محتاط روش ہے۔ اس لئے ایسے کسی آدمی کی تفسیر اگر اتفاقاً درست ہو تب بھی ایسا شخص اپنی غیر محتاط روش کی بنا پر غلط کار ٹھہرے گا۔ ایسے آدمی کو صحیح تفسیر کرنے کا انعام نہیں مل سکتا۔

تفسیر قرآن کے سلسلے میں کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ حدیث اور آثار میں جو تفسیریں منقول ہیں یا قدماء نے قرآنی آیات کی جو تفسیریں بیان کی ہیں، تفسیر قرآن کا کام بس اسی دائرے کے اندر ہونا چاہئے۔ گویا بعد کی مسلم نسلوں کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ابتدائی دور کے علماء اور مفسرین کے اقوال کو دہراتے رہیں۔ مگر مذکورہ حدیث کا یہ مطلب درست نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ قرآن ایک بابرکت کتاب ہے جو ہم نے تمہاری طرف اتاری ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبر کریں اور تاکہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں (ص ۲۹) قرآن جب ایک ایسی کتاب ہے جس پر ہر قاری تدبر اور غور وفکر کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوسکتا

کہ صرف پچھلی بیان کردہ باتوں کو پڑھا جائے اور بس انہیں کو دہرایا جاتا رہے۔ تدبر کا لفظ اپنے آپ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کے قاری سے یہ مطلوب ہے کہ وہ گہرے غور وفکر سے اس میں نئے نئے معانی دریافت کرے اوران سے اپنے ایمانی شعور میں اضافہ کرتا رہے۔ قرآن میں اگر یہ صفت نہ ہوتو وہ لوگوں کے لئے نصیحت اور اضافۂ ایمان کی کتاب نہ بن سکے گا۔ گہری نصیحت نئے نئے معانی کی دریافت کے ذریعہ ہوتی ہے نہ کہ کچھ معلوم اورمحدود باتوں کی تکرار سے۔

یہ کوئی قیاسی بات نہیں۔ حدیث سے صراحۃً بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن میں نئے معانی کی دریافت کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق، رسول اللہؐ نے فرمایا ''**ولا تنقضی عجائبه**'' (الدارمی، فضائل القرآن، الترمذی، ثواب القرآن) یعنی قرآن کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے۔ ایک اورروایت میں ''**لا تفنی**'' کا لفظ ہے۔ یعنی قرآن کے عجائب کبھی فنا نہ ہوں گے۔ اس حدیث میں عجائب سے مراد معنوی عجائب ہیں۔ یعنی قرآن کے معانی اتنے زیادہ ہیں کہ ہر دور کے علماء اس سے نئے نئے معانی دریافت کرتے رہیں گے۔ اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

تاریخ کے ہر دور میں قرآن کی آیتوں میں نئے نئے معانی کی دریافتوں کا سلسلہ جاری رہا ہے جس کو استنباط کہا جاتا ہے۔ اس کی مثالیں تفسیر کی ہر کتاب میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں اعداد قوت کے حکم کے تحت جنگی گھوڑوں کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے (الانفال ٦٠)۔ موجودہ زمانہ میں جنگی گھوڑوں کی جگہ جنگی مشینوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ تمام علماء اب اس آیت کی تفسیر کے تحت کہتے ہیں کہ حالات کی تبدیلی کی بنا پر اس آیت میں جنگی گھوڑوں کے بجائے جنگی مشینوں کی فراہمی مراد لی جائے گی۔ کیونکہ اب جنگی گھوڑوں کے ذریعہ ارہاب کا فائدہ حاصل نہیں کیا جاسکتا جس کو مذکورہ آیت میں اعداد قوت کا مقصود بتایا گیا ہے۔ اب ارہاب کا یہ فائدہ مشینی طاقت کے ساتھ وابستہ ہوگیا ہے۔

قرآن ہر دور میں مسلمانوں کے لئے ذہنی اور علمی ارتقاء کا ذریعہ رہا ہے۔ قرآن کی سب

سے اہم صفت یہ ہے کہ وہ ذہن انسانی کومہمیز کرتا ہے اوراس کو بار بارغور وفکر کے اوپر ابھارتا ہے۔ قرآن اپنے لامحدود معانی کی بنا پر اہل اسلام کے لئے فکری ارتقاء کا ضامن ہے۔ ایسی کتاب میں نئ علمی دریافتوں کا دروازہ بند کرنا خود اس کتاب کے مقصد کی نفی کے ہم معنی ہے۔ ایسا کرنے کی صورت میں اہل اسلام ذہنی جمود کا شکار ہو جائیں گے۔ وہ نہ خود علمی ترقی کریں گے اور نہ انسانی قافلوں کی علمی وفکری قیادت کا مطلوب کام انجام دے سکیں گے۔

اصل یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر کی دوقسمیں ہیں۔ ایک وہ تفسیر جو تدبر کے ساتھ کی جائے اور دوسری تفسیر وہ ہے جو تدبر کے بغیر کی جائے۔ اسی دوسری تفسیر کا نام تفسیر بالرائے ہے۔ تدبر کے ساتھ تفسیر کا مطلب یہ ہے کہ قاری عربی زبان نیز احادیث وآثار سے بخوبی واقفیت حاصل کرے۔ وہ قرآن کی صرف ایک آیت کو لے کر اس کی تفسیر نہ کرنے لگے، بلکہ وہ مجموعی طور پر پورے قرآن کے منشا ومقصود کو سامنے رکھے۔ وہ قرآن سے متعلق دوسرے علوم سے گہری واقفیت حاصل کرے۔ اسی طرح وہ یہ کرے کہ دور اول سے لے کر بعد کے زمانہ تک مسلمہ دینی شخصیتوں نے جو تفسیریں کی ہیں ان سے وہ بھر پور واقفیت حاصل کرے۔ اسی کے ساتھ وہ تقویٰ کی صفت اپنے اندر پیدا کرے جس کو قرآن میں علم کا سرچشمہ بتایا گیا ہے۔ (البقرہ ۲۸۲)۔ یہ قرآن کی تفسیر کا صحیح طریقہ ہے۔

اس کے برعکس تفسیر بالرائے یہ ہے کہ آدمی صرف اپنی رائے پر اعتماد کرے۔ آیت کے حوالے سے اس کے ذہن میں جو بھی خیال آجائے وہ اس کو قرآن کی تفسیر سمجھ کر اسے بیان کرنے لگے۔ خواہ آیت کے سیاق وسباق سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔ خواہ قرآن کے مجموعی احکام سے وہ مطابقت نہ رکھتا ہو۔ یہاں تفسیر بالرائے کی چند مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ تفسیر بالرائے کی ایک صورت وہ ہے جو اتنی قبیح ہے کہ اس کو سننے اور پڑھنے کے بعد فوراً ہی سنجیدہ آدمی کا ذہن اس کو رد کردے۔ مثلاً قرآن کی ایک آیت یہ ہے "وربك فكبر" (المدثر ۳) اس آیت کا ترجمہ کچھ لوگوں نے یہ کیا کہ اور تم اپنے رب کو بڑا کرو، اس ترجمہ کو لے کر آیت کی تفسیر انہوں نے یہ کی کہ خدا کی (سیاسی بڑائی) دنیا میں قائم کرو، خدا کی حکومت کا جھنڈا دنیا میں بلند کرو۔

یہ ترجمہ اور تفسیر دونوں تفسیر بالرائے کی ایک بدترین صورتیں ہے، عقلِ سلیم ہی اس کو غلط سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ اللہ اپنے آپ میں بڑا ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ اس کی کوئی مخلوق کسی پہلو سے اس کو بڑا کرے۔ آیت کے مطابق، انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ اللہ کی عظمت کو اپنے دل اور دماغ میں اتارے۔ اللہ کی عظمت کا احساس اس کی روح کے اندر تیرنے لگے۔ اپنے چھوٹا ہونے اور اللہ کے بڑا ہونے کا عرفان اس کو انسان اصلی (man cut to size) بنا دے۔ یہی تکبیرِ رب کا مطلب ہے۔

مذکورہ آیت کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ـــــــ اور اپنے رب کی بڑائی کرو، یا اپنے رب کی بڑائی بول، یا اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اس ترجمہ کے مطابق، آیت میں جس تکبیر رب کا ذکر ہے اس کا تعلق کسی خارجی سیاست سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آدمی کی اپنی داخلی کیفیت سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا دماغ اللہ کی عظمت کو شعوری طور پر دریافت کرے۔ اس کا دل اللہ کی عظمت کے احساس سے تڑپ اٹھے۔ اللہ کی عظمت کا اعتراف اس کی زبان پر جاری ہو جائے۔ یہی وہ تکبیر رب ہے جس کا قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ قرآن کے آغاز میں یہ آیت آئی ہے **''ذلك الكتاب لا ريب فيه''** (البقرہ ۲) یعنی یہ کتاب (الٰہی) ہے، اس میں کوئی شک نہیں، یا یہ کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ اس آیت کی نحوی ترکیب میں کچھ اختلاف ہے۔ تاہم ہر مفسر نے یہاں کتاب کو کتاب ہی کے معنی میں لیا ہے۔ اس کے بارے میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ وہ تمام ترجمے غلط ہیں جن میں **''ذالك الكتاب''** کا ترجمہ کتاب سے کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن تمام علوم کا خزانہ ہے۔ اس لئے ذالک الکتاب کا سب سے قریبی ترجمہ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔

یہ ترجمہ یقینی طور پر رائے کی بنیاد پر کیا گیا ہے نہ کہ حقیقی علم کی بنیاد پر، اس لئے کہ انسائیکلوپیڈیا ایسی کتاب کا نام ہوتا ہے جس میں ہر قسم کی معلومات یکجا کی گئی ہوں۔ مگر قرآن انسائیکلوپیڈیائی مفہوم میں معلومات کا مجموعہ نہیں۔ اس کے بجائے وہ علم اور معرفت کا مجموعہ ہے۔ وہ

خزانۂ حکمت ضرور ہے مگر وہ معروف معنیٰ میں، خزانۂ معلومات نہیں۔

مثال کے طور پر اسلام کا کلمہ **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** ہے، مگر قرآن میں یکجائی طور پر کہیں یہ کلمہ موجود نہیں۔ اسلام میں نماز پانچ وقتوں کے لئے فرض کی گئی ہے۔ مگر پانچ کے عددی تعین کے ساتھ قرآن میں نماز کا حکم موجود نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا میں جن اشخاص کا ذکر آتا ہے، اس میں سال پیدائش اور سال وفات کے ساتھ ان کا ذکر آتا ہے۔ مگر قرآن میں پیغمبر اسلام نیز دوسرے پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کی سال پیدائش یا سال وفات مذکور نہیں۔ اس طرح کی ہزاروں معلوماتی باتیں ہیں جن سے قرآن کے صفحات خالی ہیں۔ قرآن کی مذکورہ آیت میں کتاب کا ترجمہ انسائیکلوپیڈیا کے لفظ سے کرنا ایک ذاتی اُپج ہے، اس کے حق میں کوئی علمی بنیاد موجود نہیں۔

۳۔ قرآن میں ایک حکم وہ ہے جو ”اقیموا الدین“ (الشوریٰ ۱۳) کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ اس آیت کا سادہ ترجمہ یہ ہے کہ تم الدین کو قائم کرو۔ کچھ لوگوں نے اس کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں الدین سے مراد قرآن و حدیث میں واردشدہ تمام شرعی اور دینی احکام ہیں۔ اور اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان تمام شرعی اور دینی احکام کو ایک مکمل نظام کے طور پر دنیا میں نافذ کرو۔

آیت کی یہ تفسیر بلاشبہہ تفسیر بالرائے کے حکم میں آتی ہے کیوں کہ وہ قرآن فہمی کے واضح اصولوں کے خلاف ہے۔ مثال کے طور پر، اس آیت میں صراحتاً اس حصۂ دین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے جو حضرت نوح کو اور حضرت ابراہیم کو اور حضرت موسیٰ کو اور حضرت عیسیٰ کو اور حضرت محمد کو مشترک طور پر دیا گیا۔ اس مخصوص انداز بیان کی بنا پر تمام مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ یہاں الدین سے مراد صرف دین کی اساسی تعلیمات ہیں کیوں کہ مختلف پیغمبروں کا مشترک دین یہی اساسی تعلیمات تھیں۔ جہاں تک تفصیلی شرائع کا تعلق ہے وہ نص قرآنی (المائدہ ۴۸) کے مطابق مختلف پیغمبروں کے یہاں مختلف تھیں۔

اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ الدین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو

(الشوریٰ ۱۳) چونکہ دین کی مشترک پیروی صرف اساسی دینی تعلیمات ہی میں ہوسکتی ہے اس لئے یہاں صرف اساسی دینی تعلیمات کو اقامت کے تحت سمجھا جائے گا۔ تمام شرائع کو اس کے تحت لینے کی صورت میں تفرق لازم آئے گا، یعنی وہی چیز جس سے آیت میں منع کیا گیا ہے۔

تفسیر بذریعہ تدبّر

عام طور پر تفسیر کی دو قسمیں سمجھی جاتی ہیں۔ تفسیر ماثور، اور تفسیر بالرائے۔ مگر تفسیر کی ایک اور قسم ہے جس کو تفسیر بذریعہ تدبر کہا جا سکتا ہے۔ احادیث و آثار اور اقوال سلف کی روشنی میں قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرنا، بلاشبہہ بہت اہم اور ضروری ہے۔ مگر قرآن کے عجائب کو مزید دریافت کرنے کے لئے ہر دور میں اس پر غور و تدبر کا سلسلہ جاری رہے گا۔ جائز دائرے میں اس کا سلسلہ کبھی بند نہیں ہوگا۔ یہاں قرآن سے ایک مثال دی جاتی ہے جس سے یہ معاملہ مزید واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۱۲ میں حضرت یوسف کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف کو مصر کے ارضی خزائن پر حاکم مقرر کیا گیا۔ قحط کے زمانہ میں ان کے خصوصی انتظام کے تحت لوگوں کو غلّہ فراہم کیا جانے لگا۔ اسی زمانہ میں غلّہ لینے کے لئے ان کے بھائی کنعان سے مصر آئے۔ اور غلہ حاصل کر کے روانہ ہوئے۔ پھر یہ واقعہ ہوا کہ دربار کے کارکنوں نے حضرت یوسف کے چھوٹے بھائی بن یامین کے اونٹ پر لدے ہوئے غلّہ سے ایک شاہی سامان برآمد کیا۔ اس کے بعد بن یامین کو چوری کے الزام میں ماخوذ کر کے حضرت یوسف کے حوالے کر دیا گیا۔

یہاں قرآنی آیتوں کی تفسیر عام طور پر یہ کی جاتی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی بن یامین کو پہچان کر انہیں اپنے پاس روکنا چاہا مگر چونکہ وہ اپنی شخصیت کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے اس لئے انہوں نے یہ تدبیر کی کہ جب بھائیوں کو غلہ دیا جانے لگا تو ان کے حکم سے ایک شاہی سامان (سقایہ) بن یامین کے سامان میں رکھ دیا گیا پھر جب وہ لوگ اپنا غلہ لے کر جانے لگے تو نعوذ باللہ

حضرت یوسفؑ نے یہ کیا کہ قافلے کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی کروائی۔ پھر جب منصوبہ کے مطابق، شاہی سقایۃ بن یامین کے سامان سے نکل آیا تو انہوں نے بن یامین کو نعوذ باللہ چور قرار دے کر اپنے پاس روک لیا اور بقیہ بھائیوں سے کہا کہ تم لوگ واپس جاؤ۔

یہ تفسیر واضح طور پر ایک پیغمبر کے اخلاق کو داغدار کرتی ہے۔ مگر جب قرآن کی متعلق آیتوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ تفسیر کے علاوہ یہاں ایک اور زیادہ صحیح تفسیر موجود ہے۔ اس دوسری تفسیر میں حضرت یوسفؑ مکمل طور پر بری الذمہ قرار پاتے ہیں۔

یہ دوسری تفسیر سورۃ یوسف (رکوع ۹ آیت ۷۰۔۷۶) کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہے۔ ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ حضرت یوسف نے جب ان کا سامان سفر درست کیا تو اپنے بھائی بن یامین کے سامان میں اپنا سقایہ (پینے کا پیالہ) رکھ دیا پھر جب بھائیوں کا یہ قافلہ روانہ ہوا تو درباریوں کو کسی وجہ سے اپنا صواع (ناپنے کا پیمانہ) دکھائی نہیں دیا۔ چنانچہ انہوں نے قافلہ والوں کو پکار کر روکا اور کہا کہ ہم کو شبہہ ہے کہ تم نے ہمارا (چاندی کا) صواع چرا لیا ہے۔ چنانچہ قافلہ کو روک کر ان کے سامان کی تلاشی لی گئی۔ آخر کار حضرت یوسفؑ کے بھائی بن یامین کے سامان سے وہ برآمد ہو گیا۔ پھر کنعان کے قانون کے مطابق بن یامین کو پکڑ کر حضرت یوسفؑ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس طرح حضرت یوسف کو اپنا وہ بھائی مل گیا جس کو وہ اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے۔

ان آیتوں کے الفاظ پر غور کیجئے تو ایک بہت بامعنیٰ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ حقیقت عربی قاعدہ کے مطابق، ضمیر کے فرق میں چھپی ہوئی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائی کے سامان میں جو چیز رکھی وہ سقایہ (۷۰) تھا۔ یعنی ایک ایسی چیز جو عربی قاعدے کے مطابق، مونث ہے مگر دربار کے کارکنوں نے قافلے والوں کی تلاشی کے بعد ان کے سامان میں سے جو چیز برآمد کی اس کو قرآن میں ضمیر مذکر کے بجائے ضمیر مؤنث (ثم استخرجها) کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی ضمیر 'ہ' کی بجائے 'ھا'۔

ضمیر کے اس فرق پر غور کرنے سے معاملہ کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت یوسف نے اپنے بھائی کے سامان میں برادرانہ محبت کے تحت زادراہ کے ساتھ اپنا پانی پینے کا پیالہ بھی رکھ دیا تھا۔ درباری کارکن اس سے باخبر نہ تھے۔ البتہ اس دوران دربار کی ایک اور زیادہ بڑی چیز، صواع (غلّہ ناپنے کا پیمانہ) سامانوں میں دب کر بظاہر گم ہوگیا۔ جلدی میں درباری کارکنوں کا دھیان قافلے والوں کی طرف گیا اور انہوں نے ان پر شبہہ کرتے ہوئے انہیں روکا اور ان کے سامان کی تلاشی لی۔ اس تلاشی کے دوران ان کا مطلوب پیمانہ 'صواع' تو نہیں ملا البتہ اس دربار کی ایک اور چیز، پانی پینے کا پیالہ (سقایۃ) بن یامین کے سامان سے برآمد ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے بن یامین کو خود برادرانِ یوسفؑ کی شریعت کے مطابق روک لیا۔

یہ سارا معاملہ حضرت یوسفؑ کے کسی حکم کے بغیر درباریوں نے بطور خود کیا۔ اسی لئے اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ''اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لئے تدبیر کی، وہ بادشاہ کے قانون کے رو سے اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا۔ مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں۔ اور ہر علم والے سے بالاتر ایک علم والا ہے۔ (یوسف ۷۶) یہ تفسیر قرآنی الفاظ کے مطابق بھی ہے اور حضرت یوسف کی پیغمبرانہ عظمت کے مطابق بھی۔

قرآن میں اہل ایمان کو حکم دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: **وأعدوا لهم مااستطعتم من قوة و من رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم و آخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم** (الانفال ٦٠) یعنی اور ان کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے تیار رکھو قوت اور پلے ہوئے گھوڑے کہ اس سے تمہاری ہیبت رہے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے علاوہ دوسرے پر بھی جن کو تم نہیں جانتے۔ اللہ ان کو جانتا ہے۔

موجودہ زمانہ کے ایک عرب مفسر قرآن نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اعداد قوت کا مقصد تحریر الانسان ہے۔ اہل ایمان کو طاقت کی فراہمی کا حکم اس لیے دیا گیا تا کہ وہ

ساری دنیا کے انسانوں کو ہر قسم کی غلامی سے آزاد کرائیں۔ مثلاً کمیونزم، نازی ازم، سیکولرزم اور زائنزم (صیہونیت)، وغیرہ کی غلامی سے نجات دلانا۔

آیت کی یہ تفسیر بظاہر ایک انقلابی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔ مگر یقینی طور پر وہ تفسیر بالرائے ہے۔ مفسر نے قرآن کے الفاظ پر غور کیے بغیر اپنے ذہن میں موجود خیالات کو آیت کی تفسیر میں شامل کر دیا۔ آیت کے الفاظ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مطابق، اعداد قوت کا مقصد ارہاب عدو ہے یعنی دشمن کو ہیبت زدہ رکھنا تاکہ وہ اہل ایمان کے خلاف جارحیت کا حوصلہ نہ کرسکے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آیت میں اعداد قوت کا حکم دفاعی مقصد کے تحت دیا گیا ہے، مگر مذکورہ مفسر نے اس کو اقدامی معنیٰ میں لے لیا۔

سلطانی ماڈل، دعوتی ماڈل

موجودہ زمانہ کے مسلمان ساری دنیا میں تباہی اور ذلّت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ تباہی کی یہ مدت پوری انیسویں صدی اور بیسویں صدی تک پھیلی ہوئی ہے۔ سلطان ٹیپو سے لے کر یاسر عرفات تک دوسو سال سے تباہی کا سلسلہ جاری ہے اور ابھی تک بظاہر اس کے خاتمہ کے کوئی آثار نہیں۔

مسلمانوں کی اس تباہی کا سبب بے عملی نہیں ہے بلکہ وہ مکمل طور پر ہنگامہ خیز عمل کے درمیان ہو رہی ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ان دوسو سالوں میں دُنیا بھر کے مسلمانوں نے جان و مال کی جو قربانی دی ہے وہ مقدار کے اعتبار سے اسلام کی بقیہ پوری تاریخ کی قربانیوں سے بھی زیادہ ہے۔

کیا وجہ ہے کہ عمل اور قربانی کے مسلسل ہنگاموں کے باوجود مسلمان دورِ جدید میں عزت و غلبہ کا مقام حاصل نہ کر سکے۔ جب کہ قرآن و حدیث میں واضح یقین دہانیاں موجود ہیں کہ اہل ایمان کی کوششوں کو اللہ ضائع نہیں کرے گا، اُن کے حریفوں کے مقابلہ میں ضرور اُنہیں سرفرازی عطا فرمائے گا۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے اپنی کوششوں کے لیے غلط منہج اختیار کیا۔ اُنہوں نے اپنی کوششوں کو اُس مطلوب طریقہ پر جاری ہی نہیں کیا جس کو اختیار کر کے خدا کی نصرت حاصل کی جاسکتی ہے۔ اور یقیناً اس دنیا میں کامیابی اُس کے لیے ہے جس کو خدا اپنی نصرت سے نوازے۔ اللہ کی نصرت کے بغیر یہاں کامیابی ممکن نہیں۔

اصل یہ ہے کہ خدا نے اپنی نصرت کا وعدہ اُن لوگوں سے کیا ہے جو اپنی کوششوں کے لیے پیغمبرانہ ماڈل کو اختیار کریں۔ یہ پیغمبرانہ ماڈل وہی ہے جس کو ہم نے دعوتی ماڈل کا نام دیا ہے۔ اہل ایمان کی حقیقی کامیابی پیغمبر کے قائم کئے ہوئے اسی دعوتی ماڈل سے وابستہ ہے۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما بعد کے دور میں مسلم سلاطین کے قائم کئے ہوئے سلطانی ماڈل سے اتنا متاثر تھے کہ انہوں نے اپنی تمام تحریکیں اسی سلطانی ماڈل پر چلا دیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی

تمام تباہیوں کا اصل سبب یہی انحراف ہے۔

مسلم رہنماؤں نے دیکھا کہ بعد کے زمانہ میں مسلم سلاطین مسلّح فوجوں کو لے کر مختلف علاقوں میں گھس گئے۔ وہاں انہوں نے قائم شدہ حکومت کی فوجوں کو زیر کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ سلطانی ماڈل اتنا زیادہ عام ہوا کہ بعد کے زمانہ میں لکھی جانے والی مسلم تاریخیں تقریباً سب کی سب اسی سلطانی ماڈل پر ڈھال دی گئیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے ان تاریخی کتابوں کو پڑھا اور یہ سمجھ لیا کہ اسلامی تحریک کا ماڈل بس یہی سلطانی ماڈل ہے۔ انہوں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی سلطانی ماڈل کو معیاری ماڈل سمجھا اور مسلّح جہاد کے نام پر اس کو ہر جگہ جاری کر دیا۔ یہی غلطی موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب ہے۔

اسلامی عمل کا صحیح ماڈل وہ ہے جو پیغمبر اسلام ﷺ نیز دوسرے پیغمبروں کی مثال سے معلوم ہوتا ہے۔ یہ ماڈل دعوتی ماڈل ہے۔ دعوتی ماڈل سے مراد یہ ہے کہ اپنے عمل کی بنیاد اسلام کی نظریاتی اشاعت پر رکھی جائے۔ اُس کو مخاطب کے معیارِ فہم کے مطابق مدلّل کرتے ہوئے پیش کیا جائے۔ تشدد سے مکمل پرہیز کرتے ہوئے صرف پُر امن ذرائع سے کام کو آگے بڑھایا جائے۔ فریقِ ثانی اگر زیادتی کرے تب بھی یک طرفہ صبر کرتے ہوئے پُر امن اشاعتی مہم کو جاری رکھا جائے۔ ہر قیمت پر یہ کوشش کی جائے کہ داعی اور مدعو کے درمیان نفرت اور کشیدگی کا ماحول ہرگز قائم نہ ہونے پائے۔ معتدل ماحول ہمیشہ اسلام کے لیے مفید ہوتا ہے اور غیر معتدل ماحول ہمیشہ اسلام کے لئے غیر مفید۔ یہی دعوتی ماڈل ہے اور اسی طریقہ کو اختیار کر کے پیغمبر اسلام ﷺ نے خدا کے دین کو عزت اور غلبہ کے مقام تک پہنچایا۔

پیغمبرانہ ماڈل میں اصل عمل دعوت کے اصول پر جاری ہوتا ہے۔ وہ آغاز میں بھی دعوت ہے اور آخر میں بھی دعوت۔ بعض اوقات بطور استثناء محدود طور پر کسی سے دفاعی ٹکراؤ پیش آسکتا ہے، وہ بھی اس وقت جب کہ اعراض کی تمام کوششیں ناکام ہوگئی ہوں اور یک طرفہ جارحیت کی بنا پر اہل ایمان کو وقتی طور پر اپنے دفاع میں لڑنا پڑے۔ اس وقتی دفاع کے پہلے بھی دعوت ہے اور اس کے بعد بھی دعوت۔ پیغمبرانہ ماڈل میں دعوت کی حیثیت اقدام کی ہے اور جنگ کی حیثیت محدود معنوں میں صرف وقتی دفاع کی۔

موجودہ زمانہ میں ساری دنیا میں نئے انقلابات ہوئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں عالمی صورت حال مکمل طور پر بدل گئی ہے۔ ان تبدیلیوں نے مسلّح جنگ کو بالکل غیر ضروری قرار دے دیا ہے۔ اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ صرف دعوتی عمل کے ذریعہ وہ سب کچھ حاصل کرلیا جائے جو اسلام اور اہل اسلام کو عزت اور غلبہ کے مقام تک پہنچانے کے لیے درکار ہے۔

قدیم زمانہ میں اہل ایمان کو مذہبی جبر کے ماحول میں اپنا دعوتی کام کرنا پڑا تھا، اب یہ دعوتی کام پوری طرح مذہبی آزادی کے ماحول میں کیا جاسکتا ہے۔ پہلے زمانہ میں حق کی پیغام رسانی کے لیے داعی کو پُر مشقت سفر کرنا پڑتا تھا، اب جدید کمیونیکیشن نے اس کو ممکن بنا دیا ہے کہ خود دعوتی پیغام تیزی سے سفر کرکے دنیا بھر کے تمام لوگوں تک پہنچ سکے۔ قدیم زمانہ کے داعیوں کو مختلف قسم کے توہمات کا سامنا کرتے ہوئے حق کا پیغام پھیلانا پڑتا تھا، مگر اب سائنسی انقلاب نے توہمات کا تقریباً خاتمہ کردیا ہے، اب یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کھلی ذہنی فضا میں حق کے پیغام کو عام بنایا جاسکے۔ پہلے زمانہ میں معیشت کا انحصار صرف زراعت پر تھا، اس لیے داعیوں کو بہت کم وسائل کے ساتھ اپنا مشن چلانا پڑتا تھا، اب صنعتی انقلاب کے بعد ساری دنیا میں اقتصادی انفجار (economic explosion) کا زمانہ آگیا ہے، اب وہ کام معاشی فراوانی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جو پچھلے لوگوں کو صرف معاشی تنگی کے ساتھ کرنا پڑا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید تبدیلیوں نے دعوتی ماڈل کی افادیت اور اہمیت کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما صرف سلطانی ماڈل سے آشنا تھے، وہ دعوتی ماڈل کو یکسر فراموش کرچکے تھے۔ انہوں نے انتہائی بے دانشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری ملت کو سلطانی ماڈل کے طریقہ پر ڈال دیا، اور پھر ملت کو بھی تباہ کیا اور خود اپنے آپ کو بھی۔

دوگونہ غلطی

جدید دور میں سلطانی ماڈل تباہ کن حد تک غیر مفید بن چکا تھا۔ مگر دو سو سال کا ناکام تجربہ بھی نااہل مسلم رہنماؤں کی بے خبری کو توڑنے والا ثابت نہ ہوسکا۔ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کو مکمل

طور پر کھونے کے باوجود اکیسویں صدی میں بھی وہ سلطانی دور کے اس فرسودہ ماڈل ہی کو بظاہر معیاری ماڈل سمجھ رہے ہیں۔

دورِ جدید میں ناکام سلطانی ماڈل کو دہرانے کی دو قسمیں ہیں۔ اس کی پہلی قسم ہے، حکمراں کے ذریعہ سلطانی ماڈل کو اپنانا اور اُس کی دوسری قسم ہے، غیر حکومتی افراد یا جماعتوں کے ذریعہ اس ماڈل پر عمل کرنا۔

سلطان ٹیپو پہلی قسم کی ایک مثال ہیں جنہوں نے حکمراں کی سطح پر اُسے ناکام طور پر دہرایا۔ وہ قدیم سلطانی ماڈل سے باہر آ کر معاملہ کو سمجھ نہ سکے۔ ۱۷۹۹ء میں وہ انگریزوں کے خلاف ایک ناعاقبت اندیشانہ جنگ لڑ کر ہلاک ہو گئے۔ موجودہ زمانہ میں عراق کے صدر صدام حسین کی زندگی بھی اسی سلطانی ماڈل کو اختیار کرنے کی ایک ناکام مثال ہے۔

اس کے بعد اس سلطانی ماڈل کے نام پر تجربہ کی دوسری قسم شروع ہوتی ہے۔ یہ دوسری قسم وہ ہے جب کہ غیر حکومتی تنظیموں نے اپنے مفروضہ دشمنوں کے خلاف لڑائی شروع کر دی۔ دوسری قسم کی اس لڑائی کا غالباً پہلا واقعہ وہ ہے جو ۱۸۳۱ء میں پیش آیا۔ جب کہ مولانا سید احمد بریلوی اور اُن کے ساتھیوں کا قافلہ مہاراجہ رنجیت سے لڑ کر بالاکوٹ میں تباہ ہو گیا۔

اس کے بعد ۱۸۵۷ء میں اس نوعیت کا دوسرا بڑا واقعہ وہ ہوا جب کہ علماء ہند کی جماعت نے انگریزوں کے خلاف مسلح جہاد شروع کیا۔ اس کے بعد غیر حکومتی تنظیموں کے ذریعہ سلطانی ماڈل کے ناکام تجربہ کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا جو تادمِ تحریر جاری ہے۔ فلسطین، کشمیر، بوسنیا، چیچنیا، فلپائن، اراکان اور دوسرے بہت سے مقامات پر جہاد کے نام پر جو تباہ کن مسلح ٹکراؤ ہو رہا ہے وہ سب اسی دوسرے قسم کے تجربہ کی مثالیں ہیں۔

سلطانی ماڈل کے تجربہ کی دوسری قسم جو غیر حکومتی تنظیموں کے ذریعہ گوریلا وار، پراکسی وار، وغیرہ کی صورت میں شروع ہوئی، وہ پہلی قسم سے بھی زیادہ مہلک تھی۔ اس میں بیک وقت دو غلطیاں شامل ہو گئیں ـــــ دعوتی دور میں سلطانی ماڈل کے طریقے کو اختیار کرنے کی خلافِ زمانہ کوشش، دوسری اس

سے زیادہ سنگین بات یہ کہ یہ طریقہ شرعی اعتبار سے سراسر غلط تھا۔

کیوں کہ ثابت شدہ طور پر مسلح جنگ صرف قائم شدہ حکومت کا حق ہے، غیر حکومتی تنظیموں کے لئے یہ جائز ہی نہیں کہ وہ کسی کو دشمن بتا کر اُس کے خلاف مسلح ٹکراؤ شروع کر دیں۔ پہلی قسم میں سلطانی ماڈل کا تجربہ اگر صرف نادانی تھا تو دوسری قسم میں سلطانی ماڈل کا تجربہ نادانی کے ساتھ شریعت سے انحراف کے ہم معنیٰ بن گیا۔

یہی وہ دوگونہ غلطی ہے جس نے موجودہ زمانہ میں مسلم رہنماؤں کے مسلّح جہاد کو سراسر ناکام بنا دیا۔ اس کا سبب کسی غیر قوم کی سازش نہیں جیسا کہ اکثر علماء اور دانشور بے دلیل طور پر اعلان کرتے رہتے ہیں۔

سلطانی ماڈل ہر اعتبار سے دعوتی ماڈل سے مختلف ہے۔ دعوتی ماڈل مکمل طور پر اسلام کے موافق مزاج بناتا ہے۔ اس کے برعکس سلطانی ماڈل ایسا مزاج بناتا ہے جو ہر پہلو سے اسلامی تقاضوں کے بالکل خلاف ہو۔

اس معاملہ کی ایک مثال کشمیر اور پاکستان کا مسئلہ ہے۔ پاکستان کا تصور مکمل طور پر سلطانی طرزِ فکر کا نتیجہ تھا۔ پاکستانی لیڈروں کے ذہن میں اگر دعوتی ماڈل ہوتا تو وہ ہرگز جغرافی تقسیم کی بات نہ کرتے۔ ایسی صورت میں وہ اس کو خدا کی ایک رحمت سمجھتے کہ متحد ہندستان کی صورت میں ان کو گویا ایک پورا برّ اعظم میدان کار کے طور پر مل رہا ہے۔ ان کے ذہن میں ماضی کا سلطانی ماڈل بسا ہوا تھا۔ سلطانی ماڈل میں سارا فوکس صرف سیاسی اقتدار پر ہوتا ہے، مواقع دعوت یا مواقع کار کی سلطانی ماڈل میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس بے شعوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے تقسیم کی تحریک چلا کر سارے برصغیر ہند میں نفرت (بالفاظ دیگر، مخالف دعوت) کا جنگل اگا دیا۔ سارے دعوتی امکانات مسدود ہو کر رہ گئے۔

اس غیر اسلامی اور غیر حکیمانہ سیاست کا دوسرا دور ۱۹۴۷ء سے شروع ہوتا ہے۔ پندرہ اگست ۱۹۴۷ کو جب یہ علاقہ انگریزی اقتدار سے آزاد ہوا تو یہاں دو بڑے ریاستی مسئلے تھے۔ ایک حیدرآباد

کا اور دوسرا کشمیر کا۔ ریاست حیدر آباد میں ہندو اکثریت تھی مگر حکمراں مسلمان تھا۔ اس کے برعکس ریاست کشمیر میں مسلم اکثریت تھی مگر حکمراں ہندو تھا۔ اب یہ سوال تھا کہ ان دونوں ریاستوں کا سیاسی مستقبل کیا ہو۔ حیدر آباد کے نواب نے اپنا رسمی الحاق پاکستان سے کرلیا اس کے برعکس کشمیر کے راجہ نے ہندستان کے ساتھ الحاق کے کاغذات پر دستخط کردئے۔

اس نزاع کو ختم کرنے کے لیے نئی دہلی کی لیڈرشپ نے ایک حقیقت پسندانہ پیشکش کی۔ اُس نے پاکستانی لیڈروں سے کہا کہ تم حیدر آباد سے اپنا دعویٰ واپس لے لو اور ہم کشمیر سے اپنا دعویٰ واپس لے لیں۔ اس طرح یہ نزاع ختم ہو جائے گی اور دونوں ملک معتدل انداز میں ترقی کے راستہ پر اپنا سفر شروع کردیں گے۔

ہندستانی لیڈروں کی اس پیش کش کی تائید میں قرآن میں یہ واضح ہدایت موجود تھی: **وإن جنحوا للسلم فاجنح لها** (الأنفال ٦١) یعنی اگر فریقِ ثانی صلح کی پیش کش کرے تو تم فوراً اس پیشکش کو قبول کرلو۔ مگر پاکستان کے لیڈر جو سلطانی ماڈل سے مسحور کن حد تک متاثر ہونے کی وجہ سے حاکمانہ نفسیات کا شکار تھے، وہ اس قیمتی پیشکش کو قبول نہ کرسکے۔ اس کے بعد جو بے پناہ تباہی آئی وہ ہر ایک کے لیے ایک معلوم واقعہ ہے۔

کشمیر کے بارے میں پاکستانی لیڈروں کی یہ ناقابلِ فہم نادانی تاریخی ریکارڈ سے ثابت ہے۔ اس معاملہ کو حسب ذیل کتابوں میں تفصیل کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے:

1. Looking Back, by Mehrchand Mahajan.
2. Witness to an Era, by Frank Morris.
3. Emergence of Pakistan, by Chaudhary Mohd. Ali.
4. The Nation that Lost Its Soul, by Sardar Shaukat Hayat Khan

پاکستانی لیڈروں کی سلطانی نفسیات اس میں رکاوٹ بن گئی کہ وہ کشمیر کے مسئلہ کو میز کی گفت وشنید کے ذریعہ حل کرسکیں۔ اس کے بعد انہوں نے شدید تر غلطی یہ کی کہ وہ فوجی طاقت کو استعمال کرکے اس مسئلہ کے حل کا خواب دیکھنے لگے۔ پہلے انہوں نے براہِ راست مسلح اقدام کے ذریعہ

ہندستان سے فوجی ٹکراؤ کیا۔ مگر اس اقدام میں انہیں مکمل ناکامی ہوئی۔ اُن کی سلطانی نفسیات اب بھی حقیقت پسندی کا راستہ اختیار نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے کشمیر میں ہندستان کے خلاف وہ خفیہ جنگ شروع کردی جس کو پراکسی وار (proxy war) کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ پراکسی وار نہ صرف پاکستان اور کشمیر دونوں کی تباہی کا ذریعہ تھی بلکہ وہ اسلامی شریعت کے اعتبار سے یقینی طور پر ناجائز بھی تھی۔ کیوں کہ اسلام میں کسی کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لیے اعلان ضروری ہے: **فانبذ الیھم علی سواء** (الأنفال ۵۸)۔

ہندستان کے خلاف اس غیر اسلامی اور غیر دانش مندانہ جنگ کو درست ٹھہرانے کے لیے پاکستان نے دوسری بہت سی شدید تر غلطیاں کیں۔ مثلاً پاکستان نے اپنی خارجہ سیاست اور اپنے میڈیا کو مکمل طور پر ہندستان کو بدنام کرنے اور اُس کے خلاف نفرت پھیلانے کا کارخانہ بنا دیا۔ کشمیر کی گوریلا وار یا پراکسی وار میں پوری طرح شامل ہونے کے باوجود وہ مسلسل طور پر اس قول زور کا سہارا لیتا رہا کہ اس جنگجوئی سے ہمارا کوئی عملی تعلق نہیں۔ حالانکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ کشمیریوں کی جنگجوئی پوری طرح پاکستان کی مدد سے جاری ہے۔ اسی طرح ظاہری طور پر اپنے آپ کو پُر امن قوم بتانے کے لیے پاکستانی لیڈروں نے بار بار امن کے معاہدہ پر دستخط کئے ــــــــــ معاہدۂ تاشقند (۱۹۶۵) معاہدۂ شملہ (۱۹۷۲) معاہدۂ لاہور (۱۹۹۸)۔

اس قسم کے تمام معاہدے اور اعلانات بھی پاکستانی لیڈروں کے غیر دعوتی ذہن کا شکار ہوتے رہے۔ کاغذ کے اوپر انہوں نے بار بار یہ لکھا کہ کشمیر کے مسئلہ کو جنگ کے بجائے پُر امن گفت وشنید کے ذریعہ حل کیا جائے۔ مگر یہ معاہدے غالبًا دنیا کو دکھانے کے لیے تھے۔ کیوں کہ انہوں نے کسی بھی معاہدہ کے بعد اپنی خفیہ جنگی کارروائی کو بند نہیں کیا۔ حالانکہ قرآن کے مطابق، معاہدہ کی لفظی اور معنوی پابندی اہلِ اسلام کے لیے ضروری ہے: **وأوفوا بالعھد إنّ العھد کان مسئولا** (الإسراء ۳۴)

پاکستان کے لیڈر اگر اپنے سلطانی ماڈل سے باہر آئیں اور دعوتی ماڈل کو بنیاد بنا کر سوچیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ اُن کے لیے قرآن میں واضح رہنمائی موجود ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ

دنیا میں بہر حال ہر فرد اور قوم کو مصیبت کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہاں انسان کھوتا بھی ہے اور پاتا بھی ہے۔ یہ دونوں قسم کے تجربے امتحان کے لئے ہیں۔ ایسی حالت میں انسان کو کیا کرنا چاہئے۔ اس کا جواب قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: **لکیلا تأسوا علی مافاتکم ولا تفرحوا بما آتٰکم (الحدید ۲۳)**

قرآن کی اس آیت میں پاکستانی لیڈروں کے لیے یہ رہنمائی ہے کہ کشمیر کو وہ اُسی طرح اختیارانہ طور پر کھوئے ہوئے خانہ میں ڈال دیں، جس طرح وہ ۱۹۷۱ میں مشرقی پاکستان کو مجبورانہ طور پر کھوئے ہوئے خانہ میں ڈال چکے ہیں۔ کشمیر میں وہ اپنی موجودہ مایوسانہ سیاست کو ختم کردیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کشمیر کے معاملہ میں صورت موجودہ (status quo) کو مان کر ہندستان سے معتدل تعلقات قائم کرلیں اور منفی سیاست کا طریقہ چھوڑ کر مثبت سیاست کا طریقہ اختیار کریں۔ اس طرح ان کی ترقی کا وہ دروازہ کھُل جائے گا جو آدھی صدی سے بھی زیادہ مدت سے اُن کے اوپر بند پڑا ہوا ہے۔

خلاصۂ بحث

اکیسویں صدی میں پہنچ کر اب آخری وقت آ گیا ہے کہ تمام مسلم رہنما توبہ کے شرعی اُصول پر عمل کریں۔ وہ اپنی دوسوسالہ غلطی کا کھلے طور پر اعتراف کریں۔ اور دعوتی ماڈل کے اصول پر اپنے اسلامی عمل کی ازسرِ نو منصوبہ بندی کریں۔ اس اعتراف اور تصحیح عمل سے کم کوئی چیز موجودہ تباہ کن صورت حال کو بدلنے والی نہیں۔

ربّانی تعقل

قرآن میں بنیادی طور پر دو قسم کی تعلیمات ہیں۔ ایک وہ جن کو احکام کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے وہ جو تفکر اور تدبر سے تعلق رکھتی ہیں۔ اوّل الذکر کی حیثیت اگر عملی ہے تو ثانی الذکر کی حیثیت فکری۔

قرآن میں دونوں ہی قسم کی تعلیمات اجمالی انداز میں آئی ہیں۔ یہ کام علماء اسلام کا ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی رہنمائی میں اس اجمال کی تفصیل کریں۔ جہاں تک احکام کا تعلق ہے، اُن کی تفصیل اور تدوین فقہ کی صورت میں کی گئی ہے۔ یہ کام بہت بڑے پیمانے پر ہوا ہے۔ اس کو بنیادی طور پر ایک کامیاب کوشش کہا جاسکتا ہے۔ جہاں تک تفکر اور تدبر والے حصہ کا تعلق ہے، اُن کے سلسلہ میں بھی پچھلے ہزار سال کے دوران مقدار کے اعتبار سے کافی کام ہوا ہے۔ مگر وہ بڑی حد تک غیر اطمینان بخش ہے۔ یہ کہنا غالباً درست ہوگا کہ اس پہلو سے جو لٹریچر تیار ہوا ہے وہ زمانی افکار سے اتنا زیادہ متاثر ہے کہ قرآن کی حقیقی روح اُس میں اوجھل ہوگئی ہے۔

اس موضوع پر کام کرنے والوں کا پہلا گروہ وہ ہے جن کو متکلمین کہا جاتا ہے۔ یہ گروہ ابتداءً عباسی خلافت کے زمانہ میں پیدا ہوا۔ اس گروہ کے مشہور ناموں میں سے الفارابی (وفات ۹۵۰ء) ابن رُشد (وفات ۱۱۹۸ء) الرازی (وفات ۱۲۱۰ء)، وغیرہ ہیں۔ متکلمین کے اس گروہ نے قرآنی تفکر اور تدبر کے اظہار کے لئے جس فکری ماڈل کو اپنایا، وہ یونانی فلسفہ کا ماڈل تھا۔ یہ فلسفہ قیاسی منطق کے اصول پر قائم تھا۔ اس لیے وہ بذات خود ایک غیر حقیقی ماڈل تھا۔ اس ماڈل پر قرآن کے فکری اجمال کی جو تفصیل کی گئی وہ بڑی حد تک من تمنطق تز ندق کی مصداق تھی۔ اس پورے مجموعے پر فارسی شاعر کا یہ شعر صادق آتا ہے:

فلسفی سرِّ حقیقت نتوانست کشود　　　گشت رازِ دگر آں راز کہ افشا می کرد

اس سلسلہ کا دوسرا گروہ وہ ہے جس نے وحدتِ وجود کے تصور پر قرآنی عقلیت کو واضح کرنا چاہا۔ اس کو ایک لفظ میں وحدانی تعقل کہا جاسکتا ہے۔ اس طبقہ کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں ـــــ

ابن العربی کی کتاب الفتوحات المکیۃ، مولانا روم کی مثنوی، علامہ اقبال کی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (Reconstruction of Religious Thought in Islam)۔

یہ طریقہ جس کو ہم نے وحدانی تعقل کا نام دیا ہے، وہ اول الذکر یونانی تعقل سے بھی زیادہ غلط تھا۔ اوّل الذکر کو اگر عقلی چیستاں کہا جائے تو یہ دوسرا طریقہ کھلی ہوئی ذہنی گمراہی تھا۔ اس طریقہ میں توحید کے عقیدہ کو وحدتِ وجود (Monism) کے تصور پر ڈھال دیا گیا۔ جب کہ اسلام میں توحید کا عقیدہ وحدتِ خدا (monotheism) کے اصول پر قائم ہے۔ وحدت وجود کا نظریہ سراسر ضلالت ہے اور وحدتِ خدا کا نظریہ سراسر ہدایت۔

موجودہ زمانہ میں مسلم اہلِ قلم کا ایک اور گروہ پیدا ہوا جس نے اسلامی عقلیت کو سیاسی تعقل کے ہم معنٰی بنا دیا۔ اس گروہ نے اسلام کی تعلیمات کو سیاسی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے لا الٰہ الا اللہ کو لا حاکم الا اللہ کے ہم معنٰی قرار دیا۔ اس گروہ میں مصر کے سید قطب اور پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی، وغیرہ شامل ہیں۔

سیاسی تعقل کا یہ طریقہ، اپنی حقیقت کے اعتبار سے اسلامی تعقل کی تصغیر تھا۔ اس تشریح میں عقیدۂ اسلامی کی آفاقی وسعت سیاست کے محدود دائرہ میں سمٹ کر رہ گئی۔ اسلامی تعقل کی اس سیاسی تشریح کے نتیجہ میں ایک اور ہلاکت خیز انجام سامنے آیا۔ جو لوگ اس تشریح سے متاثر ہوئے انہیں کرنے کا کام صرف یہ نظر آیا کہ وہ وقت کے سیاسی ڈھانچہ کو توڑیں اور اس کی جگہ اپنے مزعومہ نقشہ کے مطابق، نیا نظام بنائیں۔ اس طرح اس سیاسی تشریح نے مسلم دنیا میں اُس تخریبی سیاست کو مزید شدت کے ساتھ جنم دیا جس کا ایک نمونہ کمیونزم کو ماننے والوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔

قرآن کے مطابق، تفکر اور تدبر کی تشریح کا صحیح طریقہ وہ ہے جس کو ربانی تعقل کہا جا سکتا ہے۔ یعنی قرآن کے اشارات کو رہنما بنا کر تخلیق خداوندی کا مطالعہ کرنا اور حقائق فطرت کی روشنی میں اُن کی تشریح و تفصیل کرنا۔ مطالعہ کا یہی اسلوب حقیقی اسلوب ہے۔ اس سے وہ اہل ایمان پیدا ہوتے ہیں جو معرفتِ الٰہی اور خشیتِ ربانی کی نعمت سے سرشار ہوں۔ قرآن کی سورہ آل عمران کے آخری رکوع میں

یہی حقیقت بیان ہوئی ہے۔قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی اس حقیقت کی طرف بار بار اشارہ کیا گیا ہے۔اس سلسلہ کی دو قرآنی آیتوں کا ترجمہ یہ ہے: کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا۔ پھر ہم نے اُس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کر دیئے۔اور پہاڑوں میں بھی سفید اور سرخ مختلف رنگوں کے ٹکڑے ہیں اور گہرے سیاہ بھی۔اور اسی طرح انسانوں اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ کے ہیں۔اللہ سے اُس کے بندوں میں سے صرف وہی ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔ بے شک اللہ زبردست ہے، بخشنے والا ہے (فاطر ۲۷۔۲۸)

ربانی تعقل کی تشریح کے لئے موجودہ زمانہ میں نئے وسیع امکانات کھل گئے ہیں۔ جدید سائنس کی تحقیقات نے موجودہ زمانہ میں فطرت کی جن چھپی ہوئی حقیقتوں کو دریافت کیا ہے وہ گویا اسی ربّانی تعقل کی تفصیل ہیں۔ربانی تعقل کے ان جدید امکانات کو پیشگی طور پر قرآن میں بتا دیا گیا تھا۔اس سلسلہ میں قرآن کی ایک متعلق آیت کا ترجمہ یہ ہے: ہم عنقریب اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں بھی اور خود ان کے اندر بھی۔ یہاں تک کہ اُن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے (حٰم السجدہ ۵۳)۔

احمد اور الترمذی نے حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے ایک حدیث نقل کی ہے۔اس کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **مثل امتی مثل المطر، لا یُدریٰ اولہ خیر أم آخرہ** (مشکوٰۃ المصابیح ۳/۱۷۷۰)۔یعنی میری امت کی مثال بارش کی مانند ہے۔نہیں معلوم کہ اس کا اوّل بہتر ہوگا یا اُس کا آخر۔

بارش جب ہوتی ہے تو اُس کے ابتدائی دور میں بھی انسان کو بہت سی برکتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مگر بعد کے مرحلہ میں جب بارش سے سیراب ہو کر زمین سبزہ اور درخت اُگاتی ہے تو اس دوسرے مرحلہ میں اُس کی برکتیں اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔اب فصل اور پھول اور پھل، وغیرہ پیدا ہوتے ہیں جو انسان کے لئے بے پناہ خیر و برکت کا ذریعہ ہیں۔

یہی معاملہ دین محمدی کا ہے۔ دین محمدی کا ظہور ہوا تو اُس وقت دنیا اپنے روایتی دور میں تھی۔

اُس دور میں بھی اس دین کے پیروؤں کو اُس سے بے پایاں فائدے حاصل ہوئے۔ بعد کے زمانہ میں جب کہ دنیا سائنسی دور میں داخل ہوگی تو اُس وقت بھی اس دین کے پیروؤں کو نئے امکانات کے اعتبار سے عظیم فائدے حاصل ہوں گے۔ دین کی علمی وفکری عظمت از سرِ نو نئی شان کے ساتھ لوگوں کے ذہنوں پر قائم ہو جائے گی۔

اس حدیث میں امت کے دورِ آخر میں جس عظیم خیر کی پیشین گوئی کی گئی ہے اُس سے مراد غالباً وہی سائنسی حقیقتیں ہیں جنھوں نے نئے وسیع تر انداز میں اس امکان کا دروازہ کھول دیا کہ انسان اُن کو استعمال کر کے یقین کے اعلیٰ درجات حاصل کرے۔ اور اسلام کی صداقت کو نئے دلائل و براہین کے ذریعہ لوگوں کے اوپر ثابت شدہ بنائے۔

ایک سادہ مثال

مذکورہ حدیث میں جس حقیقت کو بتایا گیا ہے اُس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ انسانی تاریخ کے دو بڑے دور ہیں۔ ایک قبل از سائنس دور (pre-scientific period) اور دوسرا بعد از سائنس دور (post-scientific period) ۔اس تقسیم کے مطابق، پہلے دور کا انسان روایتی معلومات کی روشنی میں سوچتا تھا۔ اور دوسرے دور میں وہ سائنسی معلومات کی روشنی میں سوچنے لگا۔ اس حدیث کے مطابق، امت محمدی کے افراد کے لیے روایتی دور بھی ایمانی خوراک کا ذریعہ تھا۔ اسی طرح سائنسی دور میں بھی وہ اپنے ایمانی اضافہ کے لیے علمی خوراک حاصل کرتے رہیں گے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں ایک سادہ مثال درج کی جاتی ہے۔

قرآن میں بار بار زمین کی نعمتوں کا ذکر آیا ہے۔ اس سلسلہ کی ایک قرآنی آیت یہ ہے:
اللّٰہ الذی جعل لکم الأرض قراراً (المؤمن ۶۴) یعنی وہ اللہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو ٹھہراؤ۔ اس آیت میں روایتی دور کے مؤمنین کو بھی ایمان کی غذا ملی تھی۔ یہ سوچ کر اُن کا سینہ شکر خداوندی کے جذبہ سے سرشار ہو گیا تھا کہ زمین کس طرح اُن کے لیے پرسکون جائے قیام بنی ہوئی ہے۔ اگر زمین ہلتی رہتی یا وہ ہچکولے کھاتی تو اس کے اوپر پُرسکون زندگی گذارنا کس قدر دشوار ہو جاتا۔

جدید سائنسی دور میں نئے ذرائع سے جو مطالعہ کیا گیا اس سے معلوم ہوا کہ زمین، سابق تصور کے خلاف ساکن اور بے حرکت نہیں ہے بلکہ وہ مسلسل حرکت میں ہے۔ نئ تحقیقات بتاتی ہیں کہ زمین بیک وقت دو طریقہ سے گردش کر رہی ہے۔ ایک اپنے مدار (orbit) پر سورج کے گرد، اور دوسرے خود اپنے محور (axis) کے اوپر۔ اس نئ سائنسی تحقیق نے مذکورہ آیت کی معنویت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ نئے حالات میں یہ آیت گویا مزید اضافہ کے ساتھ یہ کہہ رہی ہے کہ ـــــــ کیسا مہربان ہے وہ اللہ جس نے زمین کو تمہارے لیے جائے سکون بنایا، باوجودیکہ زمین مسلسل طور پر دہرا حرکت کر رہی ہے:

It is Allah who made the earth a stable home for you.
(Inspite continous doulbe movement of the earth)

حدیث کی تمثیل کے مطابق، ''بارش'' کے پہلے دور میں اگر انسان سادہ طور پر یہ سمجھ کر زمین کو اپنے لیے خدا کی رحمت جانتا تھا کہ وہ اُس کے لیے پُرسکون جائے قیام بنی ہوئی ہے، تو اب بارش کے دوسرے دور میں وہ اس اضافہ کے ساتھ اس معاملہ میں خدا کا شکر کرے گا کہ دہرا طور پر مسلسل حرکت میں ہونے کے باوجود خدا نے زمین کو اُس کے لیے سکون کا مقام بنا دیا ہے۔

کائنات کا ابتدائی دھماکہ

ربانی تعقل کی ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر ۲۱ میں ایک کائناتی واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس آیت کا ترجمہ یہ ہے: کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین بند تھے پھر ہم نے ان کو کھول دیا۔ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا۔ کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے۔

اس آیت میں رتق اور فتق کا لفظ ہے۔ رتق کے معنٰی ہیں کسی مجموعہ کا مخلوط یا منضم ہونا۔ اس سے مراد کائنات کا اصل مادّہ ہے جو ابتدائی وقت میں ایک منضم الاجزاء مجموعہ کی صورت میں تھا۔ پھر اس ابتدائی مجموعہ میں دھماکہ ہوا جس کے بعد اس کے اجزاء وسیع خلا میں بکھر گئے اور پھر ایک لمبے عمل کے بعد موجودہ کائنات بنی۔ قرآن کی اس آیت کو قدیم مفسرین اس کے سادہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے لیتے تھے۔ اپنے سادہ لفظی مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ آیت اہل حق کے لئے عظیم ایمانی فائدے رکھتی ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان سے قرآن کے اس مجمل بیان کی تفصیل

سامنے آئی ہے جو گویا یقین اور معرفت کا نیا دروازہ کھولنے والی ہے۔

جدید فلکیاتی سائنس بتاتی ہے کہ تقریباً بیس بلین سال پہلے خلا میں ایک سپر ایٹم تھا۔ اس میں اچانک دھماکہ ہوا۔ اس کے بعد اس کے اجزاء وسیع خلا میں پھیل گئے اور آخر کار انہوں نے موجودہ کائنات کی صورت اختیار کی۔ اسی سے موجودہ تمام اجرام بنے جن میں سے ایک ہماری یہ زمین بھی ہے۔

دھماکہ (explosion) کی دو قسمیں ہیں ـــــ منصوبہ بند دھماکہ، اور منصوبہ کے بغیر خود بخود ہونے والا دھماکہ۔ تجربہ بتاتا ہے کہ دونوں قسم کے دھماکوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ بلا منصوبہ جو دھماکے ہوتے ہیں وہ صرف تخریب کا سبب بنتے ہیں۔ مثلاً کسی بم یا بم کے ذخیرے کا اپنے آپ پھٹ جانا۔ اس قسم کا دھماکہ ہمیشہ تخریبی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ دوسرا دھماکہ وہ ہے جو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت کیا جائے۔ مثلاً پہاڑ کے درمیان سے سرنگ نکالنے کے لئے منصوبہ بند طور پر چٹانوں میں دھماکہ کرنا۔ اس دوسری قسم کا دھماکہ ہمیشہ مفید اور تعمیری نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے، کائنات کے آغاز میں، سائنس کی تحقیق کے مطابق، بگ بینگ (big bang) کی صورت میں جو دھماکہ ہوا، اس سے انتہائی مفید اور بامعنٰی نتائج پیدا ہوئے۔ یہ واقعہ ثابت کرتا ہے کہ یہ دھماکہ یقینی طور پر ایک منصوبہ بند دھماکہ تھا۔ ایک منصوبہ ساز ہستی نے اپنے متعین منصوبہ کے تحت اپنے نقشہ کے مطابق، بالقصد یہ دھماکہ کیا۔ چنانچہ اس سے عین وہی بامعنٰی نتائج ظاہر ہوئے جو منصوبہ کے مطابق اس سے مطلوب تھے۔

اس جدید تشریح کے مطابق، مذکورہ آیت کے یہ الفاظ کہ کیا انکار کرنے والوں نے نہیں دیکھا (**أوَلَم یَرالذین کفروا**) نہایت بامعنٰی ہو جاتے ہیں۔ کائنات کا یہ ثابت شدہ آغاز خالص علم انسانی کی سطح پر اس حقیقت کو ثابت کر رہا ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے۔ اس نے نہایت بامعنٰی منصوبہ کے تحت اس کائنات کو بنایا ہے۔ اس حقیقت کے ثابت ہونے کے بعد یہ بات اپنے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان اور کائنات کی تخلیق بے مقصد نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ فرمایا: **ربنا ما خلقت هذا باطلاً** (آل عمران ۱۹۱)۔ اس کھلی حقیقت کے باوجود جو لوگ کائنات کی معنویت

کا انکار کریں ان کے لئے اپنے اس انکار کی کوئی بھی معقول وجہ موجود نہیں۔

ربانی تعقل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سائنس کے تمام مضامین قرآن میں موجود ہیں، یا یہ کہ ساری کی ساری سائنس خود قرآن سے اُخذ کی گئی ہے۔ اس قسم کی باتیں اسلام اور سائنس دونوں سے بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ اس قسم کی بات اصلاً قرآن کی تفسیر نہیں ہے بلکہ وہ قرآن کے حوالہ سے اپنے قومی فخر کو ثابت کرنے کی ایک بے فائدہ کوشش ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اور حیثیت نہیں۔

ربانی تعقل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے وہ بیانات جن کے بارے میں جدید سائنسی تحقیقات کے ذریعہ نئی حقیقتیں دریافت ہوئی ہیں، ان کی روشنی میں قرآن کے اشارات کو تفصیلی انداز میں بیان کرنا۔ یہ وہی چیز ہے جس کی بابت حدیث میں آیا ہے کہ: **لا تنقضی عجائبہ**۔ یعنی قرآن کے عجائب (wonders) کبھی ختم نہ ہوں گے۔ اس حدیث میں مستقبل کے بارے میں جو پیشین گوئی کی گئی ہے ان میں سے ایک یقینی طور پر یہ بھی ہے کہ بعد کے زمانہ میں دریافت ہونے والے سائنسی حقائق قرآن کی معنویت کو مزید نمایاں کریں گے۔ اس طرح قرآن کے کمالات کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

زوجین کی مثال

قرآن کی سورہ نمبر ۵۱ میں ارشاد ہوا ہے: **ومن کل شئ خلقنا زوجین لعلکم تذکرون** (الذاریات ۴۹) یعنی ہم نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا بنایا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ قرآن کی اس آیت میں موجودہ دنیا کے ایک ظاہرہ کا ذکر کرکے انسان کو متوجہ کیا گیا ہے کہ وہ اس پر سوچے اور اس سے نصیحت حاصل کرے۔ اس ظاہرہ کی طرف قرآن میں زوجین کے لفظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔

اس آیت میں زوجین کی تفسیر پچھلے مفسرین نے مختلف انداز سے کی ہے۔ ان تفسیروں میں بہر حال نصیحت کا سامان ہے۔ مگر موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں ان کا اضافہ کرتے ہوئے اس آیت کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے نیا یقین حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ آیت، قرآن کے الفاظ میں، ایمان کے ساتھ ایمان میں اضافہ (الفتح ۴) کا سبب بن جاتی ہے۔

جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ زوجین کا اصول جو انسانوں میں ہے وہی دنیا کی ہر چیز میں پایا جاتا ہے۔ ہر چیز اپنے زوج کے بغیر نامکمل ہے، وہ اسی وقت مکمل ہوتی ہے جب کہ اس کے زوج کے ساتھ اس کو شامل کیا جائے ـــ مادّی ایٹم میں منفی ذرّہ (negative particle) کے ساتھ مثبت ذرّہ (positive particle) کا ہونا۔ اسی طرح نباتات میں بھی زوجین یا نر اور مادہ کا اصول ہے۔ ان میں سے ایک کو میل فلاور (staminate flower) کہا جاتا ہے۔ اور دوسرے کو فیمیل فلاور (pistillate flower)۔ اسی طرح حیوانات میں بھی جوڑے ہیں۔ ان میں سے نر کو ہی میل (he-male) اور مادہ کو شی میل (she-male) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح انسانوں میں بھی جوڑے ہیں جن کو ہم عورت اور مرد کے نام سے جانتے ہیں۔

زوجین کے اس عمومی اصول کو لے کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس عموم میں ایک استثناء ہے، اور وہ ہماری انسانی دنیا ہے۔ انسانی دنیا اپنے سارے ہنگاموں کے باوجود ایک نامکمل دنیا ہے۔ اس کی تکمیل کے لئے اس کا ایک جوڑا (زوج) درکار ہے۔ مگر یہ جوڑا موجودہ دنیا میں ملتا ہوا نظر نہیں آتا۔

تجربہ بتاتا ہے کہ موجودہ انسانی دنیا ایک مبنی بر مفاد دنیا ہے۔ یہاں سارے انسانی تعلقات مفاد کے اصول پر قائم ہیں۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک با اصول معیاری دنیا (ideal world) چاہتا ہے۔ مگر موجودہ دنیا میں وسائل کی محدودیت اور انسان کی آزادی جیسے مختلف اسباب ہیں جو فیصلہ کن طور پر اس میں رکاوٹ ہیں کہ یہاں وہ معیاری دنیا بن سکے جو انسان اپنے فطری تقاضے کے تحت چاہتا ہے۔

اس کمی کا تقاضا ہے کہ موجودہ دنیا کا ایک جوڑا (زوج) ہو جو اس کی کمی کو پورا کر کے اس کی تکمیل کرے۔ موجودہ دنیا مبنی بر مفاد دنیا ہے۔ اب اس کا جوڑا (زوج) ایک ایسی دنیا ہے جو مبنی بر اقدار (value based) دنیا ہو۔ ایسی ایک دنیا ہی موجودہ دنیا کی کمی کی تلافی کر کے اس کی تکمیل کر سکتی ہے۔ اسی تکمیلی دنیا کا نام آخرت ہے۔ آخرت میں خدا نے جنت کی جو دنیا بنائی ہے وہ ہر قسم کی کمیوں اور محدودیتوں سے پاک ہے۔ وہ خوف اور حزن سے مکمل طور سے خالی ہے۔ وہاں وہ تمام اسباب کامل طور پر موجود ہیں

جو انسان کو یہ موقع دیں کہ وہ بھرپور آسودگی (complete fulfillment) کے ساتھ زندگی گزار سکے۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز کا جوڑا ہونا اور صرف ایک چیز کا جوڑا نہ ہونا اس بات کا قرینہ ہے کہ یقینی طور پر اس کا بھی ایک جوڑا موجود ہے۔ بقیہ چیزوں کے جوڑے کو موجودہ دکھائی دینے والی دنیا میں رکھ دیا گیا ہے مگر امتحان کی مصلحت کی بنا پر انسانی دنیا کے اس جوڑے کو نہ دکھائی دینے والی دنیا میں رکھا گیا ہے۔ مرنے کے بعد تمام انسان اسی اگلی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہاں وہ اس جوڑے کو عملی طور پر پا لیتے ہیں۔

ربانی تعقل کا موضوع ایک بے حد وسیع موضوع ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں چند مثالیں صرف موضوع کی وضاحت کے طور پر درج کی گئی ہیں۔ ربانی تعقل کے موضوع پر راقم الحروف نے اپنی دوسری کتابوں میں اس کے دیگر پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی ہے۔ وہاں اس موضوع کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔

پاکستان کے لئے انتخاب
Choice before Pakistan

دریا کا سامنا چٹان سے ہوتو وہ اپنا راستہ بدل کر آگے بڑھ جاتا ہے مگر نادان انسان چاہتا ہے کہ وہ چٹان کوتوڑ کر اپنا راستہ بنائے، خواہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ اس کا سفر ہی ہمیشہ کے لئے رک جائے۔

موجودہ حالت میں پاکستان کے لئے جو انتخاب (choice) ہے وہ جمہوری حکومت اور فوجی حکومت کے درمیان نہیں ہے بلکہ حقیقی انتخاب جن دو حالتوں کے درمیان ہے وہ یہ کہ پاکستان کا سفر جس بندگلی (impasse) پر آ کر رک گیا ہے وہاں سے وہ اپنے آپ کو نکال کر اپنا سفر دوبارہ شروع کرے یا وہ اسی بندگلی میں بدستور پڑا رہے۔ یہاں تک کہ وہ قوموں کے عالمی روڈ میپ سے غیر موجود ہو جائے۔

کسی قوم کی زندگی میں بعض اوقات ایسا لمحہ آتا ہے جب کہ قوم کا ترقیاتی سفر رک جاتا ہے۔ اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا جائے تاکہ دوبارہ قوم کا سفر معتدل انداز میں جاری ہو سکے۔ اس قسم کا نازک فیصلہ اکثر اوقات عوامی جذبات کے خلاف ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ اکثر ایسے افراد کرتے ہیں جو فوجی حکمراں کی حیثیت رکھتے ہوں۔ جمہوری حکمراں اس قسم کا جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ کیوں کہ وہ عوام کی رایوں سے چن کر حکومت تک پہنچتا ہے، اس بنا پر اس کے لئے ایسا کوئی انقلابی فیصلہ لینا ناممکن ہو جاتا ہے جو عوامی احساسات سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔

یہاں میں اس نوعیت کی دو مثالیں پیش کروں گا۔ مسلم تاریخ میں اس کی ایک مثال صلاح الدین ایوبی (وفات ۱۱۹۳ء) کی ہے۔ صلاح الدین کا یہ عظیم کارنامہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے صلیبی قوموں کی فوجی یلغار سے مسلم دنیا کو بچایا۔ مگر صلاح الدین کو یہ طاقتور حاکمانہ حیثیت کیسے ملی

جب کہ وہ اپنا یہ عظیم رول ادا کر سکے۔ جیسا کہ معلوم ہے، صلاح الدین ایوبی مصر کے سلطان نورالدین زنگی کا ایک فوجی افسر تھا۔ سلطان نورالدین کی موت کے بعد اگر چہ اس کے بیٹے موجود تھے، لیکن صلاح الدین نے حکومت پر قبضہ کر کے سلطان کا منصب حاصل کرلیا۔ مسلم مورخین نے عام طور پر صلاح الدین کے اس قبضہ کی کارروائی کو جائز قرار دیا ہے۔ کیوں کہ یہ قبضہ اگر چہ بظاہر غیر آئینی تھا لیکن اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ ایک عظیم سیاسی فائدہ کا سبب بنا۔ اسی نے صلاح الدین ایوبی کے لئے اس امر کو ممکن بنایا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے اپنا وہ عظیم کردار ادا کر سکے جو کہ اس نے اس کے بعد ادا کیا۔

دوسری مثال فرانس کے چارلس ڈیگال (وفات ۱۹۷۰) کی ہے۔ وہ فرانس کی فوج میں ایک جنرل تھا۔ اس کے بعد اس نے حالات سے فائدہ اٹھا کر فرانس کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ بظاہر یہ ایک غیر جمہوری عمل تھا مگر فرانس کی نجات کے لئے ڈیگال نے ایک ایسا کام کیا جو کوئی جمہوری حکمراں نہیں کرسکتا تھا۔

کیوں کہ جو حکمراں عوام کے ووٹوں سے منتخب ہو کر آئے وہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے کوئی جرأت مندانہ فیصلہ نہیں لے سکتا۔ جب کہ بعض حالات میں کسی قوم کی نجات کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ عوامی جذبات کو نظر انداز کر کے ایک جرأت مندانہ فیصلہ لیا جائے۔

جیسا کہ معلوم ہے، اس وقت فرانس نے افریقہ کے کئی ملکوں مثلاً الجزائر وغیرہ پر قبضہ کر رکھا تھا اور ان کو فرانس کے صوبے (provinces) کہتا تھا۔ یہ غیر حقیقت پسندانہ پالیسی فرانس کے لئے اتنی زیادہ مہلک ثابت ہوئی کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد جاری ہونے والی ترقیاتی دوڑ میں وہ یورپ کا ایک ''مرد بیمار'' بن گیا۔ ڈیگال نے قومی جذبات سے الگ ہو کر اس مسئلہ پر غور کیا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس مسئلہ کا واحد حل یہ ہے کہ افریقہ کی فرانسیسی کالونیوں کو یک طرفہ طور پر آزاد کر دیا جائے۔ یہ اقدام فرانس کے عوام کے جذبات کے سراسر خلاف تھا مگر یہی وہ غیر مقبول فیصلہ ہے جس نے فرانس کو جدید ترقیاتی دوڑ میں ایک بڑی طاقت کی حیثیت دے دی۔

پاکستان کی موجودہ صورت حال بھی عین یہی ہے۔ کشمیر کے سوال پر انڈیا کے خلاف پاکستان کی بلا اعلان جنگ (undeclared war) نے پاکستان کو اتنا زیادہ نقصان پہنچایا ہے کہ وہ اپنی تباہی کے آخری کنارہ پر پہنچ چکا ہے۔ دنیا اس کو سب سے زیادہ غیر محفوظ ملک (unsafest country) کے طور پر دیکھتی ہے۔ عالمی مالیاتی ادارے پاکستان میں سرمایہ کاری (investment) کے لئے تیار نہیں۔ پاکستانی عوام کی بے چینی (unrest) نے ملک میں خانہ جنگی (civil war) جیسی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ ملک کے مذہبی اور تعلیمی اور ثقافتی ادارے تخریبی سرگرمیوں کے مرکز بن گئے ہیں۔

ان خرابیوں کا سب سے زیادہ اندوہناک انجام وہ ہے جس کو برین ڈرین (brain drain) کہا جاتا ہے۔ انسان فطری طور پر ترقی کی دوڑ میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس لئے کسی ملک کی ترقی کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ وہاں لوگوں کو عمل کے کھلے مواقع دکھائی دیتے ہوں۔ مثلاً وہاں امن ہو، بہترین انفراسٹرکچر (infrastructure) ہو۔ آدمی کو اپنی محنت کا پورا صلہ ملتا ہوا نظر آئے۔ اگر کسی ملک میں یہ مواقع پوری طرح موجود ہوں تو اس ملک میں ہر آدمی اپنے آپ سرگرم ہو جائے گا اور ملک خود بخود ترقی کرنے لگے گا۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان میں ایسا نہ ہو سکا۔ پاکستان میں ''پہلے صورت موجودہ (statusquo) کو بدلو'' کے نظریہ کے نتیجہ میں مسلسل طور پر ہنگامی صورت حال باقی ہے۔ وہاں عملی طور پر افراد کے لئے حسب حوصلہ کام کے مواقع تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ چنانچہ بیشتر حوصلہ مند اور باصلاحیت افراد پاکستان چھوڑ کر باہر چلے گئے۔ امریکہ کے سفروں کے دوران میں نے امریکہ میں مقیم بہت سے پاکستانیوں سے پوچھا کہ آپ اپنے ملک کو چھوڑ کر یہاں کیوں آ گئے۔ تقریباً سب کا ایک ہی جواب تھا کہ امریکہ میں کام کے مواقع ہیں جب کہ پاکستان میں کام کے مواقع نہیں۔

کشمیر کے بارے میں پاکستان کی غیر حقیقت پسندانہ پالیسی پاکستان کے ترقیاتی سیلاب کے لئے ٹریپ ڈور (trap door) بنی ہوئی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پاکستان موجودہ زمانہ میں ترقیاتی دوڑ میں پچھڑ گیا ہے۔ پاکستان کو اس پچھڑے پن سے نکالنے کی صرف ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ پاکستان مسائل سے ٹکرانے کے

بجائے مواقع کو استعمال (avail) کرنے کی پالیسی اختیار کرے۔ موجودہ حالات میں اس کی عملی صورت یہ ہے کہ پاکستانی لیڈر کشمیر کے معاملہ میں صورت موجودہ (statusquo) کو علیٰ حالہ ماننے پر راضی ہو جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کشمیر میں قبضہ کی لائن (LoC) کو ضروری ایڈجسٹمنٹ کے ساتھ دونوں ملکوں کے درمیان تسلیم شدہ سرحد قرار دے دیا جائے۔ اسمعاملہ میں ہندستان اور پاکستان کے درمیان جو جغرافی اور سیاسی اسٹیٹس کو (political statusquo) بن گیا ہے اس کو مان کر اس مسئلہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ مزید یہ کہ اس طرح کا انقلابی فیصلہ صرف ایک غیر جمہوری حکمراں ہی کر سکتا ہے۔ کسی جمہوری حکمراں کے لیے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن نہیں۔

میرے نزدیک صدر پرویز مشرف کے لیے یہی تاریخی کام مقدر ہے۔ اس معاملہ میں جو لوگ صدر مشرف کے حق اقتدار پر سوال اٹھا رہے ہیں ان کا جواب سابق فوجی صدر محمد ضیاء الحق کی مثال میں موجود ہے۔ اس سے پہلے جنرل محمد ضیاء الحق نے یہی کیا تھا کہ پاکستان کے اقتدار پر فوجی قبضہ کیا۔ اور پھر خود ساختہ کارروائی کے ذریعہ اپنے صدر مملکت ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس وقت پاکستان کے اسلام پسندوں سے لے کر امریکہ کے محکمۂ خارجہ تک ہر ایک نے اس کو قبول کر لیا اور قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت اس کو جائز قرار دیا۔ یہ نظیر کافی ہے کہ صدر پرویز مشرف کو بھی اسی دلیل کے ساتھ قبول کر لیا جائے۔ یہ ایک منافقانہ کردار ہے کہ جہاں ذاتی انٹرسٹ دکھائی دے وہاں آدمی پریکٹیکل بن جائے اور جہاں ذاتی انٹرسٹ کا معاملہ نہ ہو وہاں وہ آئیڈیلزم کی بات کرنے لگے۔

پاکستان میں جنرل پرویز مشرف کا اقتدار سنبھالنا اور پھر ۲۰ جون ۲۰۰۱ کو ملک کے صدر کی حیثیت سے حلف لینا بظاہر ایک غیر آئینی واقعہ ہے مگر میرے نزدیک وہ ایک بالکل بروقت واقعہ ہے۔ موجودہ صورت حال میں پاکستان کو جو جرأت مندانہ فیصلہ لینا ہے وہ صدر پرویز مشرف جیسا فوجی حکمراں ہی لے سکتا ہے۔ انتخابات کے ذریعہ بننے والے کسی جمہوری حکمراں کے لئے ایسا غیر جذباتی فیصلہ لینا ممکن ہی نہیں۔

اس مسئلہ کا واحد علاج یہ ہے کہ پاکستان اپنی جذباتی پالیسی کو چھوڑ کر حقیقت پسندانہ پالیسی

اختیار کرے۔ وہ کشمیر کے سوال پر ہندستان سے سمجھوتہ کرلے تاکہ ملک میں امن کی فضا پیدا ہو اور ملکی ذرائع کو تعمیری سرگرمیوں کی طرف موڑا جاسکے۔

پچھلے ۵۵ سال سے پاکستان کی سیاست ایک ہی سوال پر مرتکز رہی ہے۔ اور وہ ہے ــــــ کشمیر میں قائم شدہ سیاسی حالت (political statusquo) کو بدلنا۔ اب آخری طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ یہ پالیسی ایک تباہ کن پالیسی ہے۔ وہ سرے سے کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرنے والی ہی نہیں، نہ ماضی اور حال میں اور نہ ہی مستقبل میں۔

مذکورہ قسم کا انقلابی فیصلہ لینا یقینی طور پر ایک مشکل کام ہے۔ لیکن اگر ایک بار ہمت کرکے پاکستان ایسا فیصلہ لے لے تو اس کے معجزاتی نتیجے برآمد ہوں گے۔ انڈیا کے خلاف بلا اعلان جنگ کی حالت ختم ہو کر امن قائم ہو جائے گا۔ پاکستانی قوم کی منفی سوچ مثبت سوچ میں تبدیل ہو جائے گی۔ باہمی تجارت کے دروازے کھل جائیں گے۔ تعلیم اور ثقافت اور سیاحت کے میدان میں دونوں ملکوں کے درمیان لین دین شروع ہو جائے گا۔ لٹریچر کی دوطرفہ آمد ورفت کے نتیجہ میں دونوں ملکوں کے درمیان غلط فہمیاں ختم ہو جائیں گی اور برادرانہ ماحول قائم ہو جائے گا۔ انڈیا اور پاکستان کی زبان اور کلچر بڑی حد تک ایک ہے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لئے دور کے پڑوسی (distant neighbours) بنے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد یہ ہوگا کہ دونوں قریب کے پڑوسی بن جائیں گے جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب بھی کوئی فرد یا قوم کام کرنا چاہے تو اس وقت پیشگی حالات کے نتیجہ میں ایک عملی صورت حال (statusquo) موجود رہتی ہے۔ اب سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے موجودہ صورت حال (statusquo) کو بدلا جائے تاکہ عمل کرنے کے راستے پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ موجود صورت کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے دوسرے ممکن میدانوں میں اپنا عمل جاری کرنا۔

یہ طریقہ جس کو میں مثبت اسٹیٹس کو ازم (positive statusquoism) کہتا ہوں، یہی عقل کے مطابق ہے۔ ہر دانش مند آدمی کا یہ کہنا ہے کہ جب آئیڈیل کا حصول ممکن نہ ہو تو پریکٹیکل پر راضی

ہو جاؤ۔ خود اسلام کی تعلیم بھی یہی ہے۔ چنانچہ قرآن میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ **الصلح خیر** (النساء ۱۲۸)۔ یعنی نزاعی معاملات میں سب سے زیادہ بہتر اور مفید پالیسی سمجھوتہ کی پالیسی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اختلافی مواقع پر ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ کر مصالحت کا طریقہ اختیار کرنا۔

اسٹیس کو (statusquo) کو مانتے ہوئے تعلقات کو مستقل بنیاد پر استوار کرنے کی یہ تجویز کوئی نئی نہیں۔ جواہر لال نہرو کے زمانہ میں دونوں طرف کی حکومتیں مبینہ طور پر اس تجویز پر راضی ہو چکی تھیں۔ حتی کہ شیخ محمد عبد اللہ دونوں کے بیچ میں ایک درمیانی آدمی (middleman) کے طور پر پاکستا پہنچ چکے تھے۔ مگر نہرو کی اچانک موت سے اس تاریخ ساز منصوبہ پر عمل درآمد نہ ہو سکا:

> By 1956, Nehru had publicly offered a settlement of Kashmir with Pakistan over the ceasefire line (now converted into the LoC). On May 23, 1964, Nehru asked Sheikh Abdullah to meet Ayub Khan in Rawalpindi in an effort to resolve the Kashmir imbroglio......the Pakistani leader agreed to a summit with Nehru, to be held in June 1964. This message was urgently telegraphed to Nehru on May 26. But just as Nehru's consent reached Karachi, the world also learnt that Nehru had died in his sleep. And with that a major opportunity for a peaceful solution over Kashmir was also lost. (*The Hindustan Times,* June 18, 2001)

پاکستان اگر ایسا کرے کہ کشمیر کے بارے میں صورت موجودہ (statusquo) پر رضامند ہو کر اس کو مستقل بندوبست کے طور پر قبول کر لے تو اس میں پاکستان کا یا وسیع تر معنوں میں ملت مسلمہ کا کوئی نقصان نہیں۔ کشمیر کا علاقہ پاکستان سے جدا ہونے کے بعد بھی بدستور ایک مسلم خطہ کے طور پر اپنی جگہ باقی رہے گا۔ پھر اس میں آخر نقصان کی کیا بات۔ مزید یہ کہ تجربہ بتاتا ہے کہ برصغیر ہند کے جو مسلمان انڈیا سے جڑے انہوں نے پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں سے بہت زیادہ ترقی کی۔ حتی کہ آج نہ صرف برصغیر ہند بلکہ پوری مسلم دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند تاجر ہندستان کا ایک مسلمان ہے جو بنگلور میں رہتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ پاکستان کا ہندستان سے مصالحت کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ اپنے طاقتور پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا ہے۔ اور اپنے پڑوسی سے نزاع کو ختم کرنا گویا اپنے اوپر ہر قسم کی ترقی کے دروازے کھولنا ہے۔ اپنے حریف سے نزاع کو ختم کرنا کس طرح ترقی کا زینہ بنتا ہے، اس کی ایک مثال موجودہ جاپان ہے۔ دوسری عالمی جنگ سے پہلے جاپان اور امریکہ ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ جنگ کے بعد جاپان نے امریکہ سے مکمل مصالحت کر لی۔ اس مصالحت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان عالمی نقشہ میں اقتصادی سُپر پاور بن کر ابھر آیا۔

پاکستان اپنی موجودہ پالیسی سے اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہا ہے۔ اپنی موجودہ پالیسی کی بنا پر پاکستان کو یہ کرنا پڑا کہ اس نے انڈیا سے نفرت کو اپنے لیے اتحاد کا ذریعہ بنایا۔ اس غلط پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان (بشمول مشرقی پاکستان) کے لوگ اسلام کے نام پر تو متحد نہ ہو سکے مگر انڈیا سے نفرت کے نام پر وہ مکمل طور پر متحد نظر آتے ہیں۔ اس مثال کی بنا پر دنیا کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ اسلام کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ مسلمانوں کو باہم متحد کر سکے۔ اسی ذہن کی ترجمانی دہلی کے انگریزی اخبار ہندستان ٹائمس (۱۸ جون ۲۰۰۱ء) کے ایک مضمون میں اس طرح کی گئی ہے کہ اسلام پاکستان کو متحد نہ کر سکا، مگر ہندستان دشمنی نے اس کو متحد کر دیا:

Islam does not hold Pakistan together
anymore, but anti-Indianism does.

پاکستان کی مصالحانہ پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اہل پاکستان کے اندر نیا مثبت ذہن فروغ پائے گا۔ اس کے بعد اہل پاکستان ایک نئے دور میں داخل ہو جائیں گے جب کہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد اینٹی انڈیا ذہن نہ ہو بلکہ ان کے قومی اتحاد کی بنیاد پرو اسلام (pro-Islam) ذہن ہو جائے۔ یہ فائدہ اتنا عظیم ہے کہ عجب نہیں کہ اس کے بعد پاکستان کے اوپر اللہ کی رحمت کے تمام دروازے کھل جائیں اور اس کی رحمت کا کوئی دروازہ ان کے اوپر بند نہ رہے۔

فراست مومن

پیغمبر اسلام ﷺ کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ آپ صاحب حکمت تھے اور لوگوں کو حکیمانہ روش اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کے بہت سے اقوال حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا: لاحسد الا فی اثنتین رجل آتاه الله مالا فسلطه علی هلکته فی الحق ،واخر اتاه الله حکمة فهو یقضی بها ویعلمها (فتح الباری ،بشرح صحیح البخاری ۱۲۸/۱۳)

یعنی حسد نہیں سوا دو قسم کے آدمیوں پر۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا تو وہ اس کو حق کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ اور دوسرا آدمی وہ جس کو اللہ نے حکمت دی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور کہا کہ اے اللہ اس کو حکمت عطا فرما (ضمنی النبی ﷺ الی صدره وقال الهم علمه الحکمة)فتح الباری ۱۲۶/۷

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن سے حکمت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نعم المجلس مجلس ینشر فیه الحکمة (الدارمی مقدمه) یعنی کیا ہی اچھی ہے وہ مجلس جس میں حکمت کی بات کی جائے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ لیس هدیة افضل من کلمة حکمة (الدارمی ، مقدمه) یعنی حکمت کی بات سے زیادہ افضل کوئی تحفہ نہیں۔

حکمت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بابت یہ تعلیم دی گئی کہ دوسری قوموں میں

اگر کوئی حکمت کی چیز ملے تو اس کو لینے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: الکلمة الحکمة ضالة المومن حیث وجدها فهو احق بها (الترمذی، کتاب العلم) یعنی حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے وہ جہاں اس کو پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

بعض روایت کے مطابق، حکمت اور تفقہ کی اہمیت عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ الترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد (مشکاۃ المصابیح ۱/۷۵) یعنی ایک فقیہ، شیطان کے اوپر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی حکمت کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ نبوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے آپ نے ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں حکمت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہاں اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

نزاع کے موقع پر

پیغمبر اسلام ﷺ کی عمر جب ۳۵ سال تھی اس وقت مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت بعض اسباب سے منہدم ہوگئی۔ اس کے بعد قریش کے لوگوں نے اس کی نئی تعمیر کی۔ اس دوران یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھائے اور اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر کعبہ کی دیوار میں نصب کرے۔ یہ چونکہ فضیلت کا ایک معاملہ تھا، ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ وہی اس کو اٹھا کر نصب کرے اور اس شرف کا مالک بنے۔

اس سوال پر قریش کے لوگوں میں کئی دن تک جھگڑا جاری رہا اور کوئی اتفاقی فار مولا طے نہ ہو سکا آخر کار قریش کے ایک بزرگ کی تجویز کے مطابق وہ اس پر راضی ہوئے کہ

کل صبح کو جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو، وہی اس مسئلہ کا فیصلہ کرے اور تمام لوگ اس کے فیصلہ کو مان لیں۔ اگلی صبح کو جب لوگ دوبارہ کعبہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے شخص رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہر ایک نے بیک زبان کہا: هذا الامین رضینا هذا محمد (سیرت ابن ہشام ۱/۲۱۴) یعنی یہ تو محمد الامین ہیں، ہم ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

رسول اللہ نے لوگوں سے کہا کہ ایک چادر لے آئو۔ وہ لوگ چادر لائے تو آپ نے اس کو زمین پر پھیلایا اور حجر اسود کو اٹھا کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم سب لوگ چادر کے کناروں کو پکڑو اور اس کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار کے پاس لے چلو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے حجر اسود کو چادر سے اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ عمل ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نزاعی معاملہ کو کس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو اس میں شریک کر لیا جائے۔ اس طرح کا معاملہ لوگوں کے لئے اکثر وقار کا سوال بن جاتا ہے۔ اگر حسن تدبیر سے لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا وقار محفوظ ہے تو مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

آغاز کار

پیغمبر اسلام ﷺ کو جب مکہ میں نبوت ملی تو آپ نے اپنے عمل کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے کہ اے لوگو، کہو کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے (ایها الناس قولوا لا اله الا الله تفلحوا) یعنی تم لوگ شرک کو

چھوڑدو اور ایک خدا کی پرستش کا طریقہ اختیار کرو، تم فلاح پاؤ گے۔

اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرکے اس کو توحید کے مرکز کے طور پر بنایا جاتا۔ مگر اس وقت وہ عملاً شرک وبت پرستی کا مرکز بن گیا تھا۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو مختلف راستے تھے۔ ایک یہ کہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر وہاں دوبارہ توحید کا ماحول قائم کریں اور اس کو مرکز بنا کر اپنی موحدانہ تحریک چلائیں۔

ایک صورت قولی دعوت سے آغاز کرنے کی تھی۔ اور دوسری صورت عملی اقدام سے آغاز کرنے کی۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے، آپ نے عملی اقدام سے مکمل طور پر پرہیز کیا، اور صرف قولی دعوت کے نہج پر مکہ میں اپنا پیغمبرانہ مشن جاری فرمایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت یا اسلامی تحریک کا صحیح پیغمبرانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے پر امن فکری مہم کے ذریعہ لوگوں کی سوچ اور کردار میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ ابتدائی کام جب قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد حسب حالات عملی اقدام کا آغاز کیا جائے۔

توہین کو برداشت کرنا

مشہور سیرت نگار ابن اسحٰق بتاتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام مذمم رکھا تھا۔ پھر وہ آپ کا سب وشتم کرتے تھے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے کس طرح مجھ کو قریش کی ایذا رسانی سے بچالیا۔ وہ سب وشتم کرتے ہیں اور ایک مذمم شخص کی ہجو کرتے ہیں اور میں محمد ہوں۔

وکانت قریش انما تسمی رسول الله ﷺ مذمما ثم یسبونه فکان رسول الله ﷺ یقول: "الا تعجبون لما صرف الله عنی من اذی قریش یسبون ویهجون مذمما وانا محمد" (سیرت ابن هشان ۱/ ۳۷۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا اصل نام محمد تھا جس کا مطلب ہے تعریف کیا ہوا۔ مکی دور میں جب قریش کو آپ کے ساتھ عناد پیدا ہوا تو انھیں پسند نہیں آیا کہ وہ آپؐ کو محمد (تعریف کیا ہوا) جیسے نام سے پکاریں۔ انھوں نے اپنے جذبہ عناد کی تسکین کے لئے بطور خود آپ کا نام مذمم رکھ دیا جس کے معنی ہیں مذمت کیا ہوا۔ قریش جب آپ کو برا بھلا کہتے تو وہ آپ کے لئے محمد کا لفظ استعمال نہ کرتے بلکہ وہ مذمم کا لفظ بول کر آپ کو برا بتاتے۔ حتی کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے خود آپ کے سامنے آکر کہا: مذمما عصینا (صفحہ ۳۷۹) یعنی یہ مذمم ہیں اور ہم ان کو نہیں مانتے۔

یہ بلاشبہ ایک اشتعال انگیزی تھی اور آپ کی توہین بھی۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ایک خوبصورت جواب دے کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مذمم کی سب وشتم کرتے ہیں۔ مگر ان کی سب وشتم میرے اوپر پڑنے والی نہیں کیوں کہ میرا نام محمد ہے نہ کہ مذمم۔

پیغمبر اسلام ﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں عبد اللہ بن ابی آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ اس نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر حسد کے جذبہ کے تحت وہ آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ آپ کی توہین کرنا، آپ کا سب وشتم کرنا اور آپ کے خلاف بری باتیں پھیلانا اس کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ سب سے بڑا شاتم رسول تھا۔ حضرت عمر فاروق نے رسول اللہ ﷺ سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کو قتل

کردوں۔ آپ نے فرمایا: دعه لا يتحدث الناس ان محمدا يقتل اصحابه. (فتح الباری ۸/ ۵۲۰) یعنی اس کو چھوڑ دو۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خاص اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ...... توہین کو برداشت کرلو۔ کیونکہ اگر تم نے توہین کو برداشت نہ کیا تو اس سے بھی زیادہ بڑی برائی سامنے آئے گی، اور وہ خدا کے دین کی بدنامی ہے۔

قبل از وقت اقدام نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے یہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بنی رہی۔ انھوں نے ہر طرح آپ کو ستایا۔ تاہم آپ کے دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں وہاں کے تقریباً دو سو مرد اور عورت اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ بار بار آپ سے یہ کہتے کہ ہم ظلم کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر آپ ہمیشہ انھیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق نے قریش کے مظالم کے خلاف جہاد کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: يا عمر انا قليل (سیرت ابن کثیر ۱/ ۴۴۱) یعنی اے عمر ہم تھوڑے ہیں۔

مکی دور کے آخر میں مدینہ کے تقریباً دو سو آدمی اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ظلم و زیادتی کا نشانہ بنا رہے ہیں تو انھوں نے بھی کہا کہ ہم کو ان ظالموں کے خلاف لڑنے کی اجازت دیجئے مگر ان سے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ صبر کرو کیوں کہ مجھے قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔ (اصبروا فانی لم اومر بالقتال)

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر قسم کے ظلم و زیادتی کے باوجود تقریباً ۱۵ سال تک یکطرفہ

طور پر صبر و برداشت کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کے بعد پہلی بار آپ غزوۂ بدر کے موقعہ پر اپنے اصحاب کو لیکر دشمنوں سے مقابلے کے لئے نکلے۔ یہ بھی آپ نے اس وقت کیا جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ کھلا وعدہ آگیا کہ آسمان سے فرشتے تمہاری مدد کے لئے آئیں گے۔ (الانفال ۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ یہ نہیں کہ جب بھی کوئی ظلم کرے تو فوراً اس کے خلاف کارروائی شروع کردی جائے۔ آپ کی سنت یہ ہے کہ ظلم کے باوجود صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ عملی اقدام صرف اس وقت کیا جائے جب کہ اس کا نتیجہ خیز ہونا یقینی بن گیا ہو۔

مقام نزاع سے ہٹ جانا

پیغمبر اسلام ﷺ نبوت کے بعد تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے۔ کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا مگر مکہ کی اکثریت آپ کی شدید مخالف بنی رہی۔ جب انھوں نے دیکھا کہ صرف مخالفت آپ کے مشن کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے قتل کے درپے ہوگئے۔ انھوں نے طے کیا کہ مکہ کے تمام سردار بیک وقت حملہ کرکے آپ کو قتل کردیں۔ تاکہ آپ کی تحریک توحید کا خاتمہ ہوجائے۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔ بظاہر ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر ان سے مقابلہ کریں۔ مگر آپ نے اس معاملہ کو نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا چونکہ اس وقت کے حالات میں مسلح مقابلہ غیر مفید ہوتا اس لئے آپ نے اعراض کے اصول پر عمل فرمایا اور مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ چلے گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت نزاع سے ٹکراتا نہیں ہے بلکہ نزاع کے مقام سے ہٹ جانا

ہے۔اس طرح آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بچا کر انھیں زیادہ مفید طور پر استعمال کرسکے۔

اغیار کی رعایت

اسلام میں ایک مستقل اصول وہ ہے جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔(التوبہ ۶۰) تالیف قلب کا مطلب ہے دلوں کو جوڑنا، لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا۔یہ مقصد صرف اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے۔دوسروں کے جذبات اور مفادات کا احترام کیا جائے۔تالیف کا یہ اصول اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔وہ ابدی طور پر ہر انسانی سماج میں مطلوب ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں تالیف قلب کے اس اصول پر عمل فرمایا۔مثلاً جب آپ ہجرت کرکے مدینہ آئے تو اس وقت وہاں اہل ایمان کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔اس وقت آپ نے اپنی طرف سے ایک منشور جاری فرمایا جس کو عام طور پر صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔اس میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب اور کلچر کی آزادی ہوگی۔ہر قبیلہ کے نزاعی معاملات اس کی اپنی قبائلی روایات کے تحت طے کئے جائیں گے۔عقیدہ اور کلچر کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہود کے ساتھ آپ نے خصوصی رعایت کا معاملہ فرمایا، رمضان کے روزہ کی فرضیت سے پہلے آپ بھی انھیں دنوں میں روزہ رکھتے رہے جب کہ یہود روزہ رکھتے تھے۔تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے تقریباً سترہ مہینہ تک آپ نے یہود کے قبلہ (بیت المقدس) کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔۔یہود کے قبلۂ عبادت کو اپنا قبلہ بنانا اس لئے تھا کہ آپ امید رکھتے تھے کہ اس طرح وہاں کے یہود آپ سے مانوس ہوں گے اور آپ کے قریب

آجائیں گے۔(تفسیر القرطبی ۲/۱۵۰)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ مخالفت کے جواب میں مخالفت نہ تھا۔بلکہ مخالفت کے جواب میں رعایت تھا۔آپ کی سوچ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو دبا کر انھیں اپنا تابع بنائیں۔اس کے برعکس آپ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ شفقت اور رعایت کا معاملہ کیا جائے، ان کے دل کو نرم کرکے انھیں اپنا ساتھی بنایا جائے۔

رازداری

فتح مکہ کے واقعات کے ذیل میں آیا ہے کہ مدینہ میں آپ نے سفر کے لئے تیاری کا حکم دیا۔عام مسلمان ضروری تیاری میں مصروف ہوگئے۔اس زمانے میں حضرت ابو بکر صدیق اپنی صاحبزادی عائشہ کے گھر میں آئے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہلیہ تھیں۔وہ اس وقت ضروری تیاری کر رہی تھیں۔حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی صاحبزادی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔حضرت عائشہ نے کہا کہ ہاں۔حضرت ابو بکر صدیق نے دوبارہ پوچھا کہ یہ تیاری کہاں کے سفر کے لئے ہے۔حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھ کو نہیں معلوم (واللہ ما ادری) سیرت ابن ہشام ۳/۱۴)

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ تھی کہ آپ نازک معاملات میں ہمیشہ رازداری کا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔۔یہی آپ نے فتح مکہ کی مہم میں کیا۔مدینہ سے آپ اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ نکلے مگر آپ نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔صحابہ کہتے ہیں کہ ہم چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سے راستہ سیدھا مکہ کی طرف جاتا تھا، اس وقت ہم نے جانا کہ یہ سفر مکہ کے لئے ہے۔

نازک اجتماعی معاملات میں رازداری بے حد اہم ہے اکثر اوقات کامیابی کا انحصار اس

پر ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو آپ کے منصوبہ کا پیشگی علم نہ ہو سکے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس حکمت کو نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی میں اختیار فرمایا۔

صورت موجودہ کو مان لینا

جب بھی دو آدمیوں یا دو گروہوں میں نزاع پیدا ہو تو بالآخر دونوں کے درمیان ایک عملی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ جس کو اسٹیٹس کو (Status quo) کہا جاتا ہے۔ اس اسٹیٹس کو کو بدلنے کی کوشش اکثر حالات میں بے نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ فریق ثانی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جوابی کارروائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صورت موجودہ (اسٹیٹس کو) بدستور باقی رہتی ہے۔ مزید نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس بے نتیجہ کوشش میں طرفین کے حاصل شدہ مواقع بھی بے فائدہ طور پر ضائع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے نزاعی معاملہ میں پیغمبر اسلام کی سنت یہ ہے کہ موجودہ حالت (اسٹیٹس کو) کو مان لو۔ اس اسٹیٹس کو ازم کا یہ عظیم فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کو یہ فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی قوتوں کو مزید استحکام میں لگا دیں۔ مقام نزاع سے ہٹ کر اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنائیں کہ آخر کار طاقت کا توازن بدل جائے اور کسی بڑے ٹکراؤ کے بغیر معاملہ کا فیصلہ کیا جا سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر یہی حکمت اختیار فرمائی۔ آپ مدینہ سے روانہ ہو کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے لوگ بھی چل کر وہاں آ گئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو آگے جانے نہیں دیں گے۔ اس طرح حدیبیہ کے مقام پر ایک تعطل کی حالت پیدا ہو گئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ اس تعطل کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں بلکہ آپ حدیبیہ ہی سے دوبارہ مدینہ واپس آ گئے۔

یہ گویا اپنے اور فریق ثانی کے درمیان قائم شدہ اسٹیٹس کو کو مان لینا تھا۔ اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے آپ کو مزید مستحکم کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف دو سال کے اندر آپ کے لئے مکہ میں فاتحانہ داخلہ ممکن ہو گیا۔

مشکل میں آسانی

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۸ھ میں مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف کے لئے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں عرب میں ہموار سڑکیں نہیں تھیں۔ چلتے ہوئے ایک جگہ ایک تنگ راستہ آیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ چنانچہ یہ راستہ اپنی اسی صفت کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب اس جگہ پہنچے تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے (ما اسم هذه الطريق) لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے (فقيل له الضيقة) آپ نے جواب دیا کہ نہیں، یہ ایک آسان راستہ ہے (فقال بل هي اليسرى) سیرت ابن ہشام ۴/ ۱۲۷)

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی تھے۔ یہ لوگ اگر افقی انداز میں پھیل کر چلتے تو یقیناً ان کے لئے اس راستہ سے گذرنا مشکل ہوتا، ایسی حالت میں وہ ان کے لئے تنگ بن جاتا۔ لیکن یہی لوگ اگر قطار بنا کر چلیں تو ان کے لئے راستہ سے گذرنا مشکل نہ رہے گا، اور وہ بظاہر تنگی کے باوجود ان کے لئے عملی طور پر آسان ہو جائے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے جواب میں اسی عملی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس واقعہ سے زندگی کا ایک اہم راز معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ حسب حالت تدبیر ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اس

تدبیر کو استعمال کر کے زندگی کی ہر مشکل کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔

تدبیری پسپائی

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ۸ھ میں ایک جنگ ہوئی۔ یہ شام کی سرحد پر مؤتہ کے مقام پر ہوئی اسی نسبت سے اس کو جنگ مؤتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس کے مقابلہ میں فریق ثانی کی فوجی تعداد غیر متناسب طور پر بہت زیادہ تھی۔ آخری مرحلہ میں خالد بن الولید اس کے سردار مقرر ہوئے انھوں نے لڑائی کو غیر مفید سمجھ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ تدبیری پسپائی (Tactical retreat) کے اصول پر مؤتہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گئے۔

عربوں کا مزاج لڑنے مرنے کا مزاج تھا۔ وہ اس پسپائی کی حکمت کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں کے نوجوانوں نے یافرّار کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ یعنی اے بھاگنے والو۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کو سنا تو آپ نے اس کی تردید فرمائی۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ خدا نے چاہا تو وہ اقدام کرنے والے ہیں۔ (لیسوا بالفرار ولکنهم الکرار انشاء الله تعالی) (سیرت ابن ہشام ۳/۴۳۸)

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک صحیح اقدام وہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ محض جوش اور وقار کے لئے لڑ کر مر جانا کوئی مطلوب اسلامی کام نہیں۔ اگر اہل ایمان کے مقابلے میں فریق ثانی کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو ایسی حالت میں مقابلہ کے لئے اقدام نہیں کیا جائے گا۔ حتی کہ اگر مقابلہ پیش آجائے تو تدبیری پسپائی اختیار کی جائے گی۔ تاکہ مزید تیاری کر کے اپنے آپ کو نتیجہ خیز اقدام کے قابل بنایا جاسکے۔

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ قرآن میں سب سے پہلے وہ آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہو گئے تو اس کے بعد حلال وحرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، بحوالہ فتح الباری، ۸/ ۶۵۵)

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (graduation) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہوگئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں برآمد ہوا۔

عملی حالات کی رعایت

پیغمبر اسلام ﷺ نے ذی الحجہ ۹ھ میں حج کا فریضہ ادا فرمایا۔اس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اکٹھا تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو انسانی مساوات کا اعلان کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر یہ تاریخی الفاظ فرمائے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا تعلق صرف دین اور تقوی سے ہے۔

اس خطبہ کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہوگئی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مذکورہ اعلان کے مطابق بظاہر صرف یہ ہونا چاہئے تھا کہ دین اور تقوی کی بنیاد پر خلافت کا فیصلہ کیا جائے نہ کہ نسل اور قبیلہ کی بنیاد پر۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد مدینہ کی ایک چوپال (ثقیفہ بنی ساعدہ) میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔لوگوں کا پہلا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنایا جائے جو مدینہ کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔اس وقت حضرت ابو بکر صدیق نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کی کہ الائمۃ من قریش۔یعنی خلیفہ یا امام قریش سے ہوگا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ سعد بن عبادہ چونکہ قبیلہ قریش سے نہیں ہیں اس لئے ان کو خلیفہ نہیں بنایا جاسکتا۔کسی قدر بحث کے بعد آخر کار لوگوں کا اس پر اتفاق ہوگیا کہ قبیلہ قریش ہی کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔اس کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ اول مقرر ہوئے جو کہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

بظاہر یہ ایک متضاد بات ہے۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا۔اس کے

پیچھے ایک عظیم حکمت تھی۔وہ یہ کہ خلیفہ یا حکمراں کو ایک وسیع انسانی سماج پر احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت پر راضی ہوجائیں۔یہ اطاعت رضاکارانہ ہونا چاہئے۔جبری اطاعت کے ذریعہ وہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا جو اسلامی خلافت کا مقصود ہے۔

قدیم عرب میں سیکڑوں سال کی تاریخ کے نتیجہ میں قریش کے لوگوں کو سرداری کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔عوامی نفسیات کسی ایسے شخص کی سیادت کو آسانی کے ساتھ قبول کرلیتی تھی جس کا تعلق قریش کے قبیلہ سے ہو۔اسی سماجی صورت حال کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ الائمۃ من قریش۔یہ کوئی ابدی حکم نہیں تھا۔اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کسی قوم میں جس گروہ کو قریش جیسی سیاسی حیثیت حاصل ہوجائے، وہاں اسی گروہ کے کسی فرد کو قوم کے اوپر حاکم بنایا جائے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عملیت (Pragmatism) بھی رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔انفرادی معاملہ میں ایک شخص کو ہمیشہ نظری معیار سامنے رکھنا چاہئے۔مگر اجتماعی معاملات میں بعض اوقات نظری معیار قابل عمل نہیں ہوتا، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے معاملہ میں نظری معیار کو چھوڑ کر عملی تقاضے کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔اگر ایسا نہ کیا جائے تو زندگی کا نظام ہموار طور پر نہیں چل سکتا۔

مستقبل بینی

فتح مکہ کے بعد عرب میں وہ دور آیا جس کو تاریخ میں عام الوفود کہا جاتا ہے۔عرب کے قبائل مدینہ آکر اسلام قبول کرنے لگے۔ان میں سے ایک قبیلہ ثقیف بھی تھا جو طائف سے آیا تھا۔یہ لوگ مدینہ آئے تو انھوں نے ایک انوکھی شرط پیش کردی۔انھوں نے کہا کہ

ہم اسلام تو قبول کر لیں گے لیکن ہم نہ زکوۃ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔

یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ عام لوگ اس قسم کے اسلام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے حال سے اوپر اٹھ کر مستقبل کو دیکھا۔ آپ نے اپنی بصیرت کے تحت یہ سمجھا کہ یہ لوگ جب اسلام میں داخل ہو کر مسلم معاشرہ کا جزء بن جائیں گے تو وہ اپنے آپ سب کچھ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان کی شرطوں کو مانتے ہوئے انھیں اسلام میں داخل کر لیا۔ لوگوں کے اشکال کو رفع کرنے کے لئے آپ نے فرمایا کہ جب وہ اسلام قبول کر لیں گے تو اس کے بعد وہ زکوۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (**سیتصدقون و یجاھدون اذا اسلموا**) سیرت ابن کثیر ۴/۵۶۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس اسوہ سے ایک عظیم حکمت معلوم ہوتی ہے۔ یہ حکمت ایک لفظ میں مستقبل بینی ہے۔ انسان کوئی پتھر نہیں ہے جو تاثر کو قبول نہ کرے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان کے حال پر اس کے مستقبل کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ بوقت معاملہ فوری تبدیلی پر اصرار سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اپنے آپ ایسا ہوگا کہ آدمی مستقبل میں عین وہی بن جائے گا جیسا کہ حال میں ہم دیکھنا چاہتے تھے۔

زیر طبع کتاب مطالعہ سیرت کا ایک باب (صفحات ۲۰۸)

تفکیر و تدبّر

فن تفکیر

Art of Thinking

تفکیر (thinking) انسان کے تمام اعمال میں سب سے بڑا عمل ہے۔ سچی تفکیر ایک اعلیٰ عبادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ابوالدرداء صحابی کی وفات کے بعد اُن کی اہلیہ سے پوچھا گیا کہ ابوالدرداء کا افضل عمل کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: **التفکر والاعتبار** (سوچنا اور عبرت پکڑنا)۔ اسی طرح ایک اور صحابی ابوذر کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ سے پوچھا گیا کہ ابوذر کی خاص عبادت کیا تھی۔ اُنھوں نے جواب دیا: **كان النهار أجمع خالياً يتفكر** (وہ پورے دن تنہا سوچتے رہتے تھے)۔ **حياة الصحابة، ۶۲۷/۲**۔

سوچنے کا عمل ذہن (mind) کی سطح پر ہوتا ہے، اور انسانی وجود میں سب سے بڑی چیز یہی ذہن ہے۔ سوچنے کا عمل ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ تمام بڑی بڑی باتیں سوچنے کے ذریعہ ہی دریافت ہوئی ہیں۔ سوچنا آدمی کو حیوانی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی اعلیٰ سطح تک پہنچاتا ہے۔ سوچنے کے عمل کے ذریعہ ایک چیز اور دوسری چیز کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ سوچنے کے ذریعہ مشکلات کا حل دریافت ہوتا ہے۔ سوچنے کے ذریعہ چھپی ہوئی حقیقتیں انسان کے علم میں آتی ہیں۔ سوچنے کے ذریعہ آدمی یہ معلوم کرتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے مائنس پوائنٹ کو پلس پوائنٹ میں تبدیل کر سکے۔ سوچنا آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنے عمل کی مؤثر منصوبہ بندی کرے، اور جو آدمی منصوبہ بند عمل کی صلاحیت رکھتا ہو وہ اس دنیا میں کبھی ناکام ہونے والا نہیں۔

سوچنا ہر آدمی کی پیدائشی صفت ہے۔ مگر صحیح طرزِ فکر (right thinking) صرف اُس شخص کے اندر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو شعوری طور پر اس کے لیے تیار کرے۔ صحیح طرز فکر کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنی پسند اور ناپسند سے اوپر اُٹھ کر سوچنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ وہ چیزوں کو ویسا ہی دیکھے جیسا کہ وہ ہیں، نہ کہ ویسا جیسا کہ وہ خود انھیں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ جانبدارانہ سوچ سے مکمل طور پر پاک ہو۔ وہ

سوچنے کے نتیجہ کو ہر حال میں قبول کرنے کے لیے تیار ہو، خواہ وہ اُس کے موافق ہو یا اُس کے خلاف۔

علم بغیر معرفت

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **واتقوا الله و يعلّمكم الله** (البقرہ ۲۸۲)۔ اس آیت میں علم سے مراد فہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس آدمی کے اندر اللہ کا تقویٰ ہوگا، اُس کا تقویٰ اُس کے اندر فہم دین پیدا کرے گا (تفسیر القرطبی ۴۰۶/۳)۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے اندر معلومات ہو مگر اس کے اندر حقیقی فہم دین نہ ہو، کیونکہ فہم و بصیرت کا سرچشمہ تقویٰ ہے، نہ کہ صرف معلومات۔ اسی لیے حدیث میں یہ دعا آئی ہے کہ: **اللهم إني اعوذبك من علم لا ينفع** (مسند احمد، الجزء الثانی، صفحہ ۱۶۷) یعنی اے اللہ، میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے ایک مثال لیجیے۔ موجودہ زمانہ میں پُر جوش مسلمانوں نے مختلف مقامات پر جہاد کے نام سے جو لڑائیاں چھیڑ رکھی ہیں اُن میں اُنھیں یک طرفہ طور پر تباہی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اب وہ شکست خوردہ نفسیات کے تحت خودکش بمباری (suicide bombing) کا طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر مفروضہ دشمن کے علاقوں میں داخل ہوتے ہیں اور بم دھماکہ کر کے جان بوجھ کر خود بھی ہلاک ہوتے ہیں اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی ہلاک کرتے ہیں۔ یہ واقعہ واضح طور پر خودکشی کا واقعہ ہے اور خودکشی کو اسلام میں حرام موت قرار دیا گیا ہے۔ مگر کچھ علماء نے اُس کو استشہاد (طلب شہادت) کا نام دیتے ہوئے اُس کو جائز قرار دیا ہے۔ اس سلسلہ میں دور صحابہ کے بعض واقعات سے استدلال کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ لوگ خلافت صدیقی کے ایک واقعہ کا حوالہ دیتے ہیں اور اُس کو اپنے نظریے کے حق میں ایک قطعی دلیل بتاتے ہیں۔ یہ واقعہ ایک صحابی البراء بن مالک خزرجی (وفات ۲۰ھ) کا ہے۔ اُن کا یہ واقعہ مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ کے زمانہ میں پیش آیا۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے زمانہ میں مسیلمہ کذاب اور اُس کے حامی اہل یمامہ کے ساتھ جنگ پیش آئی۔ یہ جنگ حضرت خالد کی سرداری میں ہوئی تھی۔ اس جنگ کے آخری مرحلہ میں ایسا ہوا کہ باغیوں کی یہ جماعت ایک فصیل بند باغ کے اندر داخل ہوگئی اور

اُس کے مضبوط دروازہ کو اندر سے بند کرلیا۔ اُس وقت صحابہ کی جماعت میں البراء بن مالک بھی تھے جو اپنی بہادری کے لیے مشہور تھے۔ اُنہوں نے صحابہ سے کہا کہ تم لوگ مجھ کو ایک ڈھال پر بٹھاؤ اور ڈھال کو نیزوں کے ذریعہ اوپر اٹھاؤ۔ اس طرح اٹھا کر مجھے دیوار کے اوپر تک پہنچادو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ جب وہ دیوار کے اوپر پہنچے تو وہ وہاں سے کود کر نیچے اتر گئے۔ اندر کے لوگوں نے اُن پر حملہ کیا مگر وہ مقابلہ کرتے ہوئے باغ کے دروازہ تک پہنچ گئے اور اُس کو کھولنے میں کامیاب ہوگئے۔ دروازہ کھلتے ہی صحابہ کی جماعت اندر داخل ہوگئی اور مسیلمہ کے ساتھیوں سے لڑکر انہیں مغلوب کرلیا۔

البراء بن مالک کا یہ اقدام ایک جوکھم کا اقدام تھا۔ اس میں جان کا خطرہ تھا۔ مگر البراء بن مالک کو باغی گروہ مارنے میں کامیاب نہ ہوسکا، وہ زندہ بچ کر باہر آگئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ مزید آٹھ سال تک زندہ رہے اور پھر ۲۰ھ میں اُن کی طبعی وفات ہوئی۔ (**الکامل فی التاریخ لإبن اثیر ۲/۳۶۴، البدایة والنهایة لابن کثیر ۶/ ۲۶۸، الأعلام للزرکلی ۲/۴۷**)۔

ان دونوں میں **شَتّانَ ما بینهما** (there is a great difference between the two) کا معاملہ ہے۔ البراء بن مالک نے جو کچھ کیا وہ یہ تھا کہ اُنہوں نے اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال کر ایک اقدام کیا جس میں اُن کے لیے بیک وقت دونوں امکان تھا ـــــ زندہ بچنے کا بھی اور مارے جانے کا بھی۔ اس کے برعکس موجودہ زمانہ میں اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر جو بم دھماکہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً جان بوجھ کر خودکشی کرنے کا معاملہ ہے۔ اس عمل کی تکمیل خود عامل کی موت پر منحصر ہے۔ ان دونوں کے درمیان واضح طور پر نوعی فرق پایا جاتا ہے۔ مگر اس فرق کو نہ جاننے کی وجہ سے دونوں کو ایک سمجھ لیا گیا اور ایک واقعہ جو واضح طور پر خودکشی کا فعل تھا، اُس کو شہادت کا درجہ دے دیا گیا۔

یہ معرفت کے بغیر علم کی ایک مثال ہے۔ اگر آدمی کے پاس علم (بمعنیٰ معلومات) ہو، مگر اُس کے پاس معرفت والی بصیرت نہ ہو تو وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو نہیں سمجھے گا۔ وہ ایسی بات کہے گا جو اس کے اپنے نزدیک علم پر مبنی ہوگی، حالانکہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ صرف جہالت پر مبنی ہوگی، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

معرفت کے لیے بھی علم ضروری ہے مگر صاحبِ معرفت آدمی اس قابل ہوتا ہے کہ وہ ظاہری علم سے گذر کر باطنی حقیقتوں کو دیکھے۔ وہ معلومات کا تجزیہ وتحلیل کر سکے۔ وہ سُطور (lines) کے ساتھ بین السطور (between the lines) کو پڑھے۔ وہ واقعات کو صحیح زاویۂ نظر کے ساتھ دیکھ سکے۔ ایسا ہی آدمی صاحب معرفت آدمی ہے۔ اور جو آدمی صاحب معرفت ہو اُسی کے لیے اُس کا علم نفع بخش بن سکتا ہے۔ معرفت کے بغیر علم ایک گمراہی ہے، بلکہ شاید سب سے بڑی گمراہی۔

زاویۂ نظر کا فرق

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں پیش آنے والی ایک جنگ وہ ہے جس کو غزوۂ احد کہا جاتا ہے۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو ابتداءً جیت ہوئی تھی مگر اس کے بعد اُن کی جیت شکست میں تبدیل ہوگئی۔ اس واقعہ پر قرآن میں اس طرح تبصرہ کیا گیا: اور اللہ نے تم سے اپنے وعدہ کو سچا کر دکھایا جب کہ تم اُن کو اللہ کے حکم سے قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم کمزور پڑ گئے اور تم نے کام میں جھگڑا کیا اور تم نے نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تم کو وہ چیز دکھادی جو کہ تم چاہتے تھے۔ تم میں سے بعض دنیا چاہتے تھے اور تم میں سے بعض آخرت چاہتے تھے۔ پھر اللہ نے تمہارا رُخ اُن سے پھیر دیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے اور اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ ایمان والوں کے حق میں بڑا فضل والا ہے۔ (آل عمران ۱۵۲)

یہاں یہ سوال ہے کہ اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی، وہ زخم خوردہ تھے۔ مزید یہ کہ اُحد کی جنگ تمام تر مخالفین اسلام کی زیادتیوں کے نتیجہ میں پیش آئی تھی۔ وہ مخالفین کی جانب سے سراسر یک طرفہ حملہ کا معاملہ تھا۔ اس جنگ میں مسلمان مکمل طور پر بے قصور تھے اور مخالفین مکمل طور پر باقصور۔ اس کے باوجود ایسا کیوں ہوا کہ قرآن میں مخالفین کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے صرف مسلمانوں کی اپنی کمزوریوں کی نشاندہی کا انداز اختیار کیا گیا۔

اس کا سبب زاویۂ نظر کا فرق ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں کلام کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اُس کا منطقی تجزیہ کیا جائے۔ منطقی انصاف کی روشنی میں دیکھا جائے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، کون ظالم ہے اور کون مظلوم۔ یہ طریقہ بظاہر منصفانہ معلوم ہوتا ہے مگر وہ سراسر بے فائدہ ہے۔ اس طرح کے

معاملہ میں اصل اہمیت منطقی انصاف بیان کرنے کی نہیں ہے بلکہ مسئلہ کے حل کی عملی تدبیر ڈھونڈھنے کی ہے۔ اس طرح کے معاملہ میں ہونے والے نقصان کی تلافی عملی تدبیر سے ہوسکتی ہے، نہ کہ منطقی تجزیہ سے۔

قرآن نے اُحد کی جنگ پر تبصرہ کرتے ہوئے یہی عملی طریقہ اختیار کیا ہے۔ آخرت کی عدالت میں بلاشبہہ ظالموں کو اُن کا ظلم بتایا جائے گا اور اُس پر انہیں سزا دی جائے گی۔ مگر دنیا میں اس طرح کے موقع پر کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ معاملہ کا عملی حل دریافت کیا جائے تاکہ اُس کے ذریعہ اپنی شکست کو دوبارہ فتح میں تبدیل کیا جاسکے۔

دوقسمی سوچ

سوچ کی ایک قسم وہ ہے جس کو نفسیات کی اصطلاح میں ثنائی یا دوقسمی سوچ (dichotomous thinking) کہا جاتا ہے۔ یعنی چیزوں کو بلیک اینڈ وہائٹ میں تقسیم کرکے سوچنا۔ یہ طریقہ اکثر اوقات ہلاکت کا باعث ہوتا ہے۔ آدمی کے پاس صرف دو معیار ہوتے ہیں، جب کہ وہاں تیسرا معیار بھی موجود ہوتا ہے۔ مگر آدمی اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر دو صورتوں میں بندھا رہتا ہے۔ وہ تیسری صورت سے بے خبری کی بنا پر اُس کو استعمال نہیں کر پاتا، جب کہ اسی تیسری صورت میں اس کی نجات چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ مثلاً ایک فرقہ کی طرف سے اس کا مذہبی جلوس نکلتا ہے۔ وہ نعرہ لگاتا ہوا دوسرے فرقہ کے محلّے سے گزرتا ہے۔ محلّے کے لوگ نعرہ کو اپنے خلاف سمجھ کر اُس پر مشتعل ہوجاتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں دونوں فرقوں کے درمیان ٹکراؤ ہوجاتا ہے جو جان اور مال کے بھیانک نقصان پر ختم ہوتا ہے۔

اس مثال پر غور کیجئے۔ محلّہ کے لوگ اپنے مخصوص ذہن کی بنا پر معاملہ کو صرف دو رُخ سے دیکھ پاتے ہیں۔ قابلِ اعتراض نعرہ کو گوارا کرنا یا اس کو بند کرنا۔ چونکہ نعرہ کو گوارا کرنا اُنہیں بزدلی اور بے عزتی معلوم ہوتی ہے اور نعرہ کو بند کرنا اُنہیں ایک بہادرانہ فعل نظر آتا ہے۔ اس لیے وہ نعرہ کو بند کرنے کے لیے اقدام کرتے ہیں تاکہ اپنی مطلوب پسندیدہ چیز کو حاصل کرسکیں۔ مگر نعرہ کو برداشت نہ کرنے کا نتیجہ عملاً یہ نکلتا ہے کہ اُنہیں خونی فساد کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اس تباہی کا سبب دوقسمی طرزِ فکر ہے۔ اگر محلّے والے یہ جانیں کہ اُن کے لیے ایک تیسری ممکن

صورت بھی ہے، اور وہ ہے نعرہ کو نظر انداز کرنا۔ اگر یہ لوگ اس تیسری صورت پر عمل کریں تو صرف پانچ منٹ کے بعد وہ دیکھیں گے کہ نعرہ لگانے والے اپنے راستہ پر آگے جا چکے ہیں اور اُن کے اشتعال انگیز نعرے فضا میں اس طرح گم ہو چکے ہیں جیسے کہ اُن کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

دانش مند کی پہچان

ایک مغربی رائٹر ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) نے لکھا ہے کہ ــــــ دانش مند آدمی وہ ہے جو چیزوں کی اضافی حیثیت کو جانے:

A wise man is he who knows the relative value of things.

چیزوں کی اضافی حیثیت کا مطلب سادہ طور پر یہ ہے کہ آدمی اپنے عمل کے نتیجہ کو جانے۔ عمل کے نتیجہ سے بے خبری اگر نادانی کا ثبوت ہے تو عمل کے نتیجہ سے باخبر ہونا دانش مندی کا ثبوت۔

ایک شخص کے دوست نے اُس کو دھوکہ دے کر ایک لاکھ روپیہ غصب کرلیا۔ اب اُس آدمی کے اندر انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اُس نے ارادہ کیا کہ وہ اپنے اس سابق دوست کو قتل کر ڈالے۔ اس آدمی کی ملاقات مجھ سے ہوئی تو میں نے کہا کہ انتقام لینے سے پہلے سوچ لیجیے کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔ آپ اپنے سابق دوست کو قتل کریں گے تو اُس کے بیٹے دوبارہ آپ کو قتل کریں گے۔ اس طرح دونوں خاندانوں میں دشمنی اور انتقام کا ایک سلسلہ قائم ہو جائے گا۔

میں نے کہا کہ آپ کی ایک غلطی نے آپ کے دوست کو یہ موقع دیا کہ وہ آپ کے مال پر قبضہ کرلے۔ اب آپ کے لیے صحیح بات یہ ہے کہ آپ اپنی غلطی کو مانیں اور آئندہ کے لیے اُس کی اصلاح کرلیں۔ انتقام لینا اپنی ایک غلطی کو مسلسل تباہی کی صورت دینا ہے۔ اور انتقام نہ لینا غلطی کو ابتدائی درجہ ہی میں روک دینا ہے۔ نادان آدمی صرف اپنے اقدام کو جانتا ہے اور دانش مند آدمی اسی کے ساتھ اپنے اقدام کے اضافی نتیجہ کو بھی۔

سیکنڈ چانس

ایک شخص ایک کمپنی میں مینیجر تھا۔ کمپنی کے مالک سے اس مینیجر کا جھگڑا ہو گیا۔ یہ جھگڑا بڑھتا

رہا۔ اس جھگڑے نے مینیجر کو سخت ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ وہ سوچنے لگا کہ وہ خودکشی کر لے۔ مسئلہ کو ختم کرنے کے بجائے اُس نے یہ طے کیا کہ وہ خود اپنا خاتمہ کر لے اور اس طرح وہ اس مسئلہ سے نجات حاصل کرے۔

مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے اُن سے کہا کہ آپ خودکُشی کیوں کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کے لیے زندگی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ پھر موت کا راستہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت۔ میں نے کہا کہ آپ نے بظاہر صرف فرسٹ چانس کو کھویا ہے، سیکنڈ چانس پھر بھی آپ کے لیے موجود ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ اپنی جگہ بدل لیجیے۔ آپ کسی دوسرے شہر میں چلے جایئے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی صلاحیت کی بنا پر دوسرے شہر میں اپنے لیے اچھے مواقع پا لیں گے۔ یہ مشورہ دینے کے بعد میں نے اُن کی ڈائری میں یہ الفاظ لکھے: ''باغ کا مالی کبھی باغ کے ایک پودے کو اپنی جگہ سے اُکھاڑتا ہے، صرف اس لیے تاکہ وہ اُس کو دوسری زیادہ بہتر جگہ پر نصب کرے''۔

انہوں نے میرا مشورہ مان لیا اور کمپنی سے استعفا دے کر ایک اور شہر میں چلے گئے۔ اب وہاں وہ کاروبار کر رہے ہیں۔ پہلے کے مقابلہ میں اب وہ معاشی اعتبار سے بہت زیادہ بہتر ہیں۔

ہر آدمی کی زندگی میں وہ وقت آتا ہے جب کہ وہ کسی محرومی کا تجربہ کرتا ہے۔ جو لوگ محرومی کو صرف ایک محرومی سمجھیں وہ نئی کوشش کے ذریعہ اپنے آپ کو دوبارہ کامیاب کر لیتے ہیں۔ اور جو لوگ محرومی کو مستقل ناکامی سمجھ لیں وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُن کے اندر دوبارہ کوئی نیا عمل کرنے کا حوصلہ نہیں ہوتا۔ یہ دونوں حالتیں آدمی کی اپنی سوچ پر منحصر ہیں۔ ایک قسم کی سوچ آدمی کو ناکام بنا دیتی ہے اور دوسری قسم کی سوچ اُس کو کامیابی کی طرف لے جاتی ہے۔

مشکل آسان ہوگئی

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دس ہزار سے زیادہ اصحاب کے ساتھ مکّہ سے طائف جا رہے تھے۔ درمیان میں ایک پہاڑی راستہ آیا جو بظاہر کشادہ نہ تھا۔ آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ یہ راستہ کیسا ہے۔ لوگوں نے راستہ کو اس کی حیثیت ظاہری (face value) پر لیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک تنگ راستہ

ہے۔ بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دس ہزار سے زیادہ آدمیوں کا یہ قافلہ اس تنگ راستہ سے گذر نہیں سکے گا۔

آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ ہمارے لیے ایک کشادہ راستہ ہے۔ اور پھر آپ نے یہ تدبیر بتائی کہ تم لوگ مجمع کی صورت میں اس راستے سے گذرنا چاہتے ہو اس لیے تم کو یہ راستہ تنگ دکھائی دیتا ہے۔ کیوں کہ بیک وقت پورے مجمع کو اُس سے گذارنا ہو تو وہ ہمارے لیے تنگ ہی ثابت ہوگا۔ اب تم ایسا کرو کہ آگے پیچھے ہو کر قطار بنالو۔ چنانچہ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اب وہ آسانی کے ساتھ چلتے ہوئے اس راستہ سے گذر گئے۔ مجمع کی صورت میں جو راستہ تنگ دکھائی دے رہا تھا قطار کی صورت میں وہ ایک کشادہ راستہ بن گیا۔

یہ سوچ کا فرق ہے۔ اس دنیا میں سب کچھ سوچ پر منحصر ہے۔ غلط سوچ آسان کو مشکل بنا دیتی ہے اور صحیح سوچ مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ سوچ کے اس فرق کا تعلق زندگی کے چھوٹے معاملات سے بھی ہے اور بڑے معاملات سے بھی۔ اُس کا تعلق گھریلو مسائل سے بھی ہے اور قومی اور بین اقوامی مسائل سے بھی۔

غلط سوچ کا نقصان

۱۹۳۰ میں الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا۔ علامہ اقبال اس وقت لاہور میں رہتے تھے۔ وہ الٰہ آباد آئے اور اس اجلاس کی صدارت کی۔ اقبال نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ غیر منقسم ہندستان میں مسلمان اپنی شناخت کو محفوظ نہ رکھ سکیں گے اس لیے ہندستان جب آزاد ہو تو یہاں کے مسلم اکثریتی علاقہ میں ان کا علیٰحدہ مسلم لینڈ بنایا جائے۔ یہ تجویز بعد کو پاکستان کے نام سے مسلمانوں میں مقبول ہوئی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں برصغیر ہند سے الگ ایک مسلم علاقہ پاکستان کے نام سے وجود میں آ گیا۔

علیٰحدہ مسلم خطہ کا یہ تصور دوسرے مسلم مفکرین نے بھی اختیار کر لیا۔ اور اس تصور پر مبنی بہت سی تحریکیں دنیا کے مختلف حصوں میں وجود میں آ گئیں۔ ان تحریکوں کو ایک لفظ میں پاکستانائزیشن (Pakistanization) کہا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ جس ملک میں بھی کوئی ایسا سرحدی خطہ تھا جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہاں پاکستانائزیشن کی یہ تحریک شدّت کے ساتھ ابھر آئی۔ ہر جگہ ایسے لیڈر پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی

پرجوش تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مسلمانوں میں علیٰحدگی پر مبنی جذباتی سیاست کو فروغ دیا۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر برما، فلپائن، ابی سینیا، چین، یوگوسلاویا، وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

یہ علاقائی مسلم لیڈر اپنے پاکستانائزیشن کے خیالی تصور میں دیوانگی کی حد تک پرجوش تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی تفریقی سیاست کی تحریک کو پرامن طریقہ کار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کو مسلّح جدوجہد (armed struggle) کے دائرہ کی خونیں حد تک پہنچا دیا۔ پاکستانائزیشن کی یہ پرتشدد تحریکیں ہر جگہ ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ اس نے مسلمانوں کے مسائل میں اضافہ کے سوا کچھ اور کارنامہ انجام نہیں دیا۔

پاکستانائزیشن کی یہ تباہ کن تحریک کیوں کر ساری مسلم دنیا میں مقبول ہوگئی۔ اس کا سبب اس دور کے مسلم رہنماؤں کی ایک خلاف زمانہ سوچ (anachronistic thinking) تھی۔ وہ زمانہ کی نئی تبدیلیوں کو سمجھ نہ سکے۔ ایک ایسے دور میں جب کہ ساری دنیا ایک ہوکر گلوبلائزیشن (Globalisation) کے دور میں داخل ہورہی تھی، عین اسی زمانہ میں مسلم رہنماؤں نے زمانہ سے اپنی بے خبری کے نتیجہ میں پاکستانائزیشن کی صورت میں برعکس تحریکیں چلا دیں۔ یہ تحریکیں زمانی چٹان سے ٹکرانے کے ہم معنیٰ تھیں۔ اس لئے اس قسم کی تحریکوں کا وہی منفی انجام ہوا جو اول دن سے ان کے لئے مقدر تھا۔

جدید زمانی تبدیلیوں نے پچھلے ہر دور سے زیادہ باہمی اختلاط (interaction) کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ مگر مسلم لیڈر انتہائی نادانی کے ساتھ اس کے سراسر برعکس اپنی تحریکیں چلا رہے تھے۔ تاریخی تجربات آخری طور پر ثابت کر چکے تھے کہ ترقی کا لازمی ذریعہ چیلنج اور مسابقت (competition) ہے، مگر یہ مسلم لیڈر نہایت سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں کے لیے ایک ایسی دنیا بنانے میں مشغول تھے جہاں ان کے لیے نہ چیلنج ہو اور نہ مسابقت کا ماحول۔ جدید تبدیلیوں نے ترقی کے جو اعلیٰ مواقع کھولے تھے ان سے یہ ثابت ہورہا تھا کہ وسیع مشترک عمل سے ہی بڑی ترقیاں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مگر یہ مسلم لیڈر مسلمانوں کے لیے ایسا سیاسی جزیرہ بنانے کو اپنا کارنامہ سمجھ رہے تھے جہاں وہ مشترک کثیر بین اقوامی تعاون سے محروم ہوگئے ہوں۔

جدید کمیونی کیشن نے جغرافی علٰحدگی کے تصور کو سرا سر غیر ضروری قرار دے دیا تھا۔ مگر یہ مسلم لیڈر اس تبدیلی سے بے خبر ہو کر مضحکہ خیز حد تک بے فائدہ تحریکوں میں اپنا وقت اور مال ضائع کرتے رہے۔ زمانہ نے آزادی اور جمہوریت کی صورت میں ایک عظیم امکان کھولا تھا جو شخصی حکومت کے بجائے عمومی اشتراک طاقت (power sharing) کے اصول پر قائم تھا۔ مگر ان مسلم لیڈروں نے نہ اس امکان کو سمجھا اور نہ وہ اس کو استعمال کرنے میں کامیاب ہو سکے۔

جدید تبدیلیوں نے ایک نیا موافق امکان کھولا تھا جس کو اداراتی دور (age of institutions) کہا جا سکتا ہے۔ قدیم شاہی زمانہ کے برعکس، اب حکومت صرف ایک منتظمہ (administration) کے محدود سیاسی دائرہ میں سمٹ آئی تھی۔ اس کے سوا ہزاروں نئے شعبے ایسے پیدا ہو گئے تھے جن میں ادارے (institutions) قائم کرکے حکومتی رتبہ سے بھی بڑا رتبہ حاصل کیا جا سکتا تھا، مثلاً تعلیم، اقتصادیات، میڈیا وغیرہ، وغیرہ۔ مگر یہ مسلم لیڈر شعوری طور پر اس جدید امکان سے باخبر ہی نہ تھے پھر وہ اس کو استعمال کس طرح کرتے۔

مثالوں سے استدلال

اکثر لوگ اپنی بات کو ثابت کرنے کے لیے فرضی مثال دیا کرتے ہیں۔ مگر اس قسم کا طریقہ ادب ہے، نہ کہ استدلال۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے کہ ـــــــ تمثیل کا طریقہ استدلال کا سب سے کمزور طریقہ ہے:

Analogy is the weakest form of argument.

مثلاً جن لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ ہر مذہب نجات کا ذریعہ ہے، ہر مذہب 7 ں طور پر خدا تک پہنچانے والا ہے۔ اس نظریہ کو ثابت کرنے کے لیے یہ تمثیل دی جاتی ہے کہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایک بلڈنگ ہو تو پہاڑ کے جس طرف سے بھی آدمی چڑھ کر اوپر جائے وہ آخر کار بلڈنگ تک پہنچ جائے گا۔ اسی طرح جس مذہبی طریقہ کی پیروی کی جائے وہ آخر کار آدمی کو ایک خدا تک پہنچا دے گا۔

علمی تجزیہ اس تمثیل کو بالکل غلط ثابت کرتا ہے۔ مثلا کلکتہ جانے والا ایک مسافر دہلی کے

ریلوے اسٹیشن پر ہو تو وہ دیکھے گا کہ وہاں درجنوں گاڑیاں مختلف پٹریوں پر کھڑی ہوئی ہیں۔ اب اگر وہ ایسا کرے کہ وہ مذکورہ فارمولہ پر عمل کرتے ہوئے کسی بھی گاڑی پر بیٹھ جائے تو ایسا نہیں ہوسکتا کہ وہ لازماً اُس کو کلکتہ پہنچا دے۔

u استدلال کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ ایک صورت حال میں بظاہر درست نظر آتا ہے، لیکن اگر صورت حال کو بدل دیا جائے تو اُس کا سارا استدلال بے معنیٰ ہو جائے گا۔ چنانچہ مذکورہ u استدلال پہاڑ کی چوٹی کے معاملہ میں بظاہر درست نظر آتا ہے مگر یہی u استدلال ریلوے اسٹیشن کے معاملہ کی صورت میں غیر متعلق اور بے معنیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔

چھوٹا شَر

حضرت عمر فاروق کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: **لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر ولکنہ الذی یعرف خیر الشرین**۔ (العبقریات الاسلامیہ، ۵۰۵) عقل مند وہ نہیں ہے جو یہ جانے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے، بلکہ عقل مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے کون سا شر بہتر ہے۔

حضرت عمر فاروق کے اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی آدمی کے پاس صرف دو فہرست ہو، ایک اُن چیزوں کی فہرست جو خیر ہیں، اور دوسری اُن چیزوں کی فہرست جو شر ہیں، ایسا آدمی عالم تو ہوسکتا ہے مگر وہ عاقل نہیں ہوسکتا۔ عاقل یا دانش مند ہونے کے لیے آدمی کو ایک اور چیز سے واقفیت ہونی چاہئے، اور وہ خیر الشرین ہے، یعنی دو شر میں سے بہتر شر۔ یہ جاننا کہ دو شر میں سے کون سا شَر نسبتاً کم نقصان والا ہے، یا چھوٹی برائی (lesser evil) کی حیثیت رکھتا ہے۔

مثلاً آپ کے گھر کے سامنے کچھ لوگ قابل اعتراض نعرے لگا رہے ہوں تو ایک شر اُن کی یہ نعرہ بازی ہے۔ دوسرا امکانی شر یہ ہے کہ اگر آپ اُنہیں روکیں یا اُن سے نزاع کریں تو وہ مزید مشتعل ہو کر فساد برپا کریں گے اور جان و مال کا نقصان پہنچائیں گے۔ اب عقل مند آدمی وہ ہے جو ٹھنڈے ذہن سے سوچ کر یہ سمجھے کہ دونوں قسم کے شر میں سے کون سا شر بڑا ہے اور کون سا شر چھوٹا۔ اور پھر وہ چھوٹے شر کو برداشت کر لے تا کہ اُس کو بڑا شر برداشت نہ کرنا پڑے۔

عام آدمی معاملات میں صرف دو چیزوں کو جانتا ہے ـــــــ خیر کے پہلو کو اور شر کے پہلو کو۔ مگر دانش مند آدمی وہ ہے جو شر کو دو قسموں میں تقسیم کر سکے، اور پھر دونوں میں سے جو شر مقابلۃً خیر یا بالفاظ دیگر، کم ضرر رساں ہو اُس کو گوارا کر لے تا کہ وہ زیادہ بڑے شر سے بچ سکے۔

تحمل کی طاقت

ایک شہر کے دو آدمیوں میں اَن بن تھی۔ ایک دن ایسا ہوا کہ دونوں کی ملاقات ایک سڑک پر ہوئی۔ مسٹر الف دیکھتے ہی مسٹر ب پر برس اُٹھے۔ اُن کے پاس جتنے سخت الفاظ تھے وہ سب اُنھوں نے مسٹر ب پر خرچ کر ڈالے۔ مسٹر ب خاموش ہو کر اُن کی بات سنتے رہے۔ مسٹر الف دیر تک بولنے کے بعد جب چُپ ہوئے تو مسٹر ب نے کسی ردّعمل کے بغیر بالکل نارمل انداز میں مسٹر الف سے کہا: میرا خیال ہے کہ آپ تھک گئے ہیں، آیئے ریستوراں میں چل کر چائے پئیں۔ اس کے بعد دونوں قریب کے چائے خانہ میں گئے۔ چائے پیتے پیتے مسٹر الف کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ آخر میں مسٹر الف نے مسٹر ب سے معافی مانگی اور یہ وعدہ کیا کہ آئندہ وہ کبھی کسی کے ساتھ ایسا نہیں کریں گے۔

جب کوئی شخص اشتعال انگیز بات کرے تو عام طور پر سننے والا غصہ ہو جاتا ہے۔ وہ جوابی اشتعال کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ طریقہ آگ کو آگ کے ذریعہ بجھانے کے ہم معنٰی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آگ کو پانی کے ذریعہ بجھایا جائے۔ غُصہ کا جواب ضبط وتحمل کے ذریعہ دینے کی کوشش کی جائے۔ تحمل صرف ایک اخلاقی صفت نہیں، اس سے بڑھ کر تحمل ایک طاقت ور تدبیر ہے۔ اشتعال کے جواب میں جب آپ غصہ ہو جائیں تو آپ اپنی سب سے بڑی صلاحیت، یعنی عقل کو کھو دیتے ہیں۔ آپ اس قابل نہیں رہتے کہ آپ اپنی عقل کو استعمال کر کے گہرائی کے ساتھ معاملہ کو سمجھیں اور زیادہ کارگر انداز میں اپنا دفاع کریں۔ غضب ناک آدمی صرف منفی ردّعمل کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی غصہ دلانے کے باوجود غصہ نہ ہو وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ غصہ کے جواب میں مثبت عمل کا ثبوت دے سکے، اور مثبت عمل بلاشبہہ منفی عمل کے مقابلہ میں ہزار گنا زیادہ مؤثر اور کامیاب ہے۔

ذہنی سکون

موجودہ زمانہ کا شاید سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آج کسی بھی انسان کو ذہنی سکون حاصل نہیں۔ تقریباً ہر آدمی ذہنی تناؤ اور فکری الجھن میں مبتلا ہے۔ خواہ وہ امیر ہو یا غریب، خواہ وہ سامان والا ہو یا بے سروسامان والا۔ پچھلے سال بنگلور کے ایک کمپیوٹر انجینئر کو اس کی ایک ایجاد پر امریکہ کی طرف سے 750 ملین ڈالر اچانک مل گئے۔ مگر اس غیر معمولی دولت نے اس کو ذہنی پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ یہاں تک کہ صرف ایک سال کے اندر اس کا یہ حال ہوا کہ اس کی نیند ختم ہوگئی اور رات کے وقت وہ نیند کی گولیاں کھا کر سونے لگا۔ موجودہ دنیا کے بیشتر لوگوں کا حال کم وبیش یہی ہے، خواہ وہ بڑے ہوں یا چھوٹے۔

اس مسئلہ کا عام طور پر دو حل بتایا جاتا ہے۔ ایک یہ کہ زیادہ سے زیادہ دولت کماؤ تا کہ زیادہ سے زیادہ راحت کے سامان حاصل کر سکو۔ مگر تجربہ واضح طور پر اس کی تردید کرتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے بے شمار دولت کمائی اور راحت اور آرام کے تمام سامان اپنے پاس اکٹھا کر لئے۔ مگر ان سب کے باوجود وہ سکون اور چین سے محروم رہے یہاں تک کہ وہ مر کر اس دنیا سے چلے گئے۔

اصل یہ ہے کہ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے معیار پسند (perfectionist) ہے۔ جب کہ موجودہ دنیا ہر اعتبار سے غیر معیاری (imperfect) ہے۔ اس صورت حال نے انسان اور موجودہ دنیا کے درمیان ایک تضاد پیدا کر دیا ہے۔ اسی تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ کوئی انسان ہر قسم کے دنیوی سامان کو حاصل کرنے کے باوجود مطمئن نہیں ہوتا۔ دنیا کی ہر چیز اس کو اپنے ذہنی معیار سے کم تر معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے وہ ان کو پا کر بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ بظاہر راحت کے سامان کے درمیان بھی وہ ہمیشہ ایک قسم کے غیر شعوری عدم اطمینان میں مبتلا رہتا ہے۔ فطرت کا یہ قانون ثابت کرتا ہے کہ دنیوی راحت کے سامانوں میں ذہنی سکون تلاش کرنا ایک ایسا بے سود عمل ہے جو کبھی کارآمد بننے والا ہی نہیں۔

دوسرا حل وہ ہے جو خاص طور سے یوگا کے مبلّغین کی طرف سے بتایا جاتا ہے۔ ان لوگوں نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر بہت سے میڈیٹیشن سینٹر قائم کئے ہیں۔ یہاں دھیان اور

میڈیٹیشن کے ذریعہ لوگوں کو ذہنی سکون کی تربیت دی جاتی ہے۔ اُن کا طریقہ یہ ہے کہ مخصوص مراقبہ کے ذریعہ انسانی ذہن میں سوچ کے عمل کو معطّل کر دیا جائے تاکہ وہ پریشانی کو شعوری طور پر محسوس کرنے کے قابل ہی نہ رہے۔ مگر اس قسم کا ذہنی سکون حقیقتاً ذہنی تخدیر (mental anesthesia) کے ہم معنیٰ ہے۔ یہ انسان کی اعلیٰ فکری صلاحیت کو کند کر کے اس کو بے حس حیوان کی سطح پر پہنچا دینا ہے۔ اس قسم کا ذہنی سکون، اگر بالفرض حاصل بھی ہو جائے تب بھی وہ یقینی طور پر غیر مطلوب چیز ہے۔ کیوں کہ جو چیز انسان کی اعلیٰ فکری صلاحیت کو دبا دے وہ گویا انسان کو کوما (coma) کی حالت میں پہنچانا ہے۔ ایسا ذہنی سکون انسانی موت ہے، نہ کہ انسانی زندگی۔

میڈیٹیشن (meditation) کا یہ طریقہ فطرت کے نظام کی تردید ہے۔ فطرت نے انسان کو جو سب سے اعلیٰ چیز دی ہے وہ اس کا دماغ (mind) ہے۔ فطرت کے نقشے کے مطابق، دماغ کے لئے پریشانیوں کا پیش آنا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ دراصل زحمت میں رحمت (blessing in disguise) ہے۔ فطرت نے انسان کی ذہنی ترقی کے لئے شاک ٹریٹمنٹ کا طریقہ رکھا ہے۔ ایسی حالت میں شاک ٹریٹمنٹ کے عمل کو ختم کرنا انسان کے لیے اُس کی ذہنی ترقی کے دروازہ کو بند کرنا ہے۔ اس اعتبار سے یہ طریقہ فطرت کے نظام کے خلاف ہے اور جو چیز فطرت کے نظام کے خلاف ہو وہ اپنے آپ قابل رد ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ذہنی پریشانی (mental tension) کے مسئلہ کا حل ذہنی پریشانی کو ختم کرنا نہیں ہے بلکہ اس کو مینیج (manage) کرنا ہے۔ فکری تدبیر کے ذریعہ اس کو اس طرح غیر مؤثر کر دینا ہے کہ وہ عملاً تو انسان کے لئے پیش آئے مگر وہ انسان کے ذہنی سکون کو برہم (disturb) نہ کر سکے۔

اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ دہلی میں ایک ۳۰ سالہ نوجوان ہیں جو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مینیجر ہیں۔ ان کو وہاں ۷۵ ہزار روپیہ مہینہ ملتا ہے اور دوسری سہولتیں حاصل ہیں۔ مگر چونکہ ان کمپنیوں میں ہائر اینڈ فائر کا اصول ہے، اس لئے وہ ہمیشہ ذہنی پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ کو ہمیشہ سروس سے محرومی کا اندیشہ (fear of loosing job) ستاتا رہتا ہے، نہ دن کو سکون رہتا ہے اور نہ رات کو۔ میں نے انہیں سمجھایا اور کہا کہ میں آپ کو ایک فارمولا دیتا ہوں،

اگر آپ اس کو پکڑ لیں تو آپ کا ذہنی سکون کبھی برہم ہونے والا نہیں — ایک شخص آپ کا روزگار چھین سکتا ہے مگر وہ کبھی آپ کی قسمت کو آپ سے چھین نہیں سکتا:

One can take away your job. But no one
has the power to take away your destiny.

مذکورہ نوجوان نے اس فارمولا کو پکڑ لیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ دوبارہ ملے اور انہوں نے کہا کہ اب مجھے پوری طرح ذہنی سکون حاصل ہوگیا ہے۔ اب میں اطمینان کے ساتھ سوتا ہوں اور اطمینان کے ساتھ دن گزارتا ہوں۔ اسی طرح ہر آدمی اپنی ذہنی پریشانی کو مینیج کر کے اس کو ڈیفیوز کر سکتا ہے۔ وہ ذہنی پریشانیوں کے باوجود ذہنی سکون کی زندگی حاصل کر سکتا ہے، بغیر اس کے کہ وہ اپنی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں سے محروم ہوا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کا دماغ اتھاہ صلاحیتوں کا خزانہ ہے۔ تمام ذہنی پریشانیوں کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو استعمال نہ کر سکنا۔ اسی طرح تمام ذہنی پریشانیوں کا حل بھی صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروقت استعمال کر لینا۔

ایک بڑے شہر کے ایک تاجر ہیں۔ اُنہوں نے ایک سامان (production) تیار کیا۔ اس میں انہوں نے پچاس لاکھ روپئے لگا دیئے۔ سامان جب تیار ہوا تو اس کے بعد اچانک مارکیٹ میں اس کی مانگ ختم ہوگئی۔ مجبوراً اُنہیں اپنے سامان کو گودام میں رکھ دینا پڑا۔ اس حادثہ کا اُن پر اتنا زیادہ اثر ہوا کہ وہ بیمار پڑ گئے۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ راتوں کی نیند غائب ہوگئی۔ وہ اعصابی کمزوری کا شکار ہو گئے۔

اُن سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں سمجھایا۔ میں نے کہا کہ آپ اس معاملہ کو صرف حال (present) کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ آپ اپنی اس سوچ کو بدلیے اور معاملہ کو مستقبل (future) کے اعتبار سے دیکھنا شروع کر دیجئے۔ آپ سادہ طور پر صرف اتنا کیجئے کہ اس معاملہ کو انتظار (wait and see) کے خانہ میں ڈال دیجئے۔ انہوں نے میری نصیحت پکڑ لی۔ اس کے تقریباً دو سال بعد اُن کا خط آیا جس میں انہوں نے خوشی کے ساتھ لکھا تھا کہ میرا تمام سامان نفع کے ساتھ فروخت ہو گیا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر چیز کا انحصار سوچنے کے طریقہ پر ہے۔ اگر آپ ایک طریقہ سے سوچیں

تو آپ کا ذہن ایک ڈھنگ کا بنے گا اور اگر آپ دوسرے طریقہ سے سوچیں تو آپ کا ذہن دوسرے ڈھنگ پر کام کرنے لگے گا۔ اس طرح ہر مایوسی کو اعتماد میں بدلا جا سکتا ہے اور ہر پست ہمتی کو بلند ہمتی میں۔

آئیڈیل یا پریکٹیکل

اکثر لوگ صرف اس لیے نقصان اٹھاتے ہیں کہ وہ آئیڈیل اور پریکٹیکل میں فرق نہیں کرتے۔ وہ چیزوں کو آئیڈیل کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور جب وہ اُن کے آئیڈیل پر پورا نہیں اُترتا تو وہ اُن کو رد کر دیتے ہیں۔ مگر یہ سراسر نادانی کی بات ہے۔ موجودہ دنیا میں بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو آئیڈیل ملے۔ بیشتر حالات میں اس دنیا میں پریکٹیکل پر راضی ہونا پڑتا ہے۔ یہ کوئی کم ہمتی کی بات نہیں، یہ فطرت کا قانون ہے اور اس دنیا میں فطرت کے قانون کو قبول کرنا پڑتا ہے، نہ کہ اُس سے ٹکرانا۔ یہ اصول انفرادی زندگی کے لیے بھی کارآمد ہے اور اجتماعی زندگی کے لیے بھی۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں جو نئے انقلابی تصورات دنیا میں رائج ہوئے اُن میں سے ایک وہ تھا جس کو سیکولرزم (secularism) کہا جاتا ہے۔ یہ نیا سیاسی نظریہ جب دنیا میں آیا تو موجودہ زمانہ کے اسلام پسند رہنماؤں نے اُس کو رد کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ سیکولرزم اسلام کے خلاف ہے، بلکہ وہ اسلام سے اصولی بغاوت ہے۔ اپنے اس ذہن کی بنا پر اُنہوں نے سیکولرزم کا ترجمہ لادینیت کیا۔ حالانکہ یہ ترجمہ ہرگز درست نہیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں میں ہر جگہ مغربی طرز پر تعلیم پائے ہوئے لوگ حکومت کر رہے تھے۔ وہ سیکولر نظامِ حکومت کے حامی تھے۔ اس بنا پر تمام اسلام پسندوں نے اُن کے خلاف نظری اور عملی جنگ چھیڑ دی۔ ہر مسلم ملک کے مسلمان سیکولر طبقہ اور اسلام پسند طبقہ میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے کے خلاف لڑنے لگے۔ اس بے فائدہ جنگ میں مسلمانوں کو اتنا زیادہ نقصان پہنچا جو پوری مسلم تاریخ میں شاید مسلمانوں کو نہیں پہنچا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ سیکولرزم کوئی مذہبی عقیدہ نہیں۔ سیکولرزم کا مطلب لامذہبیت نہیں بلکہ مذہب

کے بارے میں غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کرنا ہے۔ یہ ایک عملی تدبیر ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مذہبی نزاع سے بچتے ہوئے سیاسی اور اقتصادی امور میں مشترک بنیاد پر ملک کا نظام چلایا جائے۔

یہ سیکولرزم اسلام اور اہل اسلام کے حق میں انتہائی مفید تھا۔ وہ لوگوں کو یہ موقع دے رہا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے ملکوں میں 7 ں طور پر اسلام کے مقاصد کے لیے عمل کیا جا سکے۔ مدارس و مساجد کی تنظیم، تعمیری اداروں کا قیام، تعلیم و تربیت، دعوت و تبلیغ، اس قسم کے تمام شعبے مکمل طور پر اہل اسلام کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ وہ اُن کو استعمال کرکے ہر ملک میں اسلام کا ایمپائر بنا سکتے تھے۔ یہ ایمپائر اگرچہ غیر سیاسی ہوتا مگر وہ بالواسطہ انداز میں سیاسی نظام پر بھی اثر انداز ہو سکتا تھا۔

مگر موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما سیکولرزم کو آئیڈیل کے معیار پر جانچ کر اُس کے دشمن بنے رہے۔ حالانکہ اگر وہ عملی (پریکٹیکل) بنیاد پر اُس کو دیکھتے تو وہ اُس کو خدا کی ایک نعمت سمجھتے اور ایک عظیم موقع کی حیثیت سے اُس کو استعمال کرتے۔

اس معاملہ کا ایک اور اس سے بھی زیادہ بڑا نقصان ہے۔ سیکولرزم کو لا دینی اور طاغوتی نظریہ قرار دے کر اُس سے لڑنا سراسر غیر حقیقت پسندانہ تھا۔ وہ فطرت کے نظام کے خلاف تھا۔ وہ پریکٹکل بنیاد پر چلنے والی دنیا میں آئیڈیل بنیاد پر زندگی گذارنے کا غیر عملی پروگرام تھا۔ اس لیے وہ فطری طور پر ناکام ہو گیا۔ اب یہی لوگ عملاً ساری دنیا میں عین اُسی سیکولر نظام کے تحت پُرسکون زندگی گذار رہے ہیں جس کو انہوں نے اس سے پہلے غیر اسلامی قرار دے کر رد کر دیا تھا اور اس کے تحت زندگی گذارنے کو ناجائز بتایا تھا۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس سیکولرزم کو وہ اصولی طور پر اختیار نہ کر سکے تھے اُس کو اُنہوں نے منافقانہ طور پر اختیار کر لیا۔ دو عملی کی یہ روش بلاشبہہ تمام برائیوں میں سب سے زیادہ بڑی برائی ہے۔

مقصد کی حفاظت

قرآن کی سورہ نمبر ۲۲ میں ارشاد ہوا ہے: اور ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ مقرر کیا کہ وہ اس کی پیروی کرتے تھے۔ پس وہ اس معاملہ میں تم سے نزاع نہ کریں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو۔ (الحج ٦٧)

وہ تم سے نزاع نہ کریں، کا مطلب یہ ہے کہ تم اُن کو نزاع کا موقع نہ دو۔ فریقِ ثانی سے نزاع میں پڑنے کی قیمت یہ ہے کہ دعوت کا موضوع بدل جائے۔ اس کے برعکس نزاع سے اعراض کا یہ فائدہ ہے کہ دعوت کا اصل نکتہ دونوں کے درمیان زیرِ بحث رہے۔ داعی کے مفاد میں یہ ہے کہ امرِ رب دونوں فریقوں کے درمیان مکالمہ (dialogue) کا موضوع ہو، نہ کہ امرِ غیر رب۔ باہمی مکالمہ کو اصل نکتہ سے ہٹنے نہ دینا داعی کے مفاد میں ہے اس لیے داعی کو یہ قیمت دینا ہے کہ وہ یک طرفہ اعراض کے ذریعہ اس موافق صورت حال کو برقرار رکھے۔

مولانا محمد الیاس صاحب (بانی تبلیغی جماعت) اپنی تحریک کے ابتدائی زمانہ میں میوات گئے۔ ایک دیہاتی اپنے کھیت کے کنارے کھڑا ہوا تھا۔ مولانا نے اُس سے کلمہ پڑھنے کے لیے کہا۔ یہ دیہاتی اس قسم کی بات سے مانوس نہ تھا۔ وہ غصہ ہو گیا اور مولانا کو ڈھکیل دیا۔ مولانا زمین پر گر پڑے۔ اس کے بعد مولانا خاموشی کے ساتھ دوبارہ اُٹھے اور کسی بھی شکایت کے بغیر اُنہوں نے دیہاتی سے کہا کہ میں بھی کلمہ پڑھتا ہوں اور تم بھی اُس کو دہراؤ۔

مولانا محمد الیاس صاحب کی یہ مثال مذکورہ معاملہ کو اچھی طرح واضح کرتی ہے۔ مولانا الیاس صاحب اگر مذکورہ دیہاتی کی غلط روش کی شکایت کرتے تو موضوعِ گفتگو بدل جاتا۔ اُنہوں نے اُس کی اس روش کو 8نظر انداز کیا تاکہ دونوں کے درمیان صرف دین ہی موضوع بحث رہے، کوئی غیر متعلق چیز اس میں حائل نہ ہو سکے۔

اس طرح کے معاملہ میں سوچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ فریقِ ثانی کی زیادتیوں کو اہمیت دینا اور اس کے خلاف شکایت و احتجاج کرنا۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فریقِ ثانی کی زیادتی کو نظر انداز کیا جائے اور اُس کو صبر و اعراض کے خانہ میں ڈال دیا جائے۔ پہلی روش کا نقصان یہ ہے کہ دونوں فریقوں کے درمیان موضوعِ بحث بدل جاتا ہے۔ جب کہ دوسرے طریقہ کا فائدہ یہ ہے کہ موضوعِ بحث کا سلسلہ نہیں ٹوٹتا۔ اصل قابلِ بحث نکتہ ہی دونوں کے درمیان بلا انقطاع بحث کا موضوع بنا رہتا ہے۔

معاملہ برابر ہو گیا

دوسری عالمی جنگ میں امریکہ اور جاپان ایک دوسرے کے حریف تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو نقصان پہنچا رہے تھے۔ اس کا خاتمہ اس طرح ہوا کہ امریکہ نے ۱۹۴۵ء میں جاپان کے اوپر دو ایٹم بم گرا دیئے۔ اس کے نتیجہ میں جاپان کے دو صنعتی شہر تباہ ہو گئے۔ اس واقعہ نے عام جاپانیوں کو سخت غصہ کر دیا، وہ امریکہ سے انتقام کی باتیں کرنے لگے۔

یہ ایک بے حد نازک موقع تھا۔ جاپان اگر انتقام کے راستہ پر چلتا تو وہ اُس کے لیے صرف مزید تباہی کا سبب بنتا۔ مگر اُس وقت جاپان کے رہنماؤں اور دانشوروں نے ایسی باتیں کیں جنہوں نے جاپانیوں کے ذہن کو منفی رُخ سے ہٹا کر مثبت رُخ پر ڈال دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ ۱۹۴۵ میں اگر امریکہ نے ہمارے شہر (ہیروشیما اور ناگاساکی) کو تباہ کیا ہے تو ہم بھی اس سے پہلے ۱۹۴۱ء میں اُن کے بحری مرکز پرل ہاربر کو تباہ کر چکے ہیں۔ اس طرح دونوں کے درمیان معاملہ برابر ہو گیا۔ اب تم اس کو بھلا دو اور جاپان کی نئی تعمیر میں لگ جاؤ۔ اس متوازن سوچ کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان چالیس سال کے اندر پہلے سے بھی زیادہ طاقتور مُلک بن گیا۔

جب بھی دو فریقوں کے درمیان نزاع کی صورت پیدا ہوتی ہے تو ہر فریق کی سوچ یک طرفہ رُخ پر چلنے لگتی ہے۔ ہر فریق یک طرفہ طور پر صرف دوسرے فریق کی زیادتیوں کو یاد رکھتا ہے اور اُس کو بیان کرتا ہے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی سوچ غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے حصہ کی زیادتی کو بھلا کر صرف دوسرے کے حصہ کی زیادتی کو یاد رکھتے ہیں۔ سوچنے کا یہ طریقہ ہمیشہ تباہ کُن ثابت ہوتا ہے، افراد کے لیے بھی اور قوموں کے لیے بھی۔ اس غیر متوازن طرز فکر کو قرآن میں تطفیف کہا گیا ہے اور اُس پر ویل کی خبر دی گئی ہے (المطففین ۱-۶)۔ نزاعی معاملات میں غیر متوازن طرز فکر ہمیشہ تباہی کا سبب بنتا ہے، اور متوازن طرزِ فکر ہمیشہ ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔

سیاق وسباق کی اہمیت

کسی بات پر کو صحیح طور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے سیاق (context) کو سامنے رکھا

جائے۔اس معاملہ کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اگر سیاق کو بدل دیا جائے تو سارا مفہوم ہی بدل جائے گا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے ایک مثال لیجئے۔ راقم الحروف کی کتاب تذکیر القرآن پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے لکھا ہے:

''مولانا وحید الدین کے نظریات سے اختلاف الگ بات ہے۔اور مولانا کے اس نظریہ کو کہ ہندستانی مسلمان ہندستان میں بے مسائل (بے حقوق) ہو کر رہیں گے تو اُنہیں اس ملک میں امن نصیب ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔اس نظریہ کو آنے والا مؤرخ پسپائی، ہزیمت اور بزدلی کے کون سے درجہ میں رکھے گا، یہ وہی جانیں۔'' (علماء دیوبند کی تفسیری خدمات، صفحہ ۴۹)

اس تنقیدی ریمارک میں میری کوئی عبارت نقل نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ بطور خود کچھ الفاظ لکھ کر اُن کو میرا نظریہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ طریقہ سراسر غیر علمی ہے۔اس اقتباس میں میرا جو نظریہ بتایا گیا ہے وہ میرا نظریہ ہی نہیں۔ میرا کہنا یہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں داعی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اُن کے مقابلہ میں برادرانِ وطن کی حیثیت مدعو کی ہے۔یعنی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو رشتہ ہے وہ قومی حریف کا رشتہ نہیں ہے بلکہ وہ داعی اور مدعو کا رشتہ ہے۔

دو قوموں کے درمیان اگر حریف اور رقیب کا رشتہ ہو تو اسی کے مطابق اُن کے تعلقات قائم ہوں گے۔ایسی حالت میں اگر ایک قوم دوسری قوم کے خلاف اپنے دنیوی حقوق کے لیے احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائے تو وہ بالکل درست ہوگی۔ مثلاً پسماندہ طبقہ کی طرف سے اونچی ذات کے لوگوں کے خلاف یا محنت کش طبقہ کی طرف سے سرمایہ دار طبقہ کے خلاف حقوق طلبی کی مہم۔ایسے کسی گروہ کے لیے اس قسم کی مہم چلانے کا معیار اُن کے لیے صرف ملکی قانون اور ملکی دستور ہے۔اب چونکہ ملکی قانون اور ملکی دستور اس قسم کی مہم کی اجازت دیتا ہے اس لیے وہ اُن گروہوں کے لیے جائز مہم قرار پائے گی۔

مگر اہل اسلام کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ اہلِ اسلام کے لیے صرف وہ مسلک درست ہے جو قرآن وسنت کے مطابق درست ہو۔اور وہ مسلک غلط ہے جو قرآن وسنت سے غلط قرار پائے۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن وسنت کے معیار کے مطابق، اہل اسلام کی حیثیت داعی کی

ہے اور بقیہ قوموں کی حیثیت مدعو کی۔ یہ تعلق بے حد نازک ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اسلام کی حیثیت دینے والے گروہ (giver group) کی ہے اور دوسری قوموں کی حیثیت لینے والے گروہ (taker group) کی۔

داعی اور مدعو کے اس رشتہ کا تقاضہ ہے کہ اہلِ اسلام اپنے مسائل کے لیے احتجاج اور مطالبات کا طریقہ نہ اختیار کریں، کیوں کہ اس سے داعی اور مدعو کے درمیان دعوت کی معتدل فضا باقی نہیں رہتی۔ اس نازک رشتہ کا تقاضہ ہے کہ اہلِ اسلام اپنے مسائل کو خود اپنی کوشش سے حل کریں۔

اس وضاحت سے اندازہ ہوتا ہے کہ راقم الحروف نے جو بات دعوت کے سیاق میں کہی تھی اُس کو اُس کے سیاق سے ہٹا کر دوسرے غیر متعلق سیاق سے جوڑ دیا گیا۔ اس طرح کلام کا اصل منشاء بالکل بدل کر رہ گیا۔

حافظہ کا مسئلہ

ایک صاحب ہیں جو اپنے ماضی کی بعض تلخ یادوں کی وجہ سے سخت پریشان رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی وجہ سے اُن کی صحت خراب ہوگئی ہے۔ اُن کے سامنے میں نے ایک اُردو شاعر کا ایک شعر پڑھا۔ وہ شعر یہ تھا:

یاد ماضی عذاب ہے یارب　　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

انہوں نے اس شعر کو سنتے ہی کہا کہ بہت خوبصورت شعر ہے۔ اُن کا تبصرہ سن کر میں نے کہا کہ میرے نزدیک تو یہ بہت بدصورت شعر ہے۔ پھر میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ حافظہ ایک عظیم نعمت ہے۔ حافظہ ہی کی وجہ سے ہم چیزوں کو جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ اگر یہ دعاء قبول ہوجائے اور آدمی کا حافظہ ختم ہوجائے تو وہ بظاہر ایک انسان ہوگا مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ بھیڑ بکری سے بھی بدتر ہوجائے گا۔ میں کئی ایسے آدمیوں کو جانتا ہوں جن کا حافظہ بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے ختم ہوگیا تھا۔ اُن کا حال یہ ہوا کہ وہ نہ کچھ بول سکتے تھے اور نہ کسی کو پہچانتے تھے۔ وہ بے بسی کی حالت میں چند سال اسی طرح زندہ رہے اور پھر مر گئے۔

اس معاملہ میں سوچنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی حافظہ کو ختم کرنے کے بجائے حافظہ کی ناخوش گوار باتوں کو خوش گوار بنانے کی کوشش کرے۔ وہ اُن کا تجزیہ کر کے انھیں اپنے لیے غیر مؤثر بنادے۔

مثلاً ایک شخص کے اوپر کسی آدمی کا قرض ہے۔ وہ قرض نہیں دے پارہا ہے اور اس بنا پر وہ غم میں گھل رہا ہے۔ ایسے آدمی کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ قرض اور قرض کے غم کو ایک دوسرے سے الگ کر دے۔ وہ قرض کی ادا 5 کی تدبیر کرے مگر وہ قرض کو اپنا غم نہ بنائے۔ وہ اپنے آپ کو اس سے بچائے کہ قرض کے مسئلہ کے ساتھ ایک اور مسئلہ اُس کی زندگی میں شامل ہو جائے اور وہ ذہنی ٹینشن (mental tension) ہے۔ جب کہ ٹینشن کا مسئلہ بلاشبہہ قرض کے مسئلہ سے زیادہ شدید ہے۔ قرض کا مسئلہ اگر صرف مسئلہ ہے تو ٹینشن ایک قسم کی ذہنی خودکشی۔ کامیاب زندگی کا راز یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس نادانی سے بچائے کہ وہ ایک چھوٹے مسئلہ کو اپنے لیے زیادہ بڑا مسئلہ بنالے۔

قناعت، ترقی

اکثر خبریں آتی ہیں کہ فلاں بڑی کمپنی دیوالیہ ہوگئی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بڑی بڑی کمپنیاں دیوالیہ پن (Bankruptcy) کا شکار ہوجاتی ہیں۔ اس کا سبب صرف ایک ہے، اور وہ ہے اپنی طاقت سے زیادہ بڑی چھلانگ لگانا۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک کمپنی کے پاس ذاتی سرمایہ صرف چند ملین ڈالر ہے۔ مگر وہ ایک ایسے صنعتی کاروبار کا منصوبہ بناتی ہے جس کو قائم کرنے کے لیے کئی بلین ڈالر درکار ہیں۔ اب وہ بینک سے سودی قرض لیتی ہے۔ یہ قرض سود کے ساتھ قسطوں میں ادا کیا جاتا ہے۔ اب اگر کمپنی کی آمدنی حسب اندازہ جاری رہے تو قرض کی قسطیں بھی ادا ہوتی رہیں گی۔ لیکن اگر کسی وجہ سے آمدنی میں خلل پڑ جائے تو کمپنی اس قابل نہ رہے گی کہ وہ قرض کی قسطوں کو ادا کر سکے۔ اسی توازن کے ٹوٹنے کا نام دیوالیہ پن ہے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو ہر مادّہ پرست انسان کو کسی نہ کسی صورت میں پیش آتا ہے۔

یہ مسئلہ کیوں پیدا ہوتا ہے۔ اس کا ایک نہایت گہرا سبب ہے۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر زیادہ کی طلب رکھتا ہے۔ اپنی طلب میں کسی حد پر رکنا انسانی مزاج کے خلاف ہے۔ یہی وہ فطری مزاج ہے جو

مذکورہ مسئلہ پیدا کرتا ہے۔ مادّی طرز فکر میں اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ جو آدمی مادّی کامیابی کی اصطلاحوں میں سوچتا ہو وہ کبھی اس کمزوری سے بچ نہیں سکتا۔ اُس سے یہ کہنا کہ تم ایک مادّی حد پر رُک جاؤ، اُس کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ قابل عمل بھی نہیں۔

اس معاملہ میں قابلِ عمل فارمولہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے آخرت پسندانہ سوچ۔ آخرت پسندی کے مطابق، اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ آدمی دنیا میں بقدر ضرورت پر راضی ہو جائے اور آخرت میں بقدرِ شوق کا طلب گار رہو۔ یعنی دنیا میں ضرورت کو کافی سمجھنا، اور زیادہ کی طلب کا رُخ آخرت کی طرف کر دینا۔ مختصر الفاظ میں، اس کا فارمولا یہ ہے — دنیا میں محدود پر راضی ہونا اور لامحدود کو آخرت میں چاہنا۔

یک طرفہ ایڈجسٹمنٹ

جب بھی دو آدمیوں یا دو گروہوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو ہر فریق کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ دوسرے فریق سے اپنی بات منوائے، وہ دوسرے فریق سے اپنے مزعومہ حق کو وصول کرے۔ مگر یہ طریقہ سراسر غیر فطری ہے۔ اس طریقہ کا واحد انجام یہ ہے کہ وقتی مسئلہ ایک لامتناہی مسئلہ بن جائے۔ مزید یہ کہ اصل مسئلہ تو ختم نہ ہو اور نئے مسئلے پیدا ہو کر معاملہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیں۔

نزاعی مسئلہ کا کامیاب حل صرف ایک ہے۔ اور وہ یک طرفہ مفاہمت (unilateral adjustment) ہے۔ دونوں میں سے جو فریق پہلے یک طرفہ مفاہمت پر راضی ہو جائے وہی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے۔ اور جو فریق راضی نہ ہو اُس کو ہمیشہ یہ قیمت دینی پڑتی ہے کہ وہ معاملہ کے اُس خاتمہ پر ذلّت کے ساتھ راضی ہو جس پر ابتدائی مرحلہ میں عزّت کے ساتھ سمجھوتہ ہو سکتا تھا مگر اُس وقت اُس نے سمجھوتہ نہیں کیا۔

قرآن میں اس اُصول کو دو لفظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: **والصلح خير** (النساء ۱۲۸) یعنی صلح بہتر ہے:

Reconciliation is the best.

قرآن میں یہ آیت ازدواجی نزاع کے ذیل میں آئی ہے۔ مگر یہ ایک عمومی اُصول ہے، اور اس کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

صلح(reconciliation) کا اُلٹا لفظ جنگ ہے۔ جنگ کی نفسیات یہ ہے کہ ہر آدمی دوسرے کو زیر کرکے اپنا حق وصول کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس صُلح کا طریقہ دو اور لو(give and take) کے اُصول پر قائم ہے۔ اس دوسرے طریقہ میں ہر فریق یہ کوشش کرتا ہے کہ ٹکراؤ کی نوبت نہ آئے اور پُرامن بات چیت کے ذریعہ دوطرفہ رضامندی سے مسئلہ حل ہوجائے۔

جنگ کے طریقہ میں ہر فریق کی نظر موجود پر ہوتی ہے۔ یعنی جو چیز سامنے موجود ہے اُس پر قبضہ کرنا۔ جو لوگ جنگ کی نفسیات کا شکار ہوں وہ موجود پر قبضہ کو جیت اور موجود کے کھونے کو ہار سمجھتے ہیں۔ مگر صُلح کی نفسیات والا انسان حال کے بجائے مستقبل کو دیکھتا ہے۔ اُس کی بصیرت اُس کو یہ بتاتی ہے کہ جو کچھ بروقت سامنے نظر آتا ہے، اُس سے بہت زیادہ وہ ہے جو اگرچہ بروقت نظر نہیں آتا مگر دانش مندانہ عمل کے ذریعہ اُس کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جنگ پسند آدمی کی نظر حال میں اٹکی ہوئی ہوتی ہے اور صُلح پسند آدمی کی نظر مستقبل کی طرف متوجہ رہتی ہے۔ یہی مستقبل بینی تمام بڑی بڑی کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

مشکل میں آسانی

قرآن کی سورہ نمبر ۹۴ میں فطرت کے ایک عا K اُصول کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

فإن مع العسر یُسراً ، إن مع العسر یُسرا (الانشراح ۵۔۶) یعنی بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے:

With every hardship there is ease,
with every hardship there is ease.

اس قرآنی آیت میں ایک ایسی سوچ کی تعلیم دی گئی ہے جس کو برتر انداز فکر (high thinking) کہا جاسکتا ہے۔ یعنی مشکلات سے اوپر اُٹھ کر سوچنا۔ اس کا مقصد آدمی کے اندر ایک ایسے طرزِ فکر کو پیدا کرنا ہے جو دشواریوں میں گھر کر نہ رہ جائے بلکہ دشواریوں سے باہر آکر سوچے۔ جو آدمی اس برتر سوچ کا ثبوت دے وہ بہت جلد دریافت کرے گا کہ جہاں بظاہر صرف مسائل دکھائی دے رہے تھے وہاں ایسے مواقع بھی موجود تھے جن سے نہ صرف مسائل کو حل

کیا جائے بلکہ اپنی ناکامی کو دوبارہ کامیابی میں بدل لیا جائے۔

اس معاملہ کی بہت سی مثالیں ماضی اور حال میں موجود ہیں۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ تیرہویں صدی عیسوی میں وسط ایشیا کے وحشی قبائل جن کو منگول کہا جاتا ہے، اپنی کوہستانی بستیوں سے نکلے اور عباسی سلطنت کو ختم کرکے سمرقند سے حلب تک تمام مسلم شہروں میں چھا گئے۔ اس واقعہ کو مؤرخ ابن اثیر نے ایک ایسی آفت بتایا ہے جو تاریخ میں کبھی پیش نہیں آئی اور نہ شاید دوبارہ پیش آئے۔

گویا اپنے ظاہر کے اعتبار سے یہ ایک عظیم عُسر (بہت بڑی مشکل) کا معاملہ تھا۔ مگر اس مشکل میں ایک آسان پہلو نکل آیا۔ وہ یہ کہ اس فوجی دراندازی کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ مدعو خود داعی کی آبادیوں میں داخل ہوگیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ روزانہ مختلف صورتوں میں داعی اور مدعو کے درمیان اختلاط (enteraction) اور بحث و گفتگو (dialogue) ہونے لگا۔ یہ جنگ ابتداء میں قتل وخون دکھائی دیتی تھی مگر بعد کے مرحلہ میں وہ اسلام کو موضوع بحث بنانے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ اس طرح ایک فطری نتیجہ کے طور پر مسلمانوں کی طرف سے منگولوں کے اوپر اسلامی دعوت کا عمل (process) جاری ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پچاس سال کے اندر منگولوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی— منگولوں کے ساتھ اس جنگ میں بظاہر مسلمان ہارے تھے مگر عین اُسی وقت اسلام نے شاندار کامیابی حاصل کرلی۔

اسی تاریخی حقیقت کو ایک مغربی مؤرخ نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے— مسلمانوں کے مذہب نے وہاں کامیابی حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہوچکے تھے:

The religion of Muslims have conqured where their arms had failed.

تعمیم کی غلطی

سوچ کی غلطی کی ایک صورت وہ ہے جس کو تعمیم (genralisation) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک استثنائی مثال کو لے کر اُس کو عمومی شکل دینا اور اُس سے کُلّی رائے بنانا۔ تعمیم کی غلطی اتنی زیادہ عام ہے کہ بہت کم لوگ اس سے بچے ہوئے نظر آئیں گے۔

مثلاً بائبل (نیا عہد نامہ) میں ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا: یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صُلح کرانے آیا ہوں۔ صُلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں:

"Donot think that I came to bring peace on earth. I did not come to bring peace but a sword." (Matthew, 10:29)

حضرت مسیح کا یہ قول اُن کے پورے کلام میں ایک استثناء کی حیثیت رکھتا ہے۔ اُن کے زیادہ تر اقوال محبت اور اخلاق جیسی تعلیمات پر مبنی ہیں۔ ایسی حالت میں مذکورہ قول کو لے کر یہ کہنا کہ حضرت مسیح کا مشن تلوار چلوانا تھا، ایک استثناء کو عموم کا درجہ دینا ہوگا۔ یہ ایک غلط تعمیم ہوگی جو علمی اعتبار سے قابلِ قبول نہیں۔

اسی قسم کی غلط تعمیم قرآن کے بارے میں بھی کی گئی ہے۔ قرآن سے قتال کی بعض آیتوں کو لے کر کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن جنگ وقتال کی کتاب ہے۔ حالانکہ یہ ایک کھلی ہوئی غلط تعمیم ہے۔ قرآن کی ننانوے فیصد سے زیادہ آیتیں وہ ہیں جو امن اور انسانیت جیسے مثبت موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک فیصد سے بھی کم آیتیں وہ ہیں جو کھُلی ہوئی جارحیت کی صورت میں دفاع کے احکام بتاتی ہیں۔ ایسی حالت میں چند آیتوں کو لے کر یہ کہنا کہ یہی قرآن کی عمومی تعلیم ہے، سراسر غلط ہے اور علمی اعتبار سے نا قابلِ قبول ہے۔

تعمیم کی یہ فکری بُرائی ہمارے معاشرہ میں بہت زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ لوگوں کا عام مزاج یہ ہے کہ جس آدمی سے وہ خوش ہوں گے اُس کی کچھ خوبیوں کو لے کر اُس کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کریں گے۔ وہ انھی چند خوبیوں کی بنیاد پر اپنے محبوب کی مکمل تصویر بنائیں گے۔ اس کے برعکس، جس آدمی سے وہ ناخوش ہوں اُس کی خوبیوں کو وہ نظر انداز کریں گے۔ وہ ڈھونڈ کر اُس کی کچھ برائیاں نکالیں گے اور ان برائیوں کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کر کے یہ تأثر دیں گے کہ یہی اُن کے مبغوض آدمی کی مکمل تصویر ہے۔

تعمیم کی یہ دونوں ہی صورتیں سراسر غلط ہیں۔ یہ طریقہ غیر علمی بھی ہے اور اخلاق اور انصاف کے خلاف بھی۔ جس معاشرہ میں تعمیم کا یہ طریقہ رائج ہو جائے وہاں ہر آدمی کی تصویر مصنوعی بن جائے گی۔ لوگ ایک دوسرے کے بارے میں ایسی رائیں قائم کریں گے جن کا حقیقتِ واقعہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

راقم الحروف کو بھی اپنے دعوتی مشن میں اس قسم کی غلط تعمیم کا تجربہ ہوا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ میرے بارے میں یہ مشہور کرتے ہیں کہ اُن کو تو بس ایک بات اسلام میں ملی ہے، صلح حدیبیہ۔ حالانکہ یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ میری دو سو سے زیادہ کتابیں ہیں اور ہزاروں سے زیادہ مقالات و مضامین چھپ چکے ہیں۔ کوئی شخص ان میں دیکھ سکتا ہے کہ میری ان تحریروں میں صلح حدیبیہ کی بات ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ اسلام کی دوسری تعلیمات اور وقت کے مسائل کا اسلامی جواب جیسے مضامین سے میری تحریریں بھری ہوئی ہیں۔ مگر خودساختہ تعمیم کے ذریعہ یہ غلط تأثر دیا جاتا ہے کہ مجھے تو سارے قرآن وحدیث میں صرف ایک چیز ملی ہے، صلح۔ جو لوگ ایسا کہتے ہیں اُن کا معاملہ بلاشبہہ غیر علمی بھی ہے اور دیانت کے خلاف بھی۔

سبق لینا، نہ کہ سبق سکھانا

۱۹۴۷ سے ۱۹۷۱ تک بنگلہ دیش کا نام مشرقی پاکستان تھا۔ اس وقت وہ پاکستان کا مشرقی حصہ تھا۔ ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کے لوگوں نے پاکستان کے خلاف مسلح بغاوت کر دی۔ اس جنگ میں انڈیا نے بنگلہ دیشیوں کا ساتھ دیا۔ اس طرح انڈیا کی فوجی مدد کے ذریعہ مشرقی پاکستان الگ ہو کر بنگلہ دیش کے نام سے ایک مستقل ملک بن گیا۔ اس واقعہ کے بعد پاکستان کے لیڈروں نے کہا کہ ہم انڈیا سے انتقام لیں گے۔ وہ انڈیا پر براہ راست حملہ نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کشمیر اور پنجاب میں اپنی خفیہ مدد کے ذریعہ پراکسی وار چھیڑ دی۔ یہ پراکسی وار صرف پاکستان کی مزید تباہی کا ذریعہ بنی۔

اس معاملہ میں پاکستان کے لیے سبق سکھانے کی پالیسی درست نہ تھی۔ اُس کے لیے زیادہ صحیح پالیسی سبق لینے کی تھی۔ پاکستان کو ۱۹۷۱ کے واقعہ سے یہ سبق لینا چاہئے تھا کہ بنگلہ دیش کا نام مشرقی پاکستان رکھ کر اس کو ایک ملک کی حیثیت سے پاکستان کا حصہ قرار دینا ایک غیر حقیقت پسندانہ سیاست تھی جو عملاً چلنے والی نہ تھی۔ ۱۹۷۱ میں بنگلہ دیش کی علیحدگی اپنی حقیقت کے اعتبار سے انڈیا کی مداخلت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ وہ ایک غیر حقیقت پسندانہ سیاست کا فطری انجام تھا جو اپنے وقت پر پیش

آیا۔مگر پاکستانی لیڈروں کے ذہن میں سبق سکھانے کا تصور اتنا زیادہ چھایا ہوا تھا کہ اس واقعہ سے وہ اصل مطلوب سبق نہ لے سکے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی وہ بار بار نہایت سنگین قسم کی غیر حقیقت پسندانہ سیاست میں مبتلا ہوئے اور اس کے بھیانک انجام سے دوچار ہوتے رہے۔ اس کی ایک مثال پاکستان میں جنگجوؤں کی پرورش ہے جو انہوں نے ''عظیم تر پاکستان'' کے خیالی تصور کو واقعہ بنانے کے لئے کی۔ اگرچہ اس کا بھی فطری انجام یہی ہوا کہ پاکستان ہر اعتبار سے ایک دیوالیہ ملک بن کر رہ گیا۔

عملی طریقہ

ایک مسلمان طالب علم سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے سر کے بال منڈے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران اُنہوں نے بتایا کہ وہ جس مدرسے میں پڑھتے ہیں اُن کے ناظم نے اُن کے اور دوسرے طالب علموں کے سر کے بال منڈوا دیئے ہیں۔ ناظم صاحب نے وجہ یہ بتائی کہ مجھ کو بڑے بڑے بال اچھے نہیں لگتے۔ میں نے پوچھا کہ جن طلبہ کے سر کے بال منڈوائے گئے اُنہوں نے کچھ احتجاج، وغیرہ کیا۔ مذکورہ طالب علم نے بتایا کہ نہیں۔ طلبہ نے اس کو بہت زیادہ برا مانا لیکن وہ اس پر خاموش رہے۔ اس لیے کہ اگر وہ احتجاج کرتے تو مدرسہ سے ان کا اخراج کر دیا جاتا۔

اصولی اعتبار سے دیکھا جائے تو ناظم صاحب کا طلبہ کے سر کے بال منڈوانا طلبہ کے لیے ایک اشتعال انگیز واقعہ تھا۔ مگر ان طلبہ نے ایسا نہیں کیا کہ وہ بال منڈوانے کے معاملہ کو اُصولی اور نظری معیار پر جانچیں۔ بلکہ وہ سب اس معاملہ میں عملی (پریکٹیکل) بن گئے۔ ایک معاملہ جو نظری بنیاد پر قابل قبول نہ تھا اُس کو انہوں نے عملی بنیاد پر قبول کر لیا۔

غور کیجیے تو ہر آدمی اپنی ذاتی زندگی میں یہی کرتا ہے۔ وہ معاملہ کے نظری پہلو پر اصرار نہ کرتے ہوئے بھی عملی بنیاد پر اُس کو ماننے کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ مگر انہی افراد کا حال یہ ہے کہ جب معاملہ قومی اور ملّی ہو تو وہ فوراً اُس کو نظری اور اُصولی اعتبار سے جانچنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ عملی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے مسئلہ کو ختم کر دیں۔

لوگوں میں یہ تضاد کیوں ہے کہ وہ اپنے انفرادی معاملہ میں حقیقت پسند ہوتے ہیں اور جب ملّت کا معاملہ ہوتو وہ غیر حقیقت پسند بن جاتے ہیں۔ اس کا سبب لوگوں میں ذہنی بیداری کا نہ ہونا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ذاتی معاملہ میں آدمی اُس کے نفع اور نقصان کو خود بھگت رہا ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی سوچ کے بغیر صرف ذاتی تجربہ کی بنیاد پر صحیح رائے تک پہنچ جاتا ہے۔ ذاتی معاملہ میں رائے قائم کرنے کے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذاتی تجربہ کی تلخی اور شیرینی اُس کا رویہ متعین کرنے کے لیے کافی ہو جاتی ہے۔ یہ عین وہی معاملہ ہے جو ہر حیوان کے ساتھ پیش آتا ہے۔ ہر حیوان اپنے ذاتی معاملہ میں جان لیتا ہے کہ اُسے کیا کرنا چاہئے۔ مگر دوسرے کے معاملہ میں وہ اُس کو جان نہیں پاتا۔ کیوں کہ دوسرے کے معاملہ کو جاننے کے لیے فہم درکار ہے جو کہ حیوان میں نہیں ہوتی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اُن کے درمیان کوئی ایسی تحریک نہیں اُٹھی جو اُن کے اندر ذہنی بیداری پیدا کرے۔ جو فن تفکیر (art of thinking) کے اصولوں کی روشنی میں اُن کی ذہنی تربیت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کی مسلم نسلیں فکری ارتقاء سے محروم ہیں۔ لوگ بس حیوانی سطح پر جی رہے ہیں، ذہنی ارتقاء یا فکری عمل (thinking process) کی اُنہیں خبر ہی نہیں۔

اقدام نتیجہ خیز ہونا چاہئے

بنی اسرائیل کے اندر پیش آنے والے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے زمانہ میں پیش آیا۔ قرآن کے مطابق، ایسا ہوا کہ حضرت موسیٰ اپنی قوم کے اوپر حضرت ہارون کو ذمہ دار بنا کر کچھ دنوں کے لئے کوہ طور پر چلے گئے۔ اس دوران بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پوجا شروع کردی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہارون نے انہیں روکا مگر قوم کی طرف سے شدت دیکھ کر وہ اس معاملہ میں خاموش ہوگئے۔ مگر جب حضرت موسیٰ واپس آئے تو انہوں نے اس مصنوعی بچھڑے کو توڑ کر پھینک دیا اور مجرمین کو سزادی (الاعراف، طٰہٰ)

یہاں یہ سوچنے کی بات ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون کے عمل میں یہ فرق کیوں تھا۔ کیا وجہ ہے کہ حضرت ہارون نے کھلے ہوئے شرک کے ایک معاملہ کو عملاً برداشت کیا جب کہ حضرت موسیٰ نے اس کو توڑ کر اور جلا کر ختم کر دیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت ہارون نے غور وفکر کے بعد یہ جانا کہ اگر وہ عملی اقدام کرتے ہیں تو ایک گروہ ان کا ساتھ دے گا اور دوسرا گروہ بچھڑا پوجنے والوں کے ساتھ رہے گا۔ اس طرح قوم دو گروہوں میں بٹ کر باہمی لڑائی شروع کر دے گی، مگر حضرت موسیٰ کے عمل کی صورت میں یہ اندیشہ نہ تھا۔ حضرت موسیٰ کو قوم میں غالب حیثیت حاصل تھی۔ اس بنا پر یہ ممکن تھا کہ وہ قوم میں جس فیصلہ کو چاہیں نافذ کریں۔

اس واقعہ پر غور کرنے کے بعد یہ اصول ملتا ہے کہ عمل کو ہمیشہ نتیجہ رخی (result-oriented) ہونا چاہئے۔ اگر عملی اقدام نہیں کرنے سے نتیجہ مطلوب صورت میں نکلنے والا ہو تو عملی اقدام کیا جائے گا اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ عملی اقدام سے حالات بگڑ جائیں گے اور ایک برائی کی جگہ دو برائی پیدا ہو جائے گی تو عملی اقدام نہ کیا جائے گا۔

ذہنی تناؤ

جدید صنعتی دور نے انسانی زندگی کو بعض نئی قسم کی پیچیدگیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ یہ چیزیں ابتدائی درجہ میں ہمیشہ موجود تھیں مگر موجودہ انتہائی درجہ میں اُن کا تجربہ انسان کو پہلی بار ہوا ہے۔ انہی میں سے ایک نمایاں مسئلہ وہ ہے جس کو ذہنی تناؤ (mental tension) کہا جاتا ہے۔

پیس آف مائنڈ کے ڈسٹرب ہونے کا سبب زیادہ تر وہ چیز ہوتی ہے جس کو ٹینشن یا اسٹرس کہا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ دنیا میں کسی بھی شخص کے لئے ٹینشن اور اسٹرس سے بچنا ممکن نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں کیا کیا جائے۔ مگر میں کہوں گا کہ ٹنشن یا اسٹرس کوئی برائی (evil) نہیں۔ بلکہ وہ انسان کے لئے ایک نعمت (boon) کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ اگر آدمی کے اندر منٹل ٹنشن نہ ہو تو اس کے اندر برین اسٹارمنگ نہیں ہوگی۔ اور اگر برین اسٹارمنگ نہ ہو تو مائنڈ کے

اندر وہ سرگرمیاں (activiteis) پیدا نہیں ہوں گی جو اعلیٰ انٹلکچول ڈیولپمنٹ کا واحد ذریعہ ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ٹینشن اور اسٹریس کا یہ کوئی صحت مند حل نہیں ہے کہ اس کو روکنے کی کوشش کی جائے یا اس کو مکمل طور پر دبا دینےکی کوشش کی جائے۔ اس قسم کا حل ایک قسم کی ذہنی تخدیر (intellectual anaesthesia) ہے۔ ایسی تخدیر ذہنی ترقی کے عمل کو روک کر انسان کو حیوانی سطح پر لے جانے کے ہم معنٰی ہے۔

So the solution lies in managing the
crisis/ tension and not in suppressing it.

معیار کا فرق

ایک صاحب نے میری تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ کی کتابیں پڑھی ہیں۔ مگر آپ کی تحریروں میں تضاد پایا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی کوئی مثال دیجئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے ایک طرف سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ لوگ بلاشبہہ مخلص تھے۔ مگر اسی کے ساتھ آپ یہ لکھتے ہیں کہ ۱۸۳۱ء میں اُنہوں نے پنجاب میں جو جہاد کیا وہ ایک غیر دانش مندانہ اقدام تھا۔ ایک طرف آپ شہیدین کی تعریف کرتے ہیں اور دوسری طرف آپ اُن کی تنقید کرتے ہیں۔ کیا یہ تضاد نہیں۔

میں نے کہا کہ یہ تضاد کی بات نہیں ہے بلکہ یہ فکری معیار کے فرق کی بات ہے۔ آپ لوگوں کا فکری معیار یہ ہے کہ آپ جن افراد کو اکابر کا درجہ دے دیں، اُن کے بارے میں آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ وہ غلطی نہیں کر سکتے، اُنہوں نے جو کچھ کہا یا کیا وہ سب درست تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے مزعومہ اکابر کے بارے میں اگر کوئی جزئی تنقید بھی کی جائے تو آپ لوگ بھڑک اُٹھتے ہیں۔ اپنے معیار کے مطابق، آپ اپنے اکابر کو صرف قابلِ تعریف سمجھتے ہیں، قابلِ تنقید نہیں۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا معیار وہ ہے جس کو علمی معیار کہا جاتا ہے۔ علمی معیار پُر اسرار شخصی تقدس پر قائم نہیں ہوتا، وہ معلوم اور ثابت شدہ حقائق پر مبنی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی معیار میں تحلیل اور تجزیہ کا طریقہ رائج ہے۔ علمی معیار کے مطابق، داخلی نیت ایک الگ چیز ہے اور خارجی عمل اُس سے

مختلف دوسری چیز۔ یہ علمی معیار شریعت کے عین مطابق ہے۔اسی بنا پر حدیث میں آیا ہے کہ اگر آدمی کی نیت درست ہو تو اجتہادی خطاء پر بھی اس کو ایک درجہ کا ثواب ملے گا (صحیح البخاری)

میرا طریقہ یہی علمی معیار والا طریقہ ہے۔ میں شخصی تقدّس کے نظریہ کو درست نہیں سمجھتا۔ میں شخصیتوں کا تجزیہ خالص حقائق کی روشنی میں کرتا ہوں۔ اس تجزیاتی طریقِ مطالعہ نے مجھے بتایا کہ سید احمد شہید اور سید اسماعیل شہید بلا شبہہ مخلص لوگ تھے۔مگر ۱۸۳۱ء میں اُنہوں نے پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خلاف جو مسلّح جہاد کیا، اس میں بیک وقت دو کمیاں شامل تھیں ——— ناقص تیاری اور حالات سے بے خبری۔

سید اسماعیل شہید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب جہاد کا فیصلہ ہوا تو اُنہوں نے جہاد کی تیاری شروع کر دی۔اُس وقت وہ دہلی میں تھے۔گرمی کے زمانہ میں وہ دہلی کی جامع مسجد کے پتھر کے فرش پر ننگے پاؤں چلتے تھے۔اس کو وہ جہاد کی تیاری سمجھتے تھے۔اُن کا یہ عمل اُن کے قلبی اخلاص کا ثبوت تو ضرور ہو سکتا ہے مگر اس کا کوئی تعلق مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اعلیٰ تربیت یافتہ فوج کے خلاف جنگ کی تیاری سے نہیں۔ کیوں کہ اس جنگ میں جو چیز فیصلہ کن بننے والی تھی وہ فوجی طاقت تھی، نہ کہ ننگے پاؤں گرم پتھر پر چلنے کی مشق۔

انہی کمیوں کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کا یہ مسلّح جہاد صرف یک طرفہ تباہی پر ختم ہوا۔کسی شخص کی نیت خواہ کتنا ہی زیادہ درست ہو، لیکن اگر وہ پتھر کو توڑنے کے لیے اپنا سَر اُس سے ٹکرانے لگے تو یقینی طور پر حسنِ نیت کے باوجود اُس کا سَر ٹوٹ جائے گا۔ کیوں کہ پتھر کو ہتھوڑے سے توڑا جا سکتا ہے مگر سَر سے نہیں۔

بے بنیاد سوچ

انڈیا کے ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی قسم کی غلط سوچ میں مبتلا ہیں۔ دونوں ہی 7 ں طور پر ایک فرضی یقین میں جی رہے ہیں۔ دونوں کے کیس کو مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے:

مسلم : اسلام سچا ہے، اس لیے میں بھی سچا ہوں۔

ہندو : ہر مذہب سچا ہے، اس لیے میں بھی سچا ہوں۔

یہ دونوں ہی قسم کی سوچ غلط مفروضات پر قائم ہے۔ غیر جانبدارانہ تجزیہ اُن کی غلطی کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس قسم کا یقین محض خوش عقیدگی کی بنیاد پر قائم ہے، وہ کسی حقیقی دلیل کی بنیاد پر قائم نہیں۔

اب مسلمان کے معاملہ کو لیجیے۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اسلام سچا اور برحق مذہب ہے۔ اسلام کا برحق مذہب ہونا اسی دنیا میں آج بھی ایک معلوم اور مسلّم حقیقت ہے۔ قرآن کی متعدد آیتیں اس کا ثبوت ہیں۔ مثلاً: ان الدین عندالله الإسلام (آل عمران ۱۹) اسی طرح فرمایا: ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ و ھو فی الآخرۃ من الخاسرین (آل عمران ۸۵)۔ اس طرح کی آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا سچّا اور برحق ہونا آج بھی ایک معلوم اور مسلّم حقیقت ہے۔

مگر جہاں تک مسلمانوں کا معاملہ ہے، اُن کی حیثیت اس اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ کوئی شخص جو اسلام کا دعویٰ کر رہا ہے یا کوئی گروہ جو اپنے آپ کو اسلامی گروہ بتاتا ہے اُس کا اسلام صرف آخرت میں معتبر اور متحقّق ہوگا، موت سے پہلے کی دنیا میں نہیں۔ موجودہ دنیا میں آدمی کو اندیشہ اور اُمید کے درمیان جینا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ: الایمان بین الرجاء والخوف۔

اب ہندو کے معاملہ کو لیجئے۔ یہ نظریہ کہ ہر مذہب سچا ہے، ایک غیر علمی اور غیر منطقی نظریہ ہے۔ مذاہب کا تقابلی مطالعہ بتاتا ہے کہ اُن کے درمیان بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کسی کے نزدیک خدا ایک ہے اور کسی کے نزدیک وہ متعدّد ہے۔ کوئی پرسنل گاڈ میں یقین رکھتا ہے اور کوئی یہ سمجھتا ہے کہ خدا ایک سرایت کی ہوئی اسپرٹ (pervading spirit) ہے، جس کا کوئی علیٰحدہ تشخص نہیں۔ کوئی پیغمبری کو مانتا ہے اور کوئی اوتار واد کو اور کوئی ابنیتِ خدا کو، وغیرہ وغیرہ۔ مذاہب کے درمیان اس قسم کے بنیادی اختلافات موجود ہیں، ایسی حالت میں ہر مذہب کو 7 ں بتانا ایک ایسا دعویٰ ہے جس کے لیے کوئی علمی اور منطقی اُساس موجود نہیں۔ مزید یہ کہ ''ہر مذہب سچا ہے'' کا نظریہ خود اپنی تردید آپ ہے۔ مذہب سچائی کا نمائندہ ہے۔ اور سچائی کبھی تعدد کو قبول نہیں کرتی۔ سچائی وہی ہے جو ایک ہو، جو سچائی کئی ہو وہ سچائی بھی نہیں۔

مذہب کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو یقین اور اعتماد عطا کرے۔ وہ اُس کے لیے جینے کا غیر متزلزل

سہارا ہو۔ جو بحران کے لمحات میں اُس کے لیے بھروسہ بن سکے۔ یہ مقصد صرف ایک سچائی کے تصور سے پورا ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ آدمی صرف کسی ایک سچائی پر اپنے ذہن کو مرتکز کرسکتا ہے، نہ کہ کئی سچائیوں پر۔

بہت سی باتیں ایسی ہیں جو کہنے میں خوب صورت معلوم ہوتی ہیں، مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے وہ بے معنٰی ہوتی ہیں۔ وہ گریمر کے اعتبار سے درست مگر حقیقت کے اعتبار سے غلط۔

ذہنی ترقی میں رکاوٹ

دہلی کے ایک اُردو ماہنامہ میں دعوتِ اسلام کے موضوع پر ایک تبصرہ چھپا ہے۔ صاحب تحریر کا ایک پیراگراف یہ ہے ’’تحریک اسلامی کے ایک ممتاز، بلند پایہ رہنما نے بڑی اچھی بات کہی کہ موجودہ جدید جمہوری آزاد ہندستان میں، دارالکفر اور دارالاسلام کی فقہی اصطلاحوں میں نہ پڑیے، یہ پورا ملک دارالدعوہ ہے اور یہ امت مسلمہ امت دعوت ہے۔ (زندگی نو، مارچ ۲۰۰۲ء صفحہ ۷۲)

اس عبارت میں مذکورہ رہنما کا نام نہیں لیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ رہنما سے مراد کون صاحب ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ہندستان کے بارے میں دارالدعوہ کا لفظ پہلی بار راقم الحروف نے استعمال کیا۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ مجھ سے پہلے کسی نے ہندستان کو دارالدعوہ کہا ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس سے پہلے مسلم رہنماؤں میں سے کسی نے ہندستان کو دارالکفر کہا، کسی نے دارالحرب کہا، کسی نے دارالطاغوت کہا، کسی نے دارالأمن کہا۔ مگر کوئی بھی شخص ہندستان کو دارالدعوہ نہ کہہ سکا تھا۔ ہندستان کے لیے دارالدعوہ کا لفظ پہلی بار میں نے استعمال کیا۔ اور اس کے حق میں شرعی دلائل فراہم کیے۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ مضمون نگار کے نزدیک وہ کون شخص ہے جس نے یہ بتایا کہ ہندستان دارالدعوہ ہے۔ اگر وہ جانتے ہیں کہ یہ کام راقم الحروف نے کیا ہے، پھر بھی اُنہیں میرا نام لینا پسند نہیں تو یہ ایک قسم کی ذہنی بزدلی ہے۔ اور اگر وہ اپنے حلقہ کے کسی بزرگ کو فرضی طور پر یہ کریڈٹ دینا چاہتے ہیں تو یہ بدترین قسم کی گروہ پرستی ہے۔ دونوں حالتوں میں یہ حقائق پر مصلحت کو ترجیح دینا ہے۔ اس کے سوا اس کی کوئی اور توجیہہ ممکن نہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر لوگ اس قسم کی کمزوری میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کمزوری کا سب سے بڑا

نقصان کسی دوسرے کونہیں پہنچتا بلکہ خود اس شخص کو پہنچتا ہے جو ایسی کمزوری میں مبتلا ہو۔ اُس کو اپنی اس کمزوری کی یہ بھاری قیمت دینی پڑتی ہے کہ اُس کا ذہنی ارتقاء رُک جائے۔ اس قسم کی کمزوری آدمی کے ذہن کو بند ذہن بنا دیتی ہے۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ بند ذہن کسی آدمی کے ذہنی اور فکری ارتقاء میں سب سے بڑی رُکاوٹ ہے۔

ذہنی ارتقاء کا معاملہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک ارتقاء یافتہ ذہن ہی کو وہ اعلیٰ چیز حاصل ہوتی ہے جس کو معرفت کہا گیا ہے۔ اور معرفت کا نہایت گہرا تعلق دینی فہم سے ہے۔ معرفت کے بغیر علم صرف معلومات ہے، اور معرفت کے ساتھ علم بصیرت کا خزانہ۔

امن کس لئے

امن کی تعریف اہلِ علم حضرات اس طرح کرتے ہیں کہ امن عدم جنگ (absence of war) کا نام ہے۔ مگر وہ لوگ جو مختلف مقامات پر حق اور انصاف کے اصول کے نام پر جنگ چھیڑے ہوئے ہیں وہ اس تعریف کو نہیں مانتے۔ اُن کا کہنا ہے کہ امن برائے امن کوئی چیز نہیں۔ اُن کے نزدیک امن وہ ہے جو امن مع انصاف (peace with justice) ہو، نہ کہ امن بغیر انصاف (peace whithout justice)

یہ سوچ ایک غیر حقیقی سوچ ہے۔ انصاف امن کا نتیجہ نہیں ہے۔ انصاف خود طالبِ انصاف کے عمل کا نتیجہ ہے۔ امن کے ذریعہ وہ معتدل حالات پیدا ہوتے ہیں جو مواقع کے استعمال کو ممکن بناتے ہیں۔ جنگ کی حالت مواقع (opportunities) کے استعمال میں رُکاوٹ ہے۔ امن کی حالت قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مواقع کی راہ سے یہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں تاکہ اُن کو استعمال کر کے اپنا مطلوب حق یا اپنا مطلوب انصاف حاصل کیا جا سکے۔

اگر آدمی کی سوچ یہ ہو کہ وہ فریقِ ثانی سے امن کا معاملہ کرنے پر صرف اُس وقت راضی ہو گا جب کہ امن کے ساتھ ساتھ اُس کو انصاف مل رہا ہو، تو آدمی کو نہ کبھی امن ملے گا اور نہ کبھی انصاف۔ ایسا امن اس دنیا میں کسی کے لیے ممکن ہی نہیں۔ یہ سوچ ایک غیر فطری چیز ہے جو اس دنیا میں کبھی نتیجہ خیز ہونے والی نہیں۔ صحیح سوچ یہ ہے کہ امن کو مواقعِ عمل سے جوڑا جائے، نہ کہ

حصولِ انصاف سے۔ امن کو فریقِ ثانی سے معاہدہ کر کے حاصل کیا جا سکتا ہے مگر انصاف یا حق کسی کو صرف اپنے عمل سے ملتا ہے، نہ کہ کسی اور کے دینے سے۔

وقت کے پیچھے سوچنا

مارچ ۲۰۰۲ء میں مسئلۂ فلسطین کے حل کے بارے میں عرب ملکوں کے درمیان ایک نیا نظریہ ابھرا۔ وہ یہ کہ اسرائیل اگر ۱۹۶۷ کی حد پر واپس چلا جائے تو عرب ممالک اسرائیل کو باقاعدہ طور پر قبول کرلیں گے۔ ایک تعلیم یافتہ عرب نے ایک یہودی سے بات کرتے ہوئے اُس کے سامنے یہ تجویز رکھی۔ یہودی نے مسکراتے ہوئے کہا کہ عزیز پڑوسی، تم نے بہت دیر کردی:

Dear Neighboure, you are too late.

عرب حضرات کی مذکورہ تجویز بہت اچھی ہے مگر یقینی طور پر وہ قابلِ عمل نہیں۔ یہ دراصل وقت کے پیچھے سوچنا ہے جو کہ عملی طور پر ناممکن ہے۔ ایک اُردو شاعر نے درست طور پر کہا ہے کہ:

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ عربوں کے لیے فلسطین کے معاملہ میں جو چیز ۱۹۱۷ میں ممکن تھی وہ ۱۹۴۸ میں ناممکن ہو چکی تھی۔ اسی طرح اُن کے لیے جو چیز ۱۹۴۸ء میں ممکن تھی وہ اُن کے لیے ۱۹۶۷ میں ممکن نہ رہی تھی۔ اسی طرح اُن کے لیے جو چیز ۱۹۶۷ میں ممکن تھی وہ اب ۲۰۰۲ میں اُن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ حقیقت خواہ کتنی ہی تلخ ہو مگر وہ ایک تاریخی حقیقت ہے، اور تاریخ کو بدلنا کسی کے لیے ممکن نہیں، نہ عربوں کے لیے اور نہ کسی دوسرے کے لیے۔

۲۰۰۲ء میں عربوں کے لیے فلسطین کے معاملہ میں جو چیز ممکن ہے وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ غزّہ اور اریحاء کی صورت میں اُن کو جو چیز ملی ہے اُس کو قبول کرلیں۔ وہ اس حاصل شدہ خطّے پر اپنے مستقبل کی تعمیر کریں۔ مگر بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اپنے پُر جوش رہنماؤں کی غیر حقیقت پسندانہ رہنمائی کے نتیجہ میں اُنھوں نے اس حاصل شدہ ٹکڑے کو بھی اپنے لیے مشتبہ بنالیا ہے۔

عربوں کو جاننا چاہئے کہ وہ حماس اور انتفاضہ جیسی پُر تشدد تحریکوں کے بَل پر کوئی چیز حاصل نہیں

کر سکتے۔ منفی عمل سے کبھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ حماس اور انتفاضہ جیسی تحریکیں حقیقت کے اعتبار سے تحریکیں نہیں ہیں، وہ صرف جذباتی ردّعمل کا مظہر ہیں۔ اور حقائق کی اس دنیا میں سوچے سمجھے عمل کے ذریعہ کوئی نتیجہ نکلتا ہے، نہ کہ جذباتی اُبال کے ذریعہ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ماضی کی بنیاد پر کبھی حال کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ حال کا فیصلہ ہمیشہ حال کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تنسیخ تاریخی قانون ہے۔ اس میں کوئی استثناء کبھی ممکن نہیں، نہ ایک قوم کے لیےاور نہ کسی دوسری قوم کے لیے۔

بُرائی کی جڑ

اکثر لیڈر سوچ کی اس غلطی میں مُبتلا ہوجاتے ہیں کہ اُن کے زمانہ میں جولوگ سیاسی اقتدار پر قابض ہیں وہی تمام برائیوں کی جڑ ہیں۔ اگر اُن کو اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو تمام بُرائی ختم ہوجائے گی۔ یہ سوچ اپنے تجربہ میں بار بار غلط ثابت ہوئی ہے۔

مصر کی جماعت الإخوان المسلمون نے یہ سمجھا کہ شاہ فاروق کی حکومت ملک کی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اگر کسی طرح اس حکومت کا خاتمہ کر دیا جائے تو اُس کے بعد ملک کا نظام ہر اعتبار سے درست ہوجائے گا۔ اس ذہن کے تحت اُنہوں نے مصر کے کچھ فوجی افسروں کے ساتھ مل کر شاہ فاروق کی حکومت کو ختم کر دیا اور اُنہیں ملک سے نکال دیا۔ مگر اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ حالات پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئے۔

اسی طرح پاکستان کی جماعتِ اسلامی نے یہی غلطی مزید اضافہ کے ساتھ دہرائی۔ مثلاً صدر محمد ایوب خاں کی حکومت کے زمانہ میں انہوں نے یہ فرض کرلیا کہ ملک کی تمام خرابیوں کی جڑ ایوب خاں کی فوجی حکومت ہے۔ انہوں نے اس حکومت کے خلاف ہنگامہ خیز مہم شروع کی۔ یہاں تک کی صدر ایوب کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ مگر ملکی حالات میں کوئی سدھار نہ ہوسکا۔ اس کے بعد دوبارہ یہی ہوا کہ انہوں نے فرض کرلیا کہ سابق پاکستانی وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔ چنانچہ وہ دوسرے اسلام پسندوں کو ساتھ لے کر مسٹر بھٹو کے سیاسی اقتدار کو اکھاڑنے میں مصروف ہوگئے۔ حتیٰ کہ جنرل ضیاء الحق کی مدد سے مسٹر بھٹو کو پھانسی پر چڑھانے میں

کامیاب ہوگئے۔مگر ملک کے حالات بدستور بگڑتے چلے گئے۔

''برائی کی جڑ'' کے نظریہ کا تجربہ موجودہ زمانہ میں بار بار دہرایا گیا ہے مگر ہر بار وہ مکمل طور پر ناکام ہوا ہے۔مسلمانوں کے علاوہ دوسرے لیڈر بھی بار بار اس غلط فکری میں مبتلا ہوئے۔مثلاً مہاتما گاندھی نے یہ سمجھا کہ برٹش راج ہندستان کی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔اسی طرح جے پرکاش نرائن نے یہ سمجھا کہ کانگریسی راج ملک کی ساری خرابیوں کی جڑ ہے۔مگر ہنگامہ خیز جدو جہد کے بعد جب برٹش راج اور پھر کانگریسی راج ختم ہوا تو معلوم ہوا کہ ملک کے اصل حالات میں مطلوب تبدیلی نہ ہوسکی۔پورن سوراج اور پورن کرانتی ملک کی اصل برائیوں (مثلاً کرپشن) میں جزئی اصلاح بھی نہ لا سکے، پورن سدھار کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر قسم کے بگاڑ کا تعلق سوچ سے ہے۔اصلاح کا راز یہ ہے کہ انسانی سوچ میں تبدیلی لائی جائے۔انسانی سوچ کو بدلے بغیر کوئی بھی اصلاح ممکن نہیں۔

سوچ کے بغیر

بہار کے ایک شہر میں ہندو۔مسلم فساد ہوا۔اس فساد میں مسلمانوں کا بہت زیادہ نقصان ہوا۔شہر کے مسلمانوں کی معاشیات تباہ ہوکر رہ گئی۔اس شہر کے ایک تعلیم یافتہ مسلمان سے میری ملاقات ہوئی۔ اُن سے میں نے پوچھا کہ آپ کے شہر میں یہ فساد کیوں ہوا۔اُنہوں نے بتایا کہ ہندوؤں کا ایک جلوس نکلا۔مسلم محلّہ میں پہنچ کر اُس نے مخالفانہ نعرہ لگانا شروع کیا۔اس پر مسلمان بھڑک اُٹھے۔کچھ مسلم نوجوانوں نے ''ایک اسٹپ لیا''۔اس کے بعد دنگا شروع ہوگیا۔وہ لوگ مسلم گھروں اور مسلم دکانوں کو جلانے اور لوٹنے لگے۔

میں نے پوچھا کہ آپ کہتے ہیں کہ مسلم نوجوانوں نے ایک اسٹپ لیا، یہ اسٹپ کیا تھا۔اصرار کے بعد اُنہوں نے بتایا کہ نوجوانوں نے جلوس کے اوپر کچھ دستی بم پھینکے، اس کے بعد وہ لوگ مشتعل ہوکر تخریبی کارروائیاں کرنے لگے۔پھر میں نے پوچھا کہ وہ نعرہ کیا تھا جس پر آپ لوگوں نے اسٹپ لیا۔اُنہوں نے بتایا کہ نعرہ یہ تھا: جے ماں کالی، مسلمان محلّہ کرو خالی۔

گفتگو کے دوران اُنھوں نے کہا کہ اس قسم کے اشتعال انگیز منصوبہ کا جواب دینا تو ضروری تھا۔ میں نے کہا کہ اس کو اشتعال انگیز منصوبہ نہ کہیے بلکہ ایک ایسا خیالی منصوبہ کہیے جو کبھی وجود میں آنے والا ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بتائیے کہ نعرہ اور فساد کے بعد کیا آپ کا محلّہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اُنھوں نے جوش کے ساتھ کہا کہ ہرگز نہیں، مسلمان آج بھی پہلے کی طرح اپنے محلّہ میں موجود ہیں۔ میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا نعرہ ہوا میں تحلیل ہو گیا، وہ زمین پر واقعہ نہ بن سکا۔

میں نے اُن کی بات سن کر کہا کہ میرے بھائی، جو نعرہ اتنا کمزور تھا کہ خونیں فساد کرانے کے بعد بھی وہ محلّہ کو مسلمانوں سے خالی نہ کرا سکا ایسے کمزور نعرہ پر آپ کو بھڑکنے کی کیا ضرورت۔ ایسے نعرہ کا سادہ جواب قدیم مثل کے مطابق، یہ تھا: کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

یہ ہے صحیح سوچ کا فقدان۔ صحیح سوچ لوگوں کو مکمل طور پر خونیں فساد سے بچا سکتی تھی، مگر غلط سوچ نے اُن کو ذلّت اور نقصان کی دوطرفہ تباہی میں مبتلا کر دیا۔ غلط سوچ آدمی کو بم کے اوپر بم مارنا سکھاتی ہے، اور صحیح سوچ اُس کو وہ تدبیر بتاتی ہے جس کے ذریعہ وہ بم کو ڈیفیوز (defuse) کر کے اُس کو غیر مؤثر بنا دے۔

سیکنڈری پوزیشن

مسجد کی نماز با جماعت میں ہر روز ایک سبق دیا جاتا ہے۔ وہ سبق یہ ہے کہ دس ہزار نمازیوں میں سے نو ہزار نو سو ننانوے نمازی جب مقتدی بن کر اپنے لیے ثانوی حیثیت (secondary position) کو قبول کرتے ہیں، اُس وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک شخص کی امامت میں نماز با جماعت ادا کی جا سکے۔ یہی فارمولا مسجد کے باہر کی زندگی کے لیے بھی مطلوب ہے۔ جس سماج یا گروہ کے اندر یہ مزاج نہ ہو وہاں نہ اتحاد قائم ہوگا اور نہ کوئی ترقی ممکن ہو سکے گی۔ زندگی میں ثانوی حیثیت کو قبول کرنا کسی بھی ترقی کے لیے بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

ملّی یا اجتماعی زندگی کے لیے یہ مزاج انتہائی طور پر ضروری ہے۔ مگر یہ مزاج اپنے آپ پیدا نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے شعوری تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی قوم میں سب سے زیادہ اہمیت ایسی تحریک

کی ہے جو لوگوں میں اس قسم کا مزاج پیدا کرے۔ شعور کی بیداری اصل کام کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی بھی تعمیری تحریک کا نقطۂ آغاز شعور کی تربیت ہے، نہ کہ پُر جوش مظاہرہ یا عملی اقدام۔

میڈیا کلچر

موجودہ زمانہ میں لوگوں کی سوچ میں جو بگاڑ آیا ہے اُس کا غالباً سب سے بڑا سبب وہ جدید ظاہرہ ہے جس کو میڈیا کلچر کہا جا سکتا ہے۔ جدید میڈیا، خواہ وہ پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، سب کا طریقہ یک طرفہ رپورٹنگ (one sided reporting) کا ہے۔ چونکہ عام لوگ خبروں کو میڈیا کے ذریعہ لیتے ہیں اس لیے لوگوں کی رائے ہر معاملہ میں ناقص ہوگئی ہے۔ وہ یک طرفہ سوچ کے تحت رائے قائم کرتے ہیں۔

اس یک طرفہ رپورٹنگ کا اُصول یہ ہے کہ بُری خبروں کو لو اور اچھی خبروں کو چھوڑ دو۔ میڈیا کی حیثیت ایک انڈسٹری کی ہے۔ اور انڈسٹری ہونے کے اعتبار سے اُس کے لیے یہی مفید طریقہ ہے کہ وہ کسی ملک یا سماج کی بُری خبروں کو نمایاں کرے۔ اور اچھی خبروں کو قابلِ تذکرہ نہ سمجھے۔ میڈیا کی اس روش نے عالمی سطح پر انسانی سوچ کو منفی بنا دیا ہے۔

اس معاملہ کی ایک دلچسپ مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ میں اکثر بی بی سی لندن کی نشریات کو سنتا ہوں۔ ایک دن میں بی بی سی لندن کا ہندی پروگرام سن رہا تھا۔ اپنے طریقہ کے مطابق، انہوں نے آخر میں کچھ خطوط پڑھ کر سنائے۔ ایک خط ماریشش میں مقیم ایک ہندو کا تھا۔ اُس نے اپنے خط میں یہ شکایت کی تھی کہ آپ ہندی بولنے والے علاقہ کی خبریں نشر کرتے ہیں، ماریشش میں بھی بہت سے لوگ ہندی بولتے ہیں مگر آپ کبھی ماریشش کی کوئی خبر نہیں دیتے۔ بی بی سی لندن کے اناؤنسر نے ہنستے ہوئے اس خط کا جواب دیا۔ اُس نے کہا کہ میڈیا تو بُری خبروں کی رپورٹنگ کا نام ہے۔ آپ کے ملک میں سب اچھی خبریں ہوتی ہیں، اور اچھی خبر میڈیا کے نزدیک کوئی خبر نہیں:

Good news is no news.

یہ فطرت کے نظام کے خلاف ہے کہ دنیا میں صرف برائی ہی برائی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ خود نظامِ فطرت کے تحت دنیا میں اگر ایک فیصد برائی ہوتی ہے تو عین اُسی وقت ننّانوے فیصد اچھائی موجود

رہتی ہے، خواہ براہ راست طور پر یا بالواسطہ طور پر۔ مگر میڈیا کبھی لوگوں کو اس واقعہ کی خبر نہیں دیتا کہ ہم جن برائیوں کی رپورٹ کر رہے ہیں وہ پورے سماج کا ایک فیصد حصہ ہے، نہ کہ کُل حصہ۔

۱۹۴۷ء سے پہلے برصغیر ہند کے اخبارات انگریزوں کے بارے میں صرف اُن کے ''ظلم'' کی خبریں دیتے تھے، انگریزی نظام کے مثبت پہلو اخباروں میں جگہ نہیں پاتے تھے۔ چنانچہ تمام ہندستانیوں کو انگریزوں سے نفرت ہوگئی۔ ۱۹۴۷ سے پہلے مسلم لیگ سے متاثر اخبارات یہاں کے ہندوؤں کے مثبت پہلوؤں کو نظر انداز کرتے تھے اور اُن کے بارے میں صرف منفی باتیں چھاپتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی اکثریت یہاں کے ہندوؤں کے بارے میں بدظن ہوگئی۔ اسی طرح آج کل تمام دنیا کا مسلم میڈیا امریکہ کے مثبت پہلوؤں کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا، وہ اُس کے بارے میں صرف بُری باتوں کو مسلمانوں تک پہنچاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان امریکہ سے متنفر ہوگئے ہیں اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ امریکہ اسلام کا دشمن نمبر ایک ہے۔

میڈیا کی حیثیت ایک انڈسٹری کی ہے۔ میڈیا کے اپنے تجارتی مصالح کی بنا پر یہ ممکن نہیں کہ وہ یک طرفہ رپورٹنگ کا طریقہ ختم کرے اور دوطرفہ رپورٹنگ کا طریقہ اپنے یہاں رائج کرے۔ اس مسئلہ کا عملی حل میڈیا کی شکایت کرنا نہیں ہے بلکہ خود اپنے ذہن کی اصلاح کرنا ہے۔ ہمیں چاہئے کہ ہم لوگوں کے اندر شعوری بیداری پیدا کریں۔ ہم یہ کوشش کریں کہ لوگوں کے اندر تفکیر و تدبّر کی صحیح صلاحیت پیدا ہو تاکہ وہ میڈیا کی ناقص رپورٹنگ سے متاثر نہ ہوں، بلکہ خود تجزیہ کرکے معاملات کے بارے میں درست رائے قائم کریں۔

اس تجزیہ کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً جب آپ مسلم اخباروں میں یا مسلم رہنماؤں کی تقریروں میں یہ سُنیں کہ امریکہ اسلام کا دشمن ہے تو آپ اُس کا تجزیہ کریں۔ آپ یہ سوچیں کہ امریکہ جب ایک دشمن ملک ہے تو چھ ملین سے زیادہ مسلمان وہاں جاکر کیسے آرام کے ساتھ رہ رہے ہیں، حتی کہ اخبار کے ایڈیٹر یا اسٹیج کے مقرر کے خود اپنے رشتہ دار بھی۔ اسی طرح یہ کہ اگر امریکہ اسلام دشمن ہے تو

وہاں ہزاروں کی تعداد میں اسلامی ادارے کیوں قائم ہیں اور آزادی کے ساتھ چل رہے ہیں۔ کیوں ایسا ہے کہ امریکہ میں ایسے شاندار اجتماعات ہوتے ہیں جو مُسلم ملکوں میں بھی نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ کہ اگر امریکہ اپنی اسلام دشمنی کی بنا پر فلسطین میں یہودیوں کی مدد کرتا ہے تو وہی امریکہ اسلامی ملک پاکستان کی مسلسل طور پر کیوں مدد کررہا ہے، وغیرہ۔

جب آپ مسلم اخباروں اور مسلم رہنماؤں کی باتوں کا اس طرح تجزیہ کریں گے تو آپ یقینی طور پر جان لیں گے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ میڈیا کی فراہم کردہ ایک فیصد خبروں پر انحصار نہ کیجئے بلکہ اُس کے ساتھ بقیہ ننانوے فیصد خبروں کو بھی شامل کرکے دیکھئے اور پھر آپ کبھی رائے قائم کرنے کی غلطی میں مبتلا نہیں ہوں گے۔

اُلٹی سوچ

کوئی فرد یا گروہ تشدد کیوں کرتا ہے، اپنے کسی حق کے حصول کے لیے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے یہ سوچ بالکل اُلٹی سوچ ہے۔ کیوں کہ تاریخ کا تجربہ بتاتا ہے کہ تشدد کے ذریعہ ہم کھوتے ہیں اور امن کے ذریعہ ہم حاصل کرتے ہیں:

Through violence we lose, through peace we gain.

ہٹلر اور اسٹالن جیسے بہت سے ڈکٹیٹروں نے بہت بڑے پیمانہ پر تشدد کیا، اپنے خیال کے مطابق، اپنے مفروضہ مقصد کو حاصل کرنے کے لیے۔ مگر بلا استثناء ہر ایک کے تشدد کا انجام صرف تباہی کی صورت میں نکلا۔

یہی معاملہ خود مسلمانوں کا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مختلف علاقہ کے مسلمانوں نے بزعم خود انصاف کے لیے یا اپنے حقوق کے حصول کے لیے تشدد کا طریقہ اختیار کیا۔ مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ برعکس صورت میں نکلا۔ تشدد کے آغاز میں وہ جہاں تھے، تشدد کے آخر میں وہ اُس سے بھی زیادہ پیچھے چلے گئے۔

اس کی ایک مثال فلسطین کا مسئلہ ہے۔ اعلان بالفور (Balfaur Declaration) کے تحت ۱۹۴۸ میں یہودیوں کو فلسطین کا ایک تہائی حصہ دیا گیا۔ اس کے مقابلہ میں عربوں کو فلسطین کا دو تہائی

حصہ حاصل ہوا جس میں پورا یوروشلم بھی شامل تھا۔ مگر عربوں نے اس تقسیم کو قبول نہیں کیا اور اعلان کیا کہ ہم یہودیوں کو سمندر میں ڈھکیل دیں گے۔ عربوں کی یہ جدو جہد ابتداء ہی سے تشدد کے راستہ پر چل پڑی اور آج تک اسی راستہ پر چل رہی ہے۔ مگر بے پناہ جانی اور مالی قربانی کے باوجود اس کا نتیجہ عربوں کو صرف ذلت اور محرومی کی صورت میں ملا۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں آیا ہے کہ: **إن اللّٰه يعطي على الرفق ما لا يعطي على العنف** (اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا)۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خدا نے اس دنیا کے لیے جو قانون مقرر کیا ہے اُس کے تحت یہاں کامیابی صرف پُر امن طریقِ کار میں لکھ دی گئی ہے، پُر تشدد طریقِ کار کے ذریعہ یہاں کسی کو کامیابی ملنے والی نہیں۔

ایک اور روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: **لا تتمنوا لقاء العدو واسئلوا اللّٰه العافية** (دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو اور اللہ سے عافیت مانگو)۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ اگر کسی کے ساتھ عداوت کے اسباب پیدا ہوں تو اُس کے مقابلہ میں تمہاری جوابی منصوبہ بندی امن کی بنیاد پر ہونی چاہئے، نہ کہ تشدد کی بنیاد پر۔

اصل یہ ہے کہ آدمی جب بھی تشدد کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ جذبات سے مغلوب ہو کر ایسا کرتا ہے۔ وہ ضد اور انتقام کی نفسیات کے تحت تشدد کے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرے کہ اس قسم کے مواقع پر اپنے منفی جذبات کو قابو میں رکھے، وہ حقیقت پسندانہ انداز میں پورے معاملہ کا بے لاگ جائزہ لے کر اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے تو وہ کبھی تشدد کا طریقہ اختیار نہیں کرے گا۔ وہ ہر حال میں امن کے حدود میں رہ کر اپنی کارروائی کرے گا۔ خواہ امن کا طریقہ اختیار کرنے میں ابتدائی طور پر اُس کو کچھ محرومی کو برداشت کرنا پڑے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پُر امن طریقہ اختیار کرنے میں بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ آدمی کو کچھ نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر اس کے اندر غیر متاثر سوچ ہو تو وہ اُس کو بتائے گی کہ تھوڑے نقصان کو برداشت کر لو تا کہ تمہیں بڑے نقصان کو برداشت نہ کرنا پڑے۔ جو کچھ کھویا جا چکا ہے اُس کو حاصل

کرنے کی کوشش میں ایسا نہ ہو کہ جو کچھ اب بھی حاصل ہے اُس کو بھی کھودینا پڑے۔

اوپر اُٹھ کر سوچنا

جب ایک فرد اور دوسرے فرد کے درمیان یا ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ وقتی مسائل سے اُوپر اٹھ کر سوچ نہیں پاتے۔ سامنے کا نقصان، عزت کا سوال، اس قسم کی چیزیں آدمی کے ذہن پر اتنا زیادہ غالب آتی ہیں کہ اُس کے لیے یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ نزاع سے الگ ہو کر سوچے اور زیادہ دوررس فیصلہ کر سکے۔

اسی کوتاہ فہمی کا یہ نتیجہ ہے کہ اکثر افراد اور اکثر قومیں کسی نہ کسی مسئلہ میں الجھی رہتی ہیں۔ اُن کے وقت اور اُن کی طاقت کا ایک بڑا حصہ مستقل طور پر مسائل کے حل کے نام پر غیر مفید چیزوں میں ضائع ہوتا رہتا ہے۔ حالانکہ عقل مندی یہ ہے کہ اپنی پوری قوت کو صرف تعمیر و ترقی کے کام میں لگایا جائے۔

دانش مندی یہ ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ پیدا ہو تو فوری تقاضوں (considerations) کو نظر انداز کر کے مستقبل کے اعتبار سے جرأت مندانہ فیصلہ کیا جائے۔ مسئلہ پیدا ہونے کے بعد ساری توجہ مسئلہ کو ختم کرنے پر لگائی جائے۔ ہر فوری نقصان کو گوارا کرتے ہوئے مصالحت کر لی جائے۔

ایسے ہر موقع پر آپ کا نشانہ نزاع کو ختم کرنا ہونا چاہئے، نہ کہ خود مسئلہ کو ختم کرنا۔ آپ کو چاہئے کہ آپ مستقبل کو دیکھیں، نہ کہ صرف حال کو۔ آپ کی نظر ملنے والے امکان پر ہونی چاہئے، نہ کہ کھوئے جانے والے نقصان پر۔ یہی اس دنیا میں ترقی کا واحد راز ہے۔

تنقید کوئی برائی نہیں

بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ کام کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ اُس میں تنقید کا انداز اختیار نہ کیا جائے۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ غیر تنقیدی انداز عوام کی بھیڑ جمع کرنے کے لیے تو یقیناً مفید ہے مگر وہ کسی گہرے اصلاحی کام کے لیے ہرگز مفید نہیں۔

تنقید کوئی برائی نہیں، تنقید ایک اعلیٰ نوعیت کا ذہنی عمل ہے۔ تنقید انسان کی فکری ترقی کے لیے ضروری ہے۔ جہاں تنقید نہیں وہاں فکری ترقی بھی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید کو امرِ ممنوع (taboo)

قرار دینے کا نتیجہ سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہوگا کہ لوگوں کے درمیان بے تنقید حالت قائم ہوجائے۔ بلکہ عملاً جو کچھ ہوگا وہ یہ کہ لوگ ذہنی جمود میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اُن کے درمیان سوچنے کا عمل (thinking process) رُک جائے گا۔ اور جس انسانی سماج میں سوچنے کا عمل رُک جائے وہ دھیرے دھیرے ایک ایسا سماج بن جائے گا جہاں لوگ جسمانی اعتبار سے بظاہر انسان دکھائی دیں گے، مگر اپنی عقل وفہم کے لحاظ سے وہ حیوانی سطح پر ہوں گے۔ وہ اعلیٰ فکری ترقی سے محروم ہوکر رہ جائیں گے، جب کہ اس دنیا میں اعلیٰ فکری ترقی ہی کسی انسان کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

بچوں کے لیے زیادہ بہتر تحفہ

جو لوگ زیادہ بڑی ترقی حاصل نہ کرسکیں وہ اکثر اس احساس میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ کیا کریں کہ اُن کے بچے اُس معاشی کمی میں مبتلا نہ ہوں جس میں وہ خود مبتلا ہوئے۔ اس احساس کے تحت وہ ایک ایسی چھلانگ لگا دیتے ہیں جو نتیجہ کے اعتبار سے اُن کے لیے برعکس ثابت ہوتی ہے۔

یہ بچوں کے بارے میں سوچنے کا صحیح طریقہ نہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے صحیح فارمولا یہ ہے کہ — اپنے لیے قناعت، اور بچوں کے لیے ترقی۔ یعنی حالات کے اعتبار سے آپ جس معاشی کامیابی تک پہنچے ہیں اُس پر قناعت کرتے ہوئے زندگی گزاریے۔ اس معاملہ کو بچوں کے اوپر چھوڑ دیجئے کہ وہ وسیع دنیا میں ہاتھ پاؤں ماریں اور اپنی محنت کے ذریعہ زیادہ ترقی حاصل کریں۔ آپ بچوں کے لیے صرف ابتدائی زینہ بننے پر قانع ہوجایئے۔ اگلے زینوں پر چڑھنا اور اوپر کی منزل تک پہنچنا یہ بچوں کے لیے چھوڑ دیجیے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی باپ کی طرف سے اپنے بچوں کے لیے سب سے بہتر عطیہ یہ نہیں ہے کہ وہ اُن کے لیے دولت کا ڈھیر چھوڑے۔ اس کے برعکس زیادہ بہتر عطیہ یہ ہے کہ وہ بچوں کو ایسے حالات دے سکے جو اُنھیں عمل پر اُبھارنے والے ہوں۔ بچوں کے اندر محنت کا جذبہ ہونا سب سے بڑا سرمایہ ہے، نہ کہ باپ کی طرف سے ملی ہوئی دولت۔ محنت کے بغیر جو دولت ملے وہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ اس قسم کی دولت وہ چیز ہے جس کو ایزی منی (easy money) کہا جاتا ہے۔ اور یہ ایک ثابت شدہ واقعہ ہے

کہ ایزی منی اُس کے پانے والے کو فائدہ کم پہنچاتی ہے اور نقصان زیادہ۔

اتحاد کا راز

کسی گروہ کے درمیان اتحاد کیسے قائم ہو۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اختلافکو مٹاؤ تاکہ باہمی اتحاد قائم ہو۔ اس نظریہ کے پیچھے جو سوچ ہے وہ یہ ہے کہ ـــــــ جب اختلاف نہ ہوگا تو اپنے آپ اتحاد قائم ہوجائے گا۔ اس سوچ کے مطابق، اختلاف ہے تو اتحاد نہیں، اور جہاں اتحاد ہے وہاں اختلاف نہیں۔ یہ سوچ سراسر بے بنیاد ہے۔ اس طرح کے فارمولے کے ذریعہ دنیا میں کبھی اتحاد قائم ہونے والا نہیں۔ اختلاف ایک فطری چیز ہے۔ وہ ہر انسان کی فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ایسی حالت میں اختلاف کو مٹانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اس مقصد کے لیے صحیح اور قابل عمل فارمولا یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے، نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا۔ کیوں کہ موجودہ دنیا میں ایسا ہونا ممکن ہی نہیں کہ لوگوں کے اختلافات کو اس طرح بلڈوز کردیا جائے کہ اُن کا وجود ہی باقی نہ رہے۔

موجودہ دنیا میں اصلاح کا حقیقی فارمولا صرف وہ ہے جو انسانی فطرت کے مطابق ہو۔ جو فارمولا فطرت سے مطابقت نہ رکھتا ہو وہ قابلِ عمل بھی نہیں۔ اور جو چیز قابلِ عمل نہیں وہ مفید بھی نہیں۔

عُسر کے ساتھ یُسر

موجودہ دنیا کا نظام اُمید کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں ہر رات کے بعد صبح آتی ہے۔ یہاں ہر عسر کے ساتھ ہمیشہ یُسر موجود رہتا ہے۔ یہاں ہر مسئلہ کے ساتھ مواقع کا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ہر پرابلم کے ساتھ سلوشن کا موجود ہونا اس دنیا کا ایک اٹل اصول ہے جس میں کبھی فرق نہیں آتا۔

اگر کبھی ایسا ہو کہ مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو سمجھنا چاہئے کہ ہم جو فارمولا استعمال کررہے ہیں وہ صورت حال کے مطابق نہیں۔ ایسی حالت میں نئے فارمولے کو استعمال کرنا چاہئے۔ یہی سنت رسول ہے۔ جہاں جنگ کا فارمولا کارآمد نہ ہورہا ہو وہاں امن کا فارمولا استعمال کیجیے۔ جہاں

براہ راست مقابلہ موثر نہ ہو رہا ہو وہاں بالواسطہ مقابلہ کا طریقہ اختیار کیجئے، وغیرہ۔

کامیاب ازدواجی زندگی

شوہر اور بیوی کے درمیان بہتر تعلق کی تعلیم دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے:
وعاشروهن بالمعروف فإن كرهتموهن فعسى أن تكرهوا شيئاً و يجعل الله فيه خيراً كثيراً (النساء ۱۹) یعنی ان کے ساتھ اچھی طرح گزربسر کرو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تم کو پسند نہ ہو مگر اللہ نے اس میں تمہارے لئے بہت بڑی بھلائی رکھ دی ہو۔

یہ بات اپنی حقیقت کے اعتبار سے شوہر اور بیوی دونوں ہی کے لیے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسن معاشرت یا بہتر ازدواجی زندگی کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ شوہر کو بالکل اپنی پسند کی بیوی مل جائے یا بیوی کو بالکل اپنی پسند کے مطابق شوہر مل جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ قانون فطرت کے مطابق، ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز پسند کے خلاف زوج (spouse) کے ساتھ موافقت (adjustment) کرنا ہے، ناپسندیدگی میں پسند کا پہلو تلاش کر لینا ہے۔ مشہور سنگر محمد رفیع کا ایک گانا اتنا مقبول ہوا کہ وہ ہر ماں باپ کے دل کی دھڑکن بن گیا۔ خود رفیع صاحب نے جب اس کو گایا تو وہ شدت تاثر سے رو پڑے۔ اس گانے میں باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے کچھ اشعار کہتا ہے، جس میں سے ایک شعر یہ ہے:

بابل کی دعائیں لیتی جا   جا تجھ کو سکھی سنسار ملے
میکے کی کبھی نہ یاد آئے   سسرال میں اتنا پیار ملے

یہ بات فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ موجودہ دنیا میں کسی لڑکے یا لڑکی کو اس طرح سکھ اور پیار نہیں مل سکتا۔ ایسی حالت میں مذکورہ قسم کے سکھ اور پیار کو زوجین کے لیے کامیاب زندگی کا معیار بتانا زوجین کے ساتھ ناانصافی ہے۔ کیوں کہ اس کے نتیجہ میں دونوں کے اندر غیر واقعی ذہن بنتا ہے، اور غیر واقعی ذہن کے ساتھ اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر ممکن نہیں۔

عقیدۂ خدا اور سائنس

سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین اسی علم فطرت کا ظہور ہے جس کی خبر پیشگی طور پر قرآن میں ان الفاظ میں دی گئی تھی —— **سنریهم اٰیاتنا فی الآفاق و فی أنفسهم حتی یتبین لهم أنه الحق (حم السجده ۵۳)** یعنی ہم لوگوں کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں اور انفس میں۔ یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ یہ (قرآن) حق ہے۔

سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں کائنات کی جو نئی تصویر بنی ہے، وہ عین وہی ہے جو قرآن میں پیشگی طور پر بتا دی گئی تھی۔ اس اعتبار سے جدید سائنسی دریافتیں گویا کتاب الٰہی کے اشارات کی تفصیل ہیں اور اسی کے ساتھ اس کی دلیل بھی۔ یہاں مختصر طور پر ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

جدید دریافت کے مطابق، کائنات کی ابتدا تقریباً ۲۵ بلین سال پہلے ہوئی۔ اس کے بعد مختلف تدریجی انقلابات سے گزرتے ہوئے وہ اپنی موجودہ حالت تک پہنچی۔ اس پورے سفر کی روداد اس موضوع کی کتابوں میں پڑھ کر معلوم کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کو محسوس طور پر کسی سائنسی پلے نیٹیریم (Planetarium) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ میں نے یہ پورا منظر واشنگٹن کے نیشنل پلے نیٹیریم میں دیکھا ہے۔

سائنسی مطالعہ بتاتا ہے کہ ۲۵ بلین سال پہلے خلا میں ایک سُپر ایٹم ظاہر ہوا۔ یہ ان تمام ذرات (particles) کا مجموعہ تھا جو موجودہ کائنات میں پائے جاتے ہیں۔ گویا موجودہ پوری کائنات ایک بہت بڑے فٹ بال جیسے گولے کی صورت میں شدت کے ساتھ باہمی طور پر چمٹی ہوئی تھی۔ اس گولے کے تمام ذرات بے حد طاقتور کشش کے ساتھ ایک دوسرے سے داخلی طور پر جڑے ہوئے تھے۔ معلوم طبیعیاتی قانون کے مطابق، یہ ناممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر بیرونی سمت میں سفر کریں۔

اس وقت اس سُپر ایٹم کے اندر نہایت طاقتور دھماکہ ہوا۔ اس دھماکہ کے فوراً بعد سُپر ایٹم کے

ذرات بکھر کر تیزی سے بیرونی سمت میں سفر کرنے لگے۔ اس کے بعد یہ ذرات وسیع خلا میں مختلف مجموعوں کی صورت میں اکٹھا ہو گئے۔ انہیں مجموعوں سے خلا میں پائی جانے والی وہ دنیائیں بنیں جن کو ستارہ، سیارہ، کہکشاں، شمسی نظام، زمین اور چاند جیسے الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

سُپر ایٹم کا یہ دھماکہ بیک وقت دو چیزیں ثابت کرتا ہے۔ ایک یہ کہ یہاں کائنات سے الگ ایک طاقتور ہستی پہلے سے موجود تھی جس نے اپنی ارادی مداخلت کے ذریعہ یہ غیر معمولی واقعہ کیا کہ سپر ایٹم کے ذرات داخلی رُخ پر سفر کے بجائے بیرونی رُخ پر سفر کرنے لگے۔

اس واقعہ کا دوسرا عظیم پہلو یہ ہے کہ دھماکہ (explosion) ہمیشہ تخریبی نتائج کا سبب بنتا ہے۔ پٹاخہ سے لے کر بم تک ہر دھماکہ بلا استثناء یہی خاصیت رکھتا ہے۔ مگر سُپر ایٹم کا دھماکہ استثنائی طور پر غیر تخریبی تھا۔ اس نے مکمل طور پر صرف صحت مند اور تعمیری نتائج پیدا کئے۔ یہ استثنائی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا خالق لامحدود قدرت کا مالک ہے۔ وہ یہ استثنائی اختیار رکھتا ہے کہ واقعہ کے ساتھ نتائج پر مکمل کنٹرول کر سکے۔

مطالعہ بتاتا ہے کہ ہماری کائنات ایک پھیلتی ہوئی کائنات (expanding universe) ہے۔ وہ غبارہ کی مانند مسلسل طور پر بیرونی سمت میں پھیل رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا ایک متعین آغاز ہے۔ اگر کائنات ابدی ہوتی تو وہ اپنی اس پھیلتی ہوئی نوعیت کی بنا پر اب تک ختم ہو چکی ہوتی۔ یہ ثابت ہونا کہ کائنات کا ایک آغاز ہے، یہ بھی ثابت کر دیتا ہے کہ اس کا کوئی آغاز کرنے والا ہے۔ ایک غیر موجود چیز کا آغاز اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس سے پہلے کوئی موجود ہو جو اپنے ارادہ سے اُس کا آغاز کر سکے۔

کائنات میں ایسے بے شمار شواہد ہیں جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ کائنات کا منصوبہ ساز اور اس کا ناظم صرف ایک ہے۔ اگر ایک سے زیادہ ناظم ہوتے تو یقینی طور پر کائنات میں فساد برپا ہو جاتا۔

مثال کے طور پر زمین اور سورج کا فاصلہ تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ یہ فاصلہ مسلسل طور پر اپنی حالت پر برقرار رہتا ہے۔ اگر اس فاصلہ میں تبدیلی آجائے تو اس کے مہلک نتائج پیدا ہوں

گے۔ مثلاً اگر یہ فاصلہ بڑھ کر ۲۰ کروڑ میل دور ہوجائے تو زمین پر اتنی ٹھنڈ پیدا ہو کہ پانی، نباتات، حیوانات اور انسان سب منجمد ہوجائیں۔ اسی طرح یہ فاصلہ اگر کم ہو کر ۵ کروڑ میل ہوجائے تو زمین پر اتنی گرمی پیدا ہو کہ تمام چیزیں بشمول انسان جل کر ختم ہوجائیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سورج اور زمین دونوں کا خدا ایک ہے۔ اگر دونوں کے خدا الگ الگ ہوتے تو دونوں الگ الگ اپنی مرضی چلاتے اور پھر یقینی طور پر یہ فاصلہ گھٹتا یا بڑھتا رہتا اور اس بے قاعدگی کی بنا پر زمین پر انسانی تہذیب کا وجود ناممکن ہوجاتا۔

نامعلوم حد تک وسیع کائنات میں ہمارا زمینی سیارہ ایک نادر استثناء ہے۔ یہاں پانی اور ہوا اور نباتات جیسی ان گنت چیزیں پائی جاتی ہیں جو انسانی زندگی کے لئے لازمی طور پر ضروری ہیں۔ جب کہ وسیع خلا میں معلوم طور پر کوئی بھی ایسی دنیا موجود نہیں جہاں بقائے حیات کا یہ سامان پایا جاتا ہو۔ یہ استثناء بتاتا ہے کہ یہ دنیا محض بے شعور مادہ کے ذریعہ نہیں بنی بلکہ وہ ایک باشعور ہستی کا تخلیقی کرشمہ ہے۔ اگر وہ محض مادی قوانین کے بے شعور تعامل کا نتیجہ ہوتی تو کائنات میں بہت سی ایسی زمینیں ہوتیں نہ کہ صرف ایک ایسی زمین۔

ہماری دنیا کی ہر چیز انتہائی حد تک بامعنیٰ ہے۔ چیزوں کی معنویت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ دنیا ایک باشعور تخلیق کا نتیجہ ہے۔ کوئی دوسرا نظریہ اس حکمت اور معنویت کی توجیہہ نہیں کرسکتا۔

مثلاً زمین کے حجم (سائز) کو لیجئے۔ زمین کا موجودہ حجم تقریباً ۲۵ ہزار میل کی گولائی میں ہے۔ یہ حجم بے حد بامعنیٰ ہے۔ چنانچہ یہ حجم اگر ۵۰ ہزار میل ہوتا تو زمین کی کشش اتنی زیادہ بڑھ جاتی کہ وہ انسانی جسم کی بڑھوتری کو روک دیتی۔ اس کے بعد زمین پر صرف بالشتیے قسم کے انسان دکھائی دیتے۔ اس کے برعکس اگر زمین کا حجم گھٹ کر ۱۲ ہزار میل ہوتا تو اس کی قوت کشش اتنی کم ہوجاتی کہ وہ انسانی بڑھوتری کو روک نہ سکتی۔ انسان کا قد تاڑ کی طرح لمبا ہوجاتا۔ اس کے سوا اور بے شمار قسم کے غیر موافق حالات پیدا ہوتے جو انسان کی تمام تمدنی ترقیوں کو ناممکن بنا دیتے۔

مذکورہ پہلوؤں پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنسی اعتبار سے، یہ مانے بغیر چارہ نہیں کہ اس

دنیا کا ایک خالق ہے اور وہ یقینی طور پر صرف ایک ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں ہمارے لئے جو انتخاب ہے وہ با خدا کائنات (universe with God) اور بے خدا کائنات (universe without God) میں نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے لیے حقیقی انتخاب با خدا کائنات (universe with God) اور غیر موجود کائنات (no universe at all) میں ہے۔ یعنی اگر ہم خدا کے وجود کا انکار کریں تو ہم کو کائنات کے وجود کا بھی انکار کرنا پڑے گا۔ چوں کہ ہم کائنات کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے اس لیے ہم خدا کے وجود کا بھی انکار نہیں کر سکتے۔ اس معاملہ میں ہمارے لیے دوسرا کوئی ممکن انتخاب موجود نہیں۔

مذہب اور سائنس

انسانیات (anthropology) کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مذہب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے، جتنا کہ انسان کی تاریخ پرانی ہے۔ جب سے انسان زمین پر موجود ہے اسی وقت سے مذہب بھی یہاں موجود رہا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسا انسانی معاشرہ دریافت نہیں ہوا ہے جس کے اندر مذہب نہ پایا جاتا ہو۔ حتیٰ کہ موجودہ زمانہ جس کو کچھ پر جوش لوگ لامذہبیت کا زمانہ سمجھتے ہیں وہ بھی یقینی طور پر مذہب سے خالی نہیں ہے۔ آج بھی مذہب اتنا ہی زندہ ہے جتنا کہ وہ اس سے پہلے زندہ تھا۔

موجودہ زمانہ میں روایتی مذہبی طبقہ کے علاوہ اہل علم کا جو نیا طبقہ پیدا ہوا، جس کو عام طور پر ماڈرن طبقہ کہا جاتا ہے، وہ وسیع تر تقسیم میں دو گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو اپنے دعویٰ کے مطابق خدا اور مذہب کا منکر ہے۔ اس قسم کے افراد کو عام طور پر ملحد (Atheist) کہا جاتا ہے۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اگرچہ مذہب کے روایتی فارم سے اپنے آپ کو وابستہ نہیں کرتا، تاہم وہ خود اپنی تشریح کے مطابق، اپنے آپ کو خدا اور مذہب کا ماننے والا بتاتا ہے۔ پہلے گروہ کی ایک ممتاز شخصیت کے اعتبار سے انگریز فلسفی برٹرینڈ رَسل (1872-1970) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دوسرے گروہ کی ایک مثال مشہور جرمن سائنس داں البرٹ آئنسٹین (1879-1955) ہے۔

پہلا گروہ: برٹرینڈ رسل

برٹرینڈ رسل ایک غیر معمولی ذہین آدمی تھا۔ اس کو لمبی عمر ملی۔ وہ اپنی نوجوانی کے زمانے سے لے کر بڑھاپے کی عمر تک مسلسل مطالعہ کرتا رہا۔ اس کی سوانح عمری اور اس کی دوسری کتابوں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی ابتدائی عمر میں اس کو سب سے زیادہ جس چیز سے دلچسپی ہوئی وہ یقینیت (certainty) تھی۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے علم کا طالب تھا مگر وہ اس علم کو حاصل کرنا چاہتا تھا جس کے واقعہ ہونے پر وہ یقین کر سکے۔ اپنے اس مزاج کی بنا پر اس کو سب سے پہلے میتھ میٹکس سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اس نے لکھا ہے کہ اس زمانہ میں میرا احساس یہ تھا کہ میں نے اپنے لئے

مذہب کا ایک قابل اعتماد بدل پالیا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کو نظر آیا کہ میتھمیٹکس میں منطقی تیقن (logical certainty) موجود ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ میں نے میتھمیٹکس کی صورت میں اس علم کو پالیا ہے جس کو میرا ذہن تلاش کر رہا تھا۔ اس کے مقابلہ میں مذہب برٹرینڈ رسل کو توہمات (superstition) کا مجموعہ نظر آیا۔ چنانچہ اس نے مروجہ مذہب کو رد کر کے میتھمیٹکس کو اپنے دین کے طور پر اختیار کر لیا۔

مگر بعد کو جب برٹرینڈ رسل نے زیادہ تفصیلی مطالعہ کیا تو اس کا یہ یقین متزلزل ہو گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ میرا یہ یقین حقائق کے سرسری مطالعہ پر مبنی تھا، حقائق کا زیادہ گہرا مطالعہ اس کی تصدیق نہیں کرتا۔

برٹرینڈ رسل کے بعد کے مطالعہ کے نتائج کو اس کی کتاب انسانی علم (Human Knowledge) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں برٹرینڈ رسل نے قطعی دلائل کے ذریعہ دکھایا ہے کہ موجودہ دنیا میں انسانی مطالعہ کبھی بھی کسی کو یقینی علم تک نہیں پہنچا سکتا۔ ایک طرف انسانی محدودیتیں اور دوسری طرف کائنات کی پراسرار نوعیت (mysterious nature) فیصلکن طور پر یقینی علم کی راہ میں حائل ہیں۔ انسان کا مطالعہ آخر کار جہاں اس کو پہنچاتا ہے وہ تیقن (certainty) نہیں ہے بلکہ صرف قرینہ یا احتمال (probability) ہے۔ اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہم حقیقت (reality) کو براہِ راست دریافت نہیں کر سکتے۔ ہم صرف یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ احتمالی طور پر یہاں فلاں حقیقت موجود ہے، اگرچہ وہ براہِ راست ہمارے تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رسل کو اس کے تمام عمر کے مطالعہ نے جہاں پہنچایا وہ ایک ایسا مقام تھا جہاں وہ حقیقی مذہب کے عین قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر اسلامی الفاظ استعمال کئے جائیں تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ لا الٰہ کی منزل تک پہنچ چکا تھا، مگر اس کے بعد وہ اِلا اللہ کی منزل طے نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ اس کی موت ہو گئی۔

برٹرینڈ رسل کی یہ بات کہ انسانی علم ہم کو صرف قرینہ یا احتمال (probability) تک پہنچاتا ہے،

یہ اس کی ذاتی بات نہیں۔ یہی موجودہ زمانہ کے تمام علماءِ سائنس کا موقف ہے۔ یہ اصول اب جدید علم کا ایک ایسا مسلّمہ بن چکا ہے جس سے کسی بھی صاحب علم کو اختلاف نہیں۔

علمی تحقیقات کا اس حقیقت تک پہنچنا کہ اس دنیا میں، خالص علمی طور پر، ہم صرف قرینہ یا احتمال تک پہنچ سکتے ہیں، بے حد اہم ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم ازکم موجودہ علم کے مطابق، سائنس اور مذہب کے درمیان وہ فرق ختم ہو چکا ہے جو قدیم زمانہ میں فرض کر لیا گیا تھا۔ اب عقل (reason) کا موقف بھی عین وہی ہے جو اس سے پہلے عقیدہ (belief) کا موقف تھا۔

مذہب کا موقف قدیم ترین زمانہ سے یہ تھا کہ سچائی یا حقیقت اپنی نوعیت میں ایک غیبی چیز ہے، وہ نہ دکھائی دینے والی دنیا (unseen world) سے تعلق رکھتی ہے۔ ہمارے لئے صرف یہ ممکن ہے کہ ہم ظاہری قرائن کی بنیاد پر یہ مستنبط کریں کہ فلاں حقیقت یہاں موجود ہے۔ اگر چہ وہ دکھائی نہیں دیتی۔ اب سائنس کا موقف بھی عین یہی ہو چکا ہے۔ جدید سائنس کا کہنا ہے کہ ہم چیزوں کی اصل کو نہیں دیکھ سکتے، ہم چیزوں کے صرف ظاہری اثر (effect) کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور ظاہری اثر سے یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ فلاں چیز یہاں موجود ہے، اگر چہ بظاہر وہ ہمارے مشاہدہ اور تجربہ میں نہیں آتی۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے تمام لوگوں کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ قرینہ (probability) کی بنیاد پر مذہب کی واقعیت کو بھی اسی طرح مانیں جس طرح وہ سائنسی نظریات کی واقعیت کو مانتے ہیں۔ ان میں سے ایک کو ماننے کے بعد دوسرے کو نہ ماننے کی کوئی وجہ ان کے پاس موجود نہیں۔ ان حضرات کو جاننا چاہئے کہ اب ان کے لئے جن دو حالتوں کے درمیان انتخاب ہے وہ انکار مذہب اور اقرار مذہب نہیں ہے بلکہ وہ اقرار مذہب اور انکار خویش کے درمیان ہے۔ یہ حضرات اگر مذہب کے انکار پر مصر ہوں تو انہیں خود اپنا انکار بھی کرنا پڑے گا۔ چونکہ ان کے لئے اپنا انکار ممکن نہیں اس لئے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ مذہب کا انکار کریں۔

دوسرا گروہ: آئنسٹائن

دوسرے گروہ کی ایک علامتی شخصیت آئنسٹائن ہے۔ آئنسٹین نے اپنی پوری زندگی سائنس

کے مطالعہ میں گزاری۔ مگر اسی کے ساتھ وہ اپنے اندر روحانی جذبات بھی پاتا تھا۔ چنانچہ اس نے مذہب کا بھی مطالعہ کیا۔ مذہب کے بارے میں بھی اس کا عقیدہ اتنا ہی گہرا تھا جتنا کہ سائنس کے بارے میں اس کا عقیدہ گہرا تھا۔ تاہم اس کے نظریہ کے مطابق دونوں دو بالکل الگ الگ موضوعات تھے۔ اس کے الفاظ میں، سائنس کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہے (what is) اس کے مقابلہ میں مذہب کا موضوع یہ جاننا ہے کہ کیا ہونا چاہئے (what should be) گویا مذہب کا تعلق داخلی یقین سے ہے اور سائنس کا تعلق خارجی معلومات سے ہے۔

تاہم یہ تقسیم کافی نہیں۔ اس تقسیم کے باوجود وہ اصل سوال بدستور باقی رہتا ہے جس کی بنا پر سائنس اور مذہب کا مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ خالص علمی اعتبار سے مذکورہ تقسیم کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ اصل سوال مذہب اور سائنس دونوں کو ملانے کا ہے۔ مذہب علم الٰہی کا نام ہے اور سائنس علم انسانی کا نام۔ یہ ضروری ہے کہ ہم ایسا فارمولا دریافت کریں جو علم الٰہی اور علم انسانی دونوں کو ایک کر سکے۔ اس کے بغیر انسان کے اندر وہ مطلوب شخصیت پیدا نہیں ہو سکتی جس کو علم نفسیات میں متکامل شخصیت (integrated personality) کہا جاتا ہے۔

برٹرینڈ رسل اور اس کے جیسے لوگوں کی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے علم کی نوعیت کو نہیں سمجھا۔ اس لئے وہ صحیح رائے تک نہ پہنچ سکے۔ اس طرح آئنسٹائن اور اس کے جیسے لوگوں کی یہ غلطی ہے کہ انہوں نے مذہب کی نوعیت کو نہیں سمجھا اور اپنی عدم واقفیت کی بنا پر مذہب کا ایک خود ساختہ تصور قائم کر لیا جو حقیقت سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ اس گروہ کے لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ تمام مروجہ مذاہب کو مذہب کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب (major religions) ہیں۔ اس کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں دوسرے مذاہب موجود ہیں۔ یہ لوگ ان سب کو ملا کر مذہب کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ دیکھتے ہیں کہ ان میں سے ہر مذہب کی تعلیمات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان میں وہ 7 نیت نہیں پائی جاتی جو سائنس میں موجود ہے۔ اس لئے وہ یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ مذہب ایک شخصی معاملہ ہے۔ جو شخص جس مذہبی عقیدہ کو مانے وہی اس کا مذہب ہے، کسی دوسرے شخص کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔

اس قسم کا مذہبی تصور خود مذہب کی نفی ہے۔ مذہب کیا ہے۔ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ایسی مکمل آئیڈیالوجی کا نام ہے جو انسان اور کائنات کی اطمینان بخش توجیہہ کر سکے۔ جس میں انسان اپنے تمام داخلی اور خارجی سوالات کا جواب پالے۔ مذہب آدمی کے لئے یقین کا سرچشمہ ہے۔ جو مذہب کلی صداقت نہ ہو وہ انسان کو یقین کا سرمایہ نہیں دے سکتا۔ اور جو مذہب انسان کو یقین نہ دے وہ مذہب بلاشبہہ مذہب بھی نہیں۔

اصل یہ ہے کہ جدید اہل علم مذہب کے مطالعہ میں چند غلطیاں کرتے ہیں۔ اس بنا پر وہ مذہب کو سمجھنے میں بھی ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

ا۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہر موجود مذہب کو مستند مذہب سمجھ لینا اور اس بنیاد پر مذہب کا مطالعہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے توہماتی عقائد جیوتش (Astrology) اور فلکیات (Astronomy) سب کو یکجا کر کے اور پھر ان کے مجموعی مطالعہ سے ایک علم الافلاک بنانے کی کوشش کی جائے۔ اس معاملہ میں سائنٹفک مطالعہ کا طریقہ یہ ہے کہ غیر ثابت شدہ خیالات اور اوہام کو الگ کر دیا جائے اور صرف ثابت شدہ معلومات کی بنیاد پر علم افلاک وضع کیا جائے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہمیں مذہب کے مطالعہ میں بھی اختیار کرنا چاہئے۔ بطور واقعہ یہ درست ہے کہ آج کی دنیا میں مذہب کے نام سے بہت سے اعتقادی نظام پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب ان کا گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص علمی اعتبار سے تمام مذاہب کی حیثیت 7ں نہیں۔

ان میں ایسے مذاہب ہیں جن کی کوئی معلوم تاریخ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے تمام مذاہب ابتدائی طور پر ہی رد ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ جن مذاہب کو تاریخی اعتباریت (historical credibility) حاصل نہ ہو وہ سرے سے اس قابل ہی نہیں کہ ان پر غور کیا جائے۔ اسی طرح کتنے مذاہب ہیں جن کے بارے میں یہ ثابت نہیں کہ ان کا موجودہ متن (text) کسی تبدیلی کے بغیر آج موجود ہے، اور جس مذہب کا خود متن مشتبہ ہو اس کی صداقت پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

اس قسم کے مختلف علمی معیار (scientific criteria) ہیں جن کا استعمال مذاہب کے مطالعہ

میں ضروری ہے۔ مگر جب ان معیاروں کو موجودہ مذاہب پر منطبق کیا جاتا ہے تو یہ مذاہب اس علمی جانچ پر پورے نہیں اترتے۔

مذاہب کے پورے مجموعے میں صرف اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو استثنائی طور پر اس خصوصیت کا حامل ہے کہ وہ ہر قسم کی علمی جانچ پر پورا اترتا ہے۔ ایسی حالت میں تمام موجود مذاہب کو 7ں درجہ دے کر ان کا خلاصہ نکالنا ایک غیر علمی فعل ہے۔ اس معاملہ میں واحد درست موقف یہ ہے کہ ضروری علمی جانچ پر پورا اترنے والے مذہب کو لے لیا جائے اور جو مذاہب اس قسم کی علمی جانچ پر پورے نہ اتریں انہیں تاریخ کے کتب خانہ میں محفوظ کر دیا جائے۔

۲۔ اسلام کو مذہب کا مستند ایڈیشن (authentic version) ماننے کے بعد وہ تمام غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہو جاتی ہیں جو مختلف مذاہب کو 7ں درجہ دینے کی صورت میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کائنات کے بارے میں توہماتی عقائد کو الگ کر کے خالص سائنسی حقیقتوں کی بنیاد پر کائنات کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ اسلام کو مذہب کا واحد نمائندہ ماننے کی صورت میں ہم کو ایک ایسا مستند ماخذ مل جاتا ہے جس کے ذریعہ مذہبی عقائد کا ایک غیر اختلافی نظام بنایا جاسکے۔ مثلاً مذاہب میں خدا کے بارے میں مختلف اور متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح پیغمبری اور رسالت کے بارے میں سخت اختلافی نظریات موجود ہیں۔ موت کے بعد زندگی کی نوعیت کیا ہوگی، اس کے بارے میں بھی متضاد نظریات پائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ دوسرے تمام مذہبی عقائد و افکار کا ہے۔ مگر اسلام کو مذہب کے مستند ماخذ کی صورت میں لینے کے بعد ہمیں ایسے غیر اختلافی نظریات و عقائد مل جاتے ہیں جن پر ہم یقین کر سکیں۔ یقین وہ سب سے بڑی چیز ہے جس کے لئے انسان کو مذہب کی ضرورت ہے۔ اور تمام مذاہب کو 7ں ماننے کی صورت میں، اسی اصل مطلوب چیز سے انسان محروم ہو جاتا ہے۔

۴۔ ایک اہم سوال یہ ہے کہ مذہب اور دنیوی معاملات کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہو۔ یہ ایک بے حد اہم سوال ہے جس کا جواب مختلف مذاہب میں مختلف انداز سے دیا گیا ہے۔ مثال کے

طور پر عیسائیت میں دنیوی معاملات کو مذہب کا لازمی جزءقرار دیا گیا ہے۔اس کے نتیجہ میں وہ لوگوں کو نا قابل عمل نظر آنے لگا۔ یہاں تک کہ چرچ اور ریاست میں وہ جنگ شروع ہوئی جس کے نتیجے میں دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ اس معاملہ میں اسلام نے نہایت اہم ہدایات دی ہیں۔ ان میں سے کچھ کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

الف۔ اسلام میں ایک اہم تعلیم وہ ہے جو حدیث میں ان الفاظ میں دی گئی ہے: **انتم اعلم بامور دنیاکم** (صحیح مسلم) یعنی تم لوگ اپنی دنیا کے معاملہ میں زیادہ جانتے ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خالص دنیوی نوعیت کے معاملات، مثلاً زراعت، باغبانی، شہری منصوبہ بندی، اقتصادی تنظیم جیسی چیزوں کو علمی ریسرچ کی بنیاد پر طے کیا جائے گا۔یعنی علمی ریسرچ میں جو چیز انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوگی وہی مذہب کے نزدیک بھی درست مانی جائے گی۔

ب۔ اسی طرح مذہب اور سیاسی حکمرانی کے معاملہ میں قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ سیاسی اقتدار اللہ کا ہے۔ وہی جس کو چاہتا ہے سیاسی اقتدار دیتا ہے (آل عمران ۲۶) مزید یہ کہ سیاسی اقتدار امتحان کا ایک پرچہ ہے جس طرح مال اور اولاد وغیرہ امتحان کے پرچے ہیں (یونس ۱۴)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سیاسی حکمرانی کے حصول کے لئے لڑائی کرنا اسلام کی تعلیم نہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فطری تاریخی حالات جس کے حق میں سیاسی اقتدار کا فیصلہ کریں، دوسرے لوگ اس کو قبول کر کے اس کو اپنے امتحان کا موقع دیں، نہ کہ لڑائی کرکے اس سے سیاسی امتحان کے خداداد پرچے کو چھیننے کی کوشش کریں۔

اسلام ایک نعمت

کیمسٹری کی سائنس اگر مفروضات پر بنے ہوئے قدیم فن کیمیا کو اپنے ساتھ شامل رکھتی تو کیمسٹری کی سائنس کبھی ترقی نہیں کرتی۔ اسی طرح ایسٹرانمی، اگر اوہام پر قائم قدیم علمی نجوم پر بھروسہ کرتی تو جدید ایسٹرانمی کا ارتقاء ممکن نہ ہوتا۔ یہی معاملہ تمام علوم کا ہے۔موجودہ زمانہ میں مختلف علوم کی ترقی صرف اس وقت ممکن ہوئی ہے جبکہ ہر علم سے غیر سائنسی مفروضات کو الگ کر

دیا گیا۔ اور خالص سائنسی حقائق کی بنیاد پر تمام علوم کو مدون کیا گیا۔ یہی اصول ہمیں مذہب کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔

مذہب میں سائنسی مطالعہ کے ذریعہ ہمیں یہ دریافت کرنا ہے کہ کون سا مذہب غیر متغیر حالت میں آج بھی موجود ہے۔ اور کون سے وہ مذاہب ہیں جو تغیرات کی بنا پر اپنا علمی استناد (authenticity) کھو چکے ہیں۔ اس اعتبار سے جب خالص علمی جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ حیثیت اب صرف اسلام کو حاصل ہے۔ اسلام کا متن، اس کی تاریخ، اس کی تعلیمات حتی کہ اس کے متن کی اصل زبان بھی آج تک پوری طرح اپنی ابتدائی حالت میں موجود ہے۔ اسلام ہمیں قابلِ یقین مذہبی نظام بھی دیتا ہے اور اسی کے ساتھ دوسری وہ تمام چیزیں بھی جن کی ہمیں اپنی مذہبی زندگی کی تشکیل کے لئے ضرورت ہے۔

قناعت کامیابی کا راز

ایک عوامی مثل ہے۔ یہ مثل زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتاتی ہے اس مثل کے الفاظ یہ ہیں ''آدھی چھوڑ کے پوری دھاوے، پوری ملے نہ آدھی پاوے''۔

اصل یہ ہے کہ انسان بیشتر حالات میں اپنی خواہشات اور اپنی امنگوں (ambitions) کے تحت سوچتا ہے اس بنا پر اکثر وہ ایسے اقدامات کر بیٹھتا ہے جو حقیقی حالات کے اعتبار سے اس کے لئے قابلِ حصول نہیں ہوتے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا عمل انجام کے اعتبار سے مکمل ناکامی پر ختم ہوتا ہے، وہ ناممکن کو حاصل کرنے کی کوشش میں ممکن کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں اکثر مشہور مسلم رہنماؤں کی کہانی یہی ہے۔ انہوں نے حقائق کی رعایت کئے بغیر محض اپنی خواہشوں اور امنگوں کے تحت بڑی بڑی چھلانگ لگا دی، اس کا نتیجہ ملت کے حصہ میں تباہی کے سوا کچھ اور نہ آیا۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں لیجئے۔

۱۔ سردار شوکت حیات خاں مشہور پاکستانی لیڈر ہیں۔ وہ متحدہ پنجاب کے سابق وزیر اعظم مرحوم سر سکندر حیات خان کے صاحبزادے ہیں۔ سردار شوکت حیات خان نے اپنے کیریر کا آغاز دوسری جنگ عظیم میں فوجی افسر کی حیثیت سے کیا۔ ۱۹۴۳ میں مسلم لیگ کی سیاست میں سرگرم طور پر شامل ہو گئے۔ پاکستان کے قیام کے بعد وہ پنجاب کے وزیر بنے اور وہاں کے دوسرے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔

سردار شوکت حیات خاں نے اپنی زندگی کے حالات پر ایک کتاب انگریزی زبان میں لکھی ہے جس کا نام (The Nation That Lost Its Soul) ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ (گم گشتہ قوم) دسمبر ۱۹۹۵ء میں پاکستان سے چھپا ہے۔ کتاب کا یہ اردو ایڈیشن ۴۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ناشر جنگ پبلشرز لاہور ہیں۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان ''لیاقت علی خاں'' ہے۔ جو پاکستان کے پہلے وزیر اعظم تھے۔ اس باب میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے ایک کو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

''نواب زادہ لیاقت علی خان'' کو حقائق اور ملک کے جغرافیہ سے بھر پور واقفیت نہ تھی۔ جس

کے وہ پہلے وزیر اعظم بن چکے تھے۔...... بعد میں کشمیر پر حملہ کے دوران جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن لاہور آیا۔ ایک ڈنر، جس میں لیاقت، گورنر مودی اور پنجاب کے چار وزیر موجود تھے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کا پیغام پہنچایا۔ پٹیل جو ہندستان کی ایک طاقتور شخصیت تھا۔ اس کا پیغام تھا کہ اس اصول کی پابندی کی جائے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے مابین ریاستوں کے مستقبل کے بارے میں طے پایا تھا وہ یہ کہ ریاست اپنے باشندوں کی اکثریت اور سرحدوں کے ساتھ ملاپ کی بنا پر پاکستان یا ہندستان کے ساتھ الحاق کریں گی۔ پٹیل نے کہا کہ پاکستان کشمیر کو لے لے اور حیدر آباد دکن کا مطالبہ چھوڑ دے جہاں پر ہندو آبادی کی اکثریت تھی اور جس کا پاکستان کے ساتھ زمینی یا سمندری ذریعہ سے کوئی اتصال بھی نہ تھا۔ یہ پیغام دینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن گورنمنٹ ہاؤس میں آرام کرنے چلا گیا۔

میں کشمیر آپریشن کا مکمل نگراں تھا۔ میں نے لیاقت علی خاں کے پاس جا کر انہیں تجویز دی کہ ہندستان کی فوج جو کشمیر میں داخل ہو چکی ہے ہم قبائلیوں کی مدد سے اس کو باہر نکالنے اور کشمیر کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ یہاں تک کہ ہماری اس وقت کی فوج بھی اس کامیابی کے حصول میں شاید مددگار ثابت نہ ہو سکے گی۔ لہذا ہمیں سردار پٹیل کی پیشکش کو ٹھکرانا نہیں چاہئے۔ نواب زادہ نے میری جانب مڑ کر کہا "سردار صاحب، کیا میں پاگل ہو گیا ہوں کہ میں کشمیر کے پہاڑوں اور ٹیلوں کے بدلے ریاست حیدر آباد دکن کو چھوڑ دوں جو پنجاب سے بھی بڑی ریاست ہے"

پرائم منسٹر کے اس ردعمل کو دیکھ کر میں تو سن ہو گیا کہ ہمارا وزیر اعظم ملکی جغرافیہ سے اتنا بے خبر تھا۔ اس کی ذہانت کا یہ معیار کہ وہ حیدر آباد دکن کو کشمیر پر ترجیح دے رہا ہے۔ یہ تو احمقوں کی جنت میں رہنے والی بات تھی۔ حیدر آباد کا حصول ایک سراب تھا جب کہ کشمیر اپنے آپ مل رہا تھا۔ کشمیر کی پاکستان کے ساتھ اہمیت سے وہ قطعی واقف نہیں تھے۔ چنانچہ احتجاج کے طور پر میں نے کشمیر آپریشن کی نگرانی سے استعفیٰ دے دیا (صفحہ ۲۳۱۔۲۳۲)

سردار شوکت حیات خاں کا یہ بیان اس دردناک حقیقت کی ایک واضح مثال ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلم لیڈر کس طرح مذکورہ مثل کا شکار ہوئے ہیں۔ وہ ممکن اور ناممکن کے فرق کو سمجھ نہ سکے۔ وہ

نہ ملنے والی چیز کو پانے کے لئے دوڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملنے والی چیز بھی ان سے کھوئی گئی اور نہ ملنے والی چیز تو سرے سے ملنے والی ہی نہ تھی۔

۲۔ اب اس نوعیت کی ایک اور مثال لیجئے۔ اس مثال کا تعلق ۱۹۴۷ سے پہلے کے دور سے ہے جب کہ برصغیر ہند میں انگریزوں کا سیاسی اقتدار قائم تھا۔ اس مثال کو اردو ہفت روزہ الجمعیۃ سے لے کر یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جمعیۃ علماء ہند کے اجلاس امروہہ (۳۔۵ مئی ۱۹۳۰ء) سے کچھ روز قبل وائسرائے ہند کی کونسل کے ایک ذمہ دار ممبر سر میاں فضل حسین مرحوم نے سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی کو بلا کر یہ پیش کش کی کہ آپ جمعیۃ علماء کے اجلاس امروہہ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کی تجویز پاس نہ ہونے دیں۔ میں حکومت برطانیہ سے مقبرہ صفدر جنگ اور اس سے ملحقہ جائداد بمعہ اراضی جمیعۃ علماء ہند کے علمی کاموں کے لئے دلوادوں گا۔ حضرت مولانا نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں فرمایا ''میاں صاحب! تمام علماء کرام وزعماء عظام مجھے بے وقوف نہیں بنائیں گے کہ ہم پورے ملک کو حاصل کرنے کی تجویز پاس کر رہے ہیں اور تم صرف ایک مقبرہ وہ بھی مسلمانوں کی وقف ملکیت پر فیصلہ کر رہے ہو۔ مولانا کے جواب سے میاں صاحب موصوف کو بہت مایوسی ہوئی۔ یہ واقعہ حضرت مولانا نے راقم الحروف سے خود بیان فرمایا تھا۔ (جمعیۃ علماء ہند کا پچاس سالہ عہد، از شیخ عبدالحق پراچہ دہلوی ناظم اعلیٰ جمعیۃ علماء صوبہ دہلی، مطبوعہ الجمعیۃ ویکلی، دہلی، ۲ جنوری ۱۹۷۰ء، صفحہ ۸)

۱۹۳۰ء کے اس واقعہ کو اب ۷۵ سال کے بعد کے حالات کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس معاملہ میں وہی صورت پیش آئی جس کا ذکر مذکورہ عوامی مثل میں کیا گیا ہے، پچھتر سال پہلے کے رہنماؤں کو ایک نہایت قیمتی موقع کسی کوشش کے بغیر مل رہا تھا مگر وہ اس قیمتی موقع سے صرف اس لئے فائدہ نہ اٹھا سکے کہ ان کے ذہن میں ایک بہت بڑی چیز بسی ہوئی تھی۔ اگر چہ حقیقتِ واقعہ کے اعتبار سے وہ چیز انہیں ملنے والی ہی نہ تھی۔

انگریزوں کی مذکورہ پیش کش اپنے امکانات کے اعتبار سے وہی اہمیت رکھتی تھی جس کی پیش

کش مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانہ میں انگریز تاجر کو کی گئی۔ اور اس نے اس کو فوراً قبول کر لیا۔ پچھتر سال پہلے کے مسلم رہنما اگر انگریز کی مذکورہ پیش کش کو قبول کر لیتے اور اس کو علمی اور تعلیمی اور دعوتی مرکز بنا دیتے تو اس کے نتائج اتنے دور رس نکلتے کہ شاید تاریخ کا نقشہ ہی کچھ دوسرا ہوتا۔

اوپر جو دو مثالیں پیش کی گئیں یہی موجودہ زمانہ کے تقریباً تمام مشہور رہنماؤں کے ساتھ پیش آیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے لئے کام کے عظیم مواقع موجود تھے۔ مگر تقریباً ہر ایک کا یہ حال ہوا کہ وہ ناممکن کو نشانہ بنا کر اس کی طرف دوڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ممکن کو بھی حاصل نہ کر سکا اور ناممکن تو حاصل ہونے والا ہی نہ تھا۔

مثلاً سید جمال الدین افغانی کو ترکی کی عثمانی سلطنت نے کام کے عظیم مواقع دیے مگر جمال الدین افغانی خود عثمانی سلطنت کی جڑ اکھاڑنے پر تل گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں ترکی کو چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا، مصر کے سید قطب کو وزارت تعلیم بہت چھوٹی چیز لگی۔ وہ خود ناصر کے سیاسی اقتدار کو ختم کرنے کے درپے ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں چھوٹی چیز اور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہونا پڑا۔

یہی معاملہ پاکستان میں سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ پیش آیا۔ وہاں کے سابق حکمراں صدر محمد ایوب خاں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے ساتھیوں کو یہ پیش کش کی کہ وہ حکومت کے مکمل تعاون سے پاکستان میں بڑے پیمانہ پر ایک نیشنل یونیورسٹی بنائیں اور اس کے ذریعہ وہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت پر کام کریں۔ مگر دوبارہ یہی ہوا کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کو مذکورہ پیش کش چھوٹی معلوم ہوئی۔ انہوں نے پوری حکومت پر قبضہ کرنے کی دھنوادھار تحریک شروع کر دی مگر تمام کوششوں کے بعد آخرکار جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ وہ چھوٹی چیز اور بڑی چیز دونوں ہی سے محروم ہو کر رہ گئے۔

یہی موجودہ زمانہ کے اکثر مسلم رہنماؤں کی کہانی ہے۔ وہ اپنی خیالی امنگوں میں اتنا گم ہوئے کہ انہیں حقائق وواقعات کی خبر نہ ہو سکی۔ وہ بڑے بڑے نشانوں کو اپنا مقصد بنا کر ان کی طرف دوڑتے رہے، حالانکہ یہ نشانے سرے سے ان کے لئے قابل حصول ہی نہ تھے۔ اور جو چیز ان کے لئے حالات کے اعتبار سے قابل حصول تھی وہ انہیں دکھائی ہی نہ دی۔ اسی غیر حقیقت پسندانہ مزاج کا نتیجہ ہے کہ ان

مشہور رہنماؤں نے صرف ناکام اقدامات کی مثالیں قائم کیں، وہ کامیاب اورنتیجہ خیز اقدام کی مثال قائم نہ کرسکے۔ زیادہ کو پانے کی کوشش میں وہ تھوڑے سے بھی محروم رہے۔

مسلم رہنماؤں کی اس بھیانک غلطی کا سبب یہ تھا کہ تھوڑے کو وہ صرف تھوڑا سمجھے، وہ تھوڑے کو زیادہ کے روپ میں نہ دیکھ سکے۔ وہ زندگی کے اس راز سے نا آشنا رہے کہ عمل کا آغاز ہمیشہ تھوڑے سے کیا جاتا ہے، زیادہ سے عمل کا آغاز ممکن نہیں، جو آدمی اس راز کو سمجھ لے وہ تھوڑے سے شروع کرکے آخر کار زیادہ تک پہنچ جائے گا۔ اور جو شخص اس راز کو نہ سمجھے وہ اپنے غیر حقیقت پسندانہ مزاج کی بنا پر اپنے عمل کا نقطۂ آغاز ہی نہ پائے گا۔ اس دنیا کا قانون یہ ہے کہ جو آدمی اپنے سفر کا نقطۂ آغاز پالے وہ کبھی نہ کبھی اپنی منزل تک پہنچ جائے گا، اور جو آدمی اپنے سفر کا نقطۂ آغاز نہ پائے وہ کبھی اپنی منزل تک نہ پہنچے گا خواہ وہ ساری عمر بے فائدہ دوڑ دھوپ کرتا رہے ـــــ زندگی کے اسی اصول کا نام دینی اصلاح میں قناعت ہے اور قناعت بلاشبہہ ہر قسم کی انفرادی اور اجتماعی کامیابیوں کا واحد راز ہے۔

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں معمولی لفظی فرق کے ساتھ آئی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ۔ الترمذی، کتاب الزھد۔ مسند احمد بن حنبل، وغیرہ۔ مسند احمد کے الفاظ یہ ہیں: **أن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال قد أفلح من أسلم رزق كفافاً و قنعه الله بما أتاه** (مسند أحمد ۲/ ۱۶۸) یعنی اس شخص نے فلاح پائی جس نے اسلام قبول کیا اور اس کو بقدر ضرورت رزق ملا اور اللہ نے اس کو اس پر قناعت دی جو اس کو اس نے دیا۔

اس حدیث کو عام طور پر انفرادی معنوں میں اور معاشی مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ مگر وہ اس سے بہت زیادہ وسیع ہے، اس حدیث کا پورا مطلب یہ ہے کہ افراد یا قوموں کو موجودہ زمانہ میں جو کچھ ملے یا حالات کے اعتبار سے جو ان کے لئے ممکن ہو اس کو وہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرلیں، اس پر راضی رہتے ہوئے وہ اپنا عمل شروع کردیں۔ اس کا پہلا فائدہ یہ ہوگا کہ وہ ملے ہوئے کو پانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ ان کو حال میں حاصل نہیں، وہ ان کی منصوبہ بند جدوجہد کے نتیجہ میں مستقبل میں حاصل ہوجائے۔

امن عالم

نظریۂ امن

Ideology of Peace

امن کیا ہے

اہلِ علم امن کی تعریف عدم جنگ (absence of war) کے الفاظ میں کرتے ہیں۔ فنّی اعتبار سے یہ تعریف بالکل درست ہے۔ کسی سماج میں جب تشدد اور جنگ نہ ہو تو اس کے بعد وہاں جو صورت حال پیدا ہوگی اسی کا نام امن ہے۔ جب بھی انسانوں کے درمیان جنگ اور تشدد کی حالت نہ ہو تو اُس کے بعد امن کی حالت اپنے آپ قائم ہو جائے گی۔

تاہم کسی سماج میں امن کی حالت قائم ہونا سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہے کہ وہاں جنگ اور تشدد کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ اور تشدد کا ختم ہونا اس معاملہ کا سلبی پہلو ہے۔ اس کا ایجابی پہلو یہ ہے کہ جب بھی کسی سماج کے اندر حقیقی معنوں میں امن کی حالت قائم ہو جائے تو اُس کے بعد لازماً ایسا ہوگا کہ لوگوں کے اندر مثبت سرگرمیاں جاری ہو جائیں گی۔ ہر آدمی یکسوئی کے ساتھ اپنی زندگی کی تعمیر میں لگ جائے گا۔

کسی سماج کے اندر امن کا قائم ہونا ایسا ہی ہے جیسے دریا کے سامنے سے بَند کو ہٹا دیں۔ انسانی زندگی، بہتے دریا کی مانند، خود اپنے زور پر رواں دواں ہونا چاہتی ہے۔ وہ صرف اُس وقت رُکتی ہے جب کہ اُس کے سامنے کوئی مصنوعی رکاوٹ کھڑی کر دی جائے۔ رُکاوٹ نہ ہو تو خود فطرت کے زور پر زندگی کی تمام سرگرمیاں جاری ہو جائیں گی۔

جنگ و تشدد کی حیثیت زندگی کے عمل میں رُکاوٹ کی مانند ہے۔ اور امن اپنے نتیجہ کے اعتبار سے یہ ہے کہ زندگی کی دوڑ کے تمام راستے آخری حد تک کھول دیئے گئے ہوں۔

امن کا مطالعہ عام طور پر جنگ کے حوالہ سے کیا جاتا ہے۔ مگر یہ امن کا بہت محدود مفہوم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امن کا تعلق پوری انسانی زندگی سے ہے۔ امن اپنے آپ میں ایک مکمل

آئیڈیالوجی ہے۔ امن شاہ کلید (master key) ہے جس سے ہر کامیابی کا دروازہ کھلتا ہے۔ امن ہر کام کی کامیابی کے لیے موافق ماحول بناتا ہے۔ امن کے ساتھ ہر کام کیا جاسکتا ہے۔ اور امن کے بغیر کسی بھی کام کو کرنا ممکن نہیں۔ یہ بات چھوٹے معاملات کے لیے بھی درست ہے اور بڑے معاملات کے لیے بھی۔

کائنات کا مذہب امن ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۳۶ میں ارشاد ہوا ہے: **لاالشمس ینبغی لھا ان تدرك القمر و لا الیل سابق النھار، و کل فی فلكٍ یسبحون** (یٰس ۴۰)۔ یعنی نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو پکڑ لے اور نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے۔ اور سب ایک ایک مدار (orbit) میں تیر رہے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں ایک فلکیاتی واقعہ کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ دنیا کا نظام کس اصول پر قائم ہے۔ وہ امن کا اصول ہے۔ کائنات کے اندر ان گنت چیزیں ہیں۔ یہاں کی ہر چیز مسلسل حرکت میں ہے۔ مگر کسی چیز کا دوسری چیز سے ٹکراؤ نہیں ہوتا۔ کائنات کا ہر جزء اپنے اپنے دائرہ میں اپنا عمل انجام دیتا ہے۔ یہاں کا کوئی جزء کسی دوسرے جزء کے دائرہ کار میں داخل نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک کا دوسرے سے ٹکراؤ بھی نہیں ہوتا۔

یہی امن کلچر انسان سے بھی مطلوب ہے۔ انسان کو بھی یہی کرنا ہے کہ وہ کائنات کے اس ہمہ گیر اُصول کو اپنی زندگی میں اپنالے، وہ بھی ٹکراؤ کے راستہ کو چھوڑ کر امن کے راستہ پر چلنے لگے۔

کائنات کا کلچر امن کلچر ہے۔ اسی امن کا یہ نتیجہ ہے کہ کائنات اربوں سال سے چل رہی ہے مگر اس میں کوئی ٹکراؤ پیش نہیں آیا جو اُس کے نظام میں خلل ڈال دے۔ کائنات میں اگر تشدد کلچر کا رواج ہوتا تو اب تک کائنات آپس میں ٹکرا کر تباہ ہو چکی ہوتی۔ وہ ہمارے لیے قابل رہائش دنیا کے طور پر موجود ہی نہ ہوتی۔

جس خالق نے کائنات کو پیدا کیا ہے اُسی نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے۔ خالق کو مطلوب ہے کہ اُس نے وسیع تر کائنات میں جو امن کلچر قائم کر رکھا ہے، انسان بھی اُسی امن کلچر کو اپنائے، صرف اس

فرق کے ساتھ کہ یہ امن کلچر بقیہ کائنات میں فطرت کے زور پر قائم ہے۔ انسان ایک آزاد مخلوق ہے۔ انسان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اس امن کلچر کو خود اپنے ارادہ اور اپنے فیصلہ کے تحت اپنی زندگی میں اختیار کرے۔

قرآن ایک کتاب امن

قرآن بلاشبہہ امن کی ایک کتاب ہے، وہ جنگ اور تشدد کی کتاب نہیں۔ قرآن کے تمام بیانات براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن سے متعلق ہیں۔ قرآن کا پہلا جملہ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' ہے جس کے معنٰی یہ ہیں کہ اللہ نہایت مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس خدا نے یہ کتاب بھیجی ہے اُس کی سب سے بڑی صفت رحمت ہے۔ اور یہ کتاب خدا کی اسی صفتِ رحمت کا اظہار ہے۔

قرآن کی تمام آیتیں براہ راست یا بالواسطہ طور پر امن کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ قرآن کی کُل آیتوں کی تعداد ٦٦٦٦ ہے۔ ان میں بمشکل چالیس آیتیں ایسی ہیں جو قتال (جنگ) کے حکم کو بیان کرتی ہیں۔ یعنی ایک فیصد سے بھی کم آیتیں۔ زیادہ متعین طور پر کُل آیتوں کے مقابلہ میں صرف اعشاریہ چھ فیصد (0.6 percent)۔

جو لوگ قرآن کو خدا کی کتاب مانتے ہیں وہ قرآن کے حقیقی مومن صرف اُس وقت قرار پائیں گے جب کہ وہ قرآن کی اس تعلیم کی پیروی کرتے ہوئے مکمل طور پر امن پسند بن جائیں۔ وہ کسی حال میں بھی تشدد کا رویہ اختیار نہ کریں۔

یہاں یہ اضافہ کرنا ضروری ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اسلام اور مسلمان کے درمیان فرق کریں۔ وہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام کی تعلیم کا نام نہ دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے عمل کو اسلام کے معیار سے جانچا جائے گا، نہ یہ کہ اسلام کو مسلمانوں کے عمل سے سمجھا جانے لگے۔ اسلام ایک نظریہ ہے۔ مسلمان اُسی وقت مسلمان ہیں جب کہ وہ اسلامی تعلیمات کی پیروی کریں۔ جو لوگ اسلامی تعلیمات کو چھوڑ دیں اُن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، خواہ بطور خود وہ اپنے آپ کو اسلام کا چیمپین بتاتے ہوں۔

امن اور تشدد کا فرق

امن ایک منصوبہ بند عمل ہے، اور تشدد صرف بھڑک کر جارحانہ کارروائی کرنے کا نام ہے۔ امن پسند آدمی پہلے سوچتا ہے اور اس کے بعد وہ عمل کرتا ہے۔ تشدد پسند آدمی پہلے کرڈالتا ہے، اس کے بعد وہ سوچتا ہے۔ پُر امن عمل میں پہلے بھی اُمید ہے اور آخر میں بھی اُمید۔ اور پُر تشدد عمل میں پہلے فرضی اُمید ہے اور آخر میں صرف مایوسی۔

امن پسند آدمی سچائی پر کھڑا ہوتا ہے اور پُر تشدد آدمی جھوٹ پر۔ امن کا راستہ شروع سے آخر تک ایک کھُلا ہوا راستہ ہے، اور تشدد کا راستہ رکاوٹوں سے بھرا ہوا راستہ۔ امن میں تعمیر ہی تعمیر ہے اور تشدد میں تخریب ہی تخریب۔ امن پسند انسان دوسروں کی محبت میں جیتا ہے اور تشدد پسند انسان دوسروں کی نفرت میں۔ امن پسندی کا خاتمہ کامیابی پر ہوتا ہے اور تشدد پسندی کا خاتمہ شرمندگی پر۔

امن پسندی میں کوئی کام بگڑتا نہیں اور ہر کام بن جاتا ہے۔ تشدد پسندی میں کوئی کام بنتا نہیں اور ہر کام بگڑ جاتا ہے۔ امن کا طریقہ انسانیت کا طریقہ ہے اور تشدد کا طریقہ حیوانیت کا طریقہ۔ امن کا عمل قانون کے دائرہ میں ہوتا ہے اور تشدد کا عمل لاقانونیت کے دائرہ میں۔

امن پسند آدمی مسائل کو نظر انداز کر کے مواقع کو استعمال کرتا ہے اور تشدد پسند آدمی مواقع کو غیر استعمال شدہ حالت میں چھوڑ کر مسائل کے خلاف بے فائدہ لڑائی لڑتا رہتا ہے۔ امن کا عمل پیار و محبت کا باغ اُگاتا ہے اور تشدد کا عمل نفرت اور دشمنی کا جنگل اُگاتا ہے۔ امن کلچر فرشتوں کا کلچر ہے اور تشدد کلچر شیطانوں کا کلچر۔

امن میں خدا کے حقوق بھی ادا ہوتے ہیں اور انسان کے حقوق بھی۔ اور تشدد میں انسان کے حقوق کی بھی خلاف ورزی ہوتی ہے اور خدا کے حقوق کی بھی خلاف ورزی۔ امن اگر جنت ہے تو تشدد اُس کے مقابلہ میں دوزخ۔

امن اور جنگ دونوں 7 ں نہیں۔ امن کسی انسان کے لیے ایک سچا انتخاب (choice) ہے۔ اور جنگ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی سچے انتخاب کو نہ پاسکا، وہ انتخاب کے ٹیسٹ میں ناکام ہوگیا۔

دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اگر چہ عملاً موجود ہیں مگر وہ امتحان کے لیے ہیں، وہ مطلوب چیز کے طور پر نہیں۔ مثلاً شراب دنیا میں موجود ہے۔ مگر شراب اس لیے نہیں ہے کہ کوئی آدمی اُس کو استعمال کرے۔ بلکہ شراب اس لیے ہے کہ آدمی اُس سے بچ کر یہ ثابت کرے کہ وہ اچھے اور بُرے کی تمیز رکھتا تھا، وہ ایک محتاط انسان تھا۔ یہی معاملہ جنگ کا بھی ہے۔ جنگ کا طریقہ اگر چہ بظاہر قابل استعمال ہے مگر کسی انسان کے لیے اعلیٰ روش یہی ہے کہ وہ جنگ کے طریقہ کو استعمال نہ کرے۔

قدیم زمانہ میں جو حالات تھے اُن میں دفاع کے لیے جنگ کی اجازت دی گئی تھی۔ مگر یہ اجازت قانونِ ضرورت (law of necessity) کے تحت تھی۔ اب نئے حالات میں یہ ضرورت باقی نہیں رہی، اس لیے اب جنگ کی بھی ضرورت نہیں۔

صلح بہتر ہے

قرآن میں فطرت کے ایک قانون کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **والصلح خیر** (النساء ۱۲۸) یعنی صلح بہتر ہے۔ صلح کا مطلب مصالحت (reconciliation) ہے۔ صلح کا عمل ہمیشہ دو فریقوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جب دو فریقوں کے درمیان کسی معاملہ پر نزاع ہو جائے تو ایک طریقہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں متشددانہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرلیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فوراً سمجھوتہ کر کے نزاعی حالت کو ختم کر دیا جائے۔

تاہم بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ یہ مصالحت دونوں فریقوں کی 7 ں خواہش کے مطابق ہو۔ بیشتر حالات میں یہ مصالحت یک طرفہ بنیاد پر ہوتی ہے، یعنی ایک فریق اپنی خواہش کو پیچھے رکھ کر دوسرے فریق کی خواہش پر معاملہ ختم کرنے کے لیے راضی ہو جائے۔

اس قسم کی یک طرفہ مصالحت کو بہتر کیوں کہا گیا۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ نزاع کی حالت تعمیری عمل کو روک دیتی ہے۔ مصالحت پر راضی ہونے کا فائدہ آدمی کو یہ ملتا ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی طاقت کا کوئی حصہ غیر ضروری ٹکراؤ میں ضائع کیے بغیر اپنی تعمیری جدوجہد کو جاری رکھے۔ غیر مصالحانہ طریقہ ہر حال میں نقصان کا طریقہ ہے۔ اور مصالحانہ طریقہ ہر حال میں فائدہ کا طریقہ۔

انسانی تاریخ بتاتی ہے کہ کسی فرد یا گروہ نے جب بھی کوئی کامیابی حاصل کی ہے تو اُس نے یہ کامیابی مصالحانہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد حاصل کی ہے۔ٹکراؤ اور لڑائی کا طریقہ اختیار کر کے اس دنیا میں حقیقی کامیابی کبھی کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔صلح کی یہ اہمیت اس لیے ہے کہ صلح میں آدمی کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ حاصل شدہ مواقع کو بھر پور طور پر اپنے حق میں استعمال کرے جب کہ ٹکراؤ کے طریقہ میں یہ ہوتا ہے کہ ساری طاقت دوسروں کی تخریب میں ضائع ہو جاتی ہے۔تعمیر کا کوئی کام سِرے سے انجام نہیں پاتا۔حالانکہ ترقی کا راز اپنی تعمیر واستحکام میں ہے، نہ کہ مفروضہ دشمن کو برباد کرنے میں۔

فساد فی الارض نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں ایک کردار کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **واذا قیل لهم لاتفسدوا فی الأرض قالوا انما نحن مصلحون** (البقرہ ۱۱)۔یعنی جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ تم زمین میں فساد نہ کرو تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے لوگ ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں جس کردار کا ذکر ہے اُس سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر ایک اصلاحی مقصد کے لیے سرگرم ہوں، مگر اُن کا طریقہ درست نہ ہو۔اُن کا طریقہ ایسا ہو جو عملاً فساد اور بگاڑ پیدا کرنے والا ہے۔ یہاں فساد سے مراد یہ ہے کہ اُن کے طریقہ کے نتیجے میں لوگوں میں باہمی ٹکراؤ پیدا ہو۔لوگ ایک دوسرے سے نفرت کرنے لگیں۔لوگوں کے اندر اخلاقی احساس کمزور ہو جائے۔لوگوں کے اندر منفی نفسیات پیدا ہوں۔اس قسم کی تمام چیزیں فساد فی الأرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کیوں کہ اس سے سماجی امن ختم ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ لڑائی اور ٹکراؤ کی نوبت آجاتی ہے۔

قرآن کی اس تعلیم سے معلوم ہوا کہ کسی عمل کے درست ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ بظاہر وہ ایک اچھے مقصد کے لیے شروع کیا گیا ہو۔اسی کے ساتھ لازمی طور پر یہ دیکھنا ہوگا کہ اصلاح کے نام پر کی جانے والی سرگرمیاں کس قسم کا نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔اگر وہ لوگوں کے درمیان نفرت اور تناؤ اور لڑائی جیسی چیزیں پیدا کریں تو بظاہر اصلاح کا نام لینے کے باوجود اُن کی سرگرمیاں مفسدانہ سرگرمیاں ہی کہی جائیں گی۔ایسے لوگ انسانیت کے مجرم قرار پائیں گے، نہ کہ انسانیت کے مصلح اور خادم۔

کوئی بھی اصلاحی کام صرف اُس وقت اصلاحی کام ہے جب کہ وہ امن اور انسانیت کے دائرہ میں کیا جائے۔ اصلاح کے نام پر کیا جانے والا ہر وہ کام غلط ہے جو سماجی امن کو درہم برہم کرے۔ جس کے نتیجہ میں جان اور مال کی تباہی ظہور میں آئے۔ اصلاح کو اپنے نتیجہ کے اعتبار سے بھی اصلاح ہونا چاہیے۔ جو اصلاح اپنے نتیجہ کے اعتبار سے فساد ہو وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بھی فساد ہے، خواہ اُس کو کتنا ہی زیادہ خوب صورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہو۔

سازش کا خاتمہ

قرآن کی سورہ نمبر ۳ میں ارشاد ہوا ہے: اگر تم صبر کرو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو اُن کی کوئی سازش تم کو ہرگز نقصان نہ پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰)۔ قرآن کی اس آیت میں زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ دنیا میں کسی فرد یا گروہ کے لیے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اُس کے کچھ دشمن ہوں جو اُس کے خلاف سازش کر رہے ہیں۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ اُس فرد یا گروہ کے اندر وہ صبر اور وہ محتاط روش موجود نہیں جو ہر سازش کو یقینی طور پر ناکام بنا سکتی ہے۔

موجودہ دنیا میں سازش کی حیثیت اگر بارش کی ہے تو صبر وتقویٰ کی حیثیت پختہ چھت کی۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ بارش صرف اُن لوگوں کے لیے مسئلہ ہے جنہوں نے اپنے لیے پختہ چھت نہ بنائی ہو۔ جن کے پاس پختہ چھت ہو، اُن کے لیے بارش کا مسئلہ کوئی حقیقی مسئلہ نہیں۔

موجودہ دنیا کا نظام مسابقت (competition) کے اصول پر بنا ہے، اس لیے یہاں فطری طور پر ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق اور دوسرے فریق کے درمیان رقابت قائم ہو جاتی ہے جو بڑھ کر سازش تک پہنچ جاتی ہے۔ جب بھی کسی کے خلاف ایسی صورت حال پیدا ہو تو اُس کو دشمن کی سازش کے بجائے فطرت کے ایک قانون کا اظہار سمجھنا چاہیے۔ سازش کو دشمن کی کارروائی سمجھنا آدمی کو تشدد کی طرف لے جاتا ہے۔ اور سازش کو فطرت کے قانون کا نتیجہ سمجھنا آدمی کے اندر یہ ذہن پیدا کرتا ہے کہ وہ حسن تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو اس کی زد سے بچائے، ٹھیک اُسی طرح جیسے ایک شخص بارش کے مقابلہ میں احتجاج نہیں کرتا بلکہ اس سے بچنے کے لیے گھر اور چھت کا انتظام کرتا ہے۔

شدت پسندی نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۴ میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: **لاتغلوا فی دینکم** (النساء ۱۷۱) یعنی تم اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ یہی بات حدیث میں بھی آئی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ایاکم والغلو فی الدین، فانما هلك من كان قبلكم بالغلو فی الدین** ۔(النسائی، کتاب المناسک، ابن ماجہ، کتاب المناسک، مسند احمد ۱/ ۲۱۵، ۳۴۷) یعنی تم لوگ دین میں غلو سے بچو، کیوں کہ پچھلی امتیں دین میں غلو کی وجہ سے ہلاک ہوگئیں۔

غلو کا مطلب شدت یا انتہا پسندی (extremism) ہے۔ غلو ہر معاملہ میں غلط ہے۔ غلو دین کی اصل روح کے خلاف ہے۔ غلو کا یہی مزاج بڑھ کر تشدد اور لڑائی تک پہنچ جاتا ہے۔ جو لوگ غلو کی نفسیات کا شکار ہوں وہ اپنے مخصوص مزاج کی بنا پر اعتدال کی روش پر قانع نہیں ہوتے۔ وہ امن اور اعتدال کی روش کو معیار سے کم سمجھتے ہیں اس لیے وہ نہایت آسانی کے ساتھ تشدد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ وہ مقصد کے حصول کے نام پر لڑائی شروع کر دیتے ہیں۔

غلو کی ضد اعتدال ہے۔ جب لوگوں کے اندر اعتدال کی نفسیات ہو تو وہ ہمیشہ امن کے انداز میں سوچیں گے، وہ اپنی جدوجہد کو پر امن جدوجہد کے طور پر چلائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ اعتدال اور امن دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت گہرائی سے جڑے ہوئے ہیں۔ جہاں اعتدال ہوگا وہاں امن ہوگا۔ جہاں امن ہوگا وہاں اعتدال پایا جائے گا۔

اس کے برعکس غلو کی نفسیات ہمیشہ آدمی کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتی ہے، اور انتہا پسندی نہایت آسانی کے ساتھ تشدد اور ٹکراؤ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ غلو اور تشدد دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین میں غلو کو بہت زیادہ ناپسند کیا گیا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ غلو پسندی کا دوسرا نام تشدد پسندی ہے۔ اور غلو نہ کرنے کا دوسرا نام اعتدال پسندی۔

ایک انسان کا قتل ساری دنیا کا قتل

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ارشاد ہوا ہے: **من قتل نفساً بغیر نفسٍ اوفسادٍ فی الأرض**

فکأنما قتل الناس جمیعا (المائدہ ۳۲)۔یعنی جو شخص کسی کو قتل کرے، بغیر اس کے کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہو یا زمین میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اُس نے سارے آدمیوں کو قتل کر ڈالا۔

قتل ایک انتہائی بھیانک عمل ہے۔ کسی فرد کو قتل کرنا صرف اُس وقت جائز ہے جب کہ وہ سماجی امن کے لیے ناقابلِ علاج خطرہ بن گیا ہو۔ حقیقی وجہ جواز کے بغیر کسی ایک انسان کو قتل کرنا بھی سارے انسانوں کو قتل کرنے کے برابر ہے۔ کیوں کہ اس سے احترام جان کی روایت ٹوٹتی ہے۔ ایک انسان کو ناحق قتل کرنا بظاہر ایک آسان فعل دکھائی دینے لگتا ہے۔

شراب کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ: مااسکر کثیرہ فقلیلہ حرام (جس چیز کی زیادہ مقدار نشہ کرے اس چیز کی تھوڑی مقدار بھی حرام ہے)۔ یہی معاملہ قتل کا بھی ہے۔ بہت سے انسانوں کو قتل کرنا جتنا بھیانک ہے اُتنا ہی بھیانک ایک انسان کو قتل کرنا بھی ہے۔ دونوں کے درمیان فرق صرف ڈگری کا ہے، نوعیت کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

قرآن کی اس آیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں امن وسلامتی کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ اگر کسی سماج میں ایک شخص کو قتل کر دیا جائے تو پورا کا پورا سماج اُس پر تڑپ اٹھے۔ سماج میں دوبارہ امن وسلامتی کی حالت کو قائم کرنے کے لیے اس اہتمام کے ساتھ کام کیا جائے جیسے کہ کسی نے ایک فرد کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اُس نے پوری انسانیت پر حملہ کر دیا ہے۔

تشدد کی آگ کو بجھانا

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں ارشاد ہوا ہے: کلما اوقدوا ناراً للحرب أطفأها الله (المائدہ ۶۴) یعنی جب بھی وہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں تو اللہ اس آگ کو بُجھا دیتا ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خالق کا منصوبہ موجودہ دنیا کے بارے میں کیا ہے۔ یہ منصوبہ امن کے اصول پر مبنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی ایک فریق لڑائی کی آگ بھڑکانے پر آمادہ ہو تو دوسرے فریق کو چاہئے کہ وہ پُر امن تدبیر سے اُس کو بجھا دے تا کہ تشدد کی آگ پھیلنے نہ پائے۔ ایسا کبھی نہیں ہونا چاہئے کہ ایک فریق اگر بم مارے تو دوسرا فریق جوابی بم سے اُس کا مقابلہ

کرے۔ خدا کی اس زمین پر جینے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ ایک بم کے اوپر دوسرا بم مارا جائے۔ صحیح اور مطلوب طریقہ یہ ہے کہ بم کو ناکارہ (defuse) کر دیا جائے۔

یہ خدائی اعلان بتاتا ہے کہ ایک بم کے اوپر دوسرا بم مارنا شیطان کا طریقہ ہے۔ اس کے برعکس خدا کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ بم کو غیر مؤثر بنا دیا جائے، بم کو اُس کے پہلے ہی مرحلہ میں ناکارہ کر دیا جائے تاکہ امن کا ماحول بگڑنے سے بچ جائے۔

سماج میں ناخوش گوار حالات کا پیش آنا بالکل فطری ہے۔ کوئی انسانی سماج ناخوش گوار باتوں سے خالی نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں مسئلہ کا اصل حل یہ نہیں ہے کہ خود ناخوش گواری کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ اس مسئلہ کا اصل حل یہ ہے کہ ایک ناخوش گواری پر دوسری ناخوش گواری کا اضافہ نہ کیا جائے۔ ایک بم کے اوپر دوسرا بم نہ مارا جائے۔ اس طرح ناخوش گواری کو پھیلنے سے روک کر اُس کو ختم کر دیا جائے۔ یہی اس مسئلہ کا حل ہے، اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی دوسرا حل ممکن نہیں۔

اصلاح کے بعد فساد

قرآن کی سورہ نمبر ۷ میں ارشاد ہوا ہے: **ولا تفسدوا فی الأرض بعد اصلاحها، ذٰلکم خیر لکم ان کنتم مؤمنین** (الأعراف ۸۵) یعنی زمین میں بگاڑ پیدا نہ کرو، بعد اس کے کہ اُس کی اصلاح کی جا چکی ہو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم یقین کرنے والے ہو۔

قرآن کی اس آیت میں ایک فطری حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ زمین جس پر انسان آباد ہے وہ اپنی تخلیق کے اعتبار سے ایک اصلاح یافتہ زمین ہے۔ یہاں کی ہر چیز اپنے مطلوب نقشہ کے مطابق، بنائی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو چاہیے کہ وہ اس زمین پر جو کام بھی کرے، فطرت کے نقشہ کو بدلے بغیر کرے۔ اگر اُس نے فطرت کے نقشہ کو بدلا تو اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قائم شدہ اصلاحی نظام ٹوٹ جائے گا اور ہر طرف بگاڑ پھیل جائے گا۔

مثلاً ہماری دنیا میں فطرت کے نظام کے تحت بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں ــــ زمین کی مسلسل گردش، سورج سے اُس کا روشن ہونا، ہواؤں کا چلنا، بارش کا ہونا، دریاؤں کا بہنا، پودوں اور درختوں کا

اُگنا، وغیرہ وغیرہ۔ زمین پر اس طرح کے بے شمار کام رات دن مسلسل جاری ہیں مگر یہ سارے کام انتہائی حد تک پُر امن طور پر ہو رہے ہیں۔ کہیں کوئی تشدد نہیں، کہیں ایک اور دوسرے کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہیں۔

یہی اصلاح کا نقشہ ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ بھی اسی نقشہ پر چلے۔ وہ تشدد اور ٹکراؤ سے مکمل طور پر پرہیز کرے۔ وہ اپنی ہر کوشش امن کے اصول پر جاری کرے۔ جو لوگ اس کے خلاف چلیں وہ یقینی طور پر زمین کے اوپر فساد برپا کریں گے، وہ کبھی زمین کے اوپر اصلاح کا نظام قائم کرنے والے نہیں۔

اعراض، نہ کہ ٹکراؤ

قرآن کی سورہ نمبر ے میں حکم دیا گیا ہے کہ: **وأعرض عن الجاهلين** (الأعراف ۱۹۹)۔ یعنی تم نادان لوگوں سے اعراض کرو۔

اعراض کا مطلب احتراز (avoidence) ہے، اعراض کا اُلٹا ٹکراؤ (confrontation) ہے۔ اعراض کا طریقہ آدمی کو پُر امن دائرہ میں محدود رکھتا ہے اور ٹکراؤ کا طریقہ اُس کو فریق ثانی کے مقابلہ میں متشددانہ کارروائی کی طرف لے جاتا ہے۔

موجودہ دنیا میں کوئی انسان یا گروہ اکیلا نہیں ہے۔ اُس کے سوا دوسرے بہت سے لوگ ہیں جو اپنے اپنے مقاصد رکھتے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا الگ ایجنڈا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا میں بار بار ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ بار بار ایک فرد اور گروہ اور دوسرے فرد اور گروہ کے درمیان کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایسی حالت میں آدمی کے لیے دو راستے ہیں ـــــــ اعراض یا ٹکراؤ، ان دو کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں۔ اب آدمی اگر ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرے تو دونوں فریقوں کے درمیان لڑائی ہوگی۔ ساری تاریخ کا تجربہ ہے کہ لڑائی سے صرف دل کی بھڑاس نکلتی ہے۔ حقیقی معنوں میں اُس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہئے کہ وہ ٹکراؤ سے ہٹ جائے اور اعراض کا طریقہ اختیار کرے۔ اعراض کا طریقہ نہ

صرف مزید نقصان سے بچاتا ہے بلکہ وہ آدمی کو یہ موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے ترقی کے سفر کو کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رکھ سکے۔ اعراض کا عمل بظاہر فریقِ ثانی کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اعراض کا مقصد خود اپنے آپ کو بے فائدہ ٹکراؤ سے بچانا ہے۔ اعراض کا مقصد یہ ہے کہ اپنے سفر کو کسی رکاوٹ کے بغیر جاری رکھا جائے۔

صبر ترقی کا راز

قرآن کی سورہ نمبر ۸ میں ارشاد ہوا ہے کہ: **واصبروا ان الله مع الصابرين** (الأنفال ۴۶) یعنی تم صبر کرو کیوں کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: **واعلم أن في الصبر على ما تكره خيرا كثيرا وان النصر مع الصبر وأن الفرج مع الكرب وان مع العسر يسرا** (مسند احمد، الجزء ۱/۳۰۷) یعنی جان لو کہ بے شک ناپسندیدہ چیز پر صبر کرنے میں تمہارے لیے بہت بھلائی ہے۔ اور کامیابی صبر کے ساتھ ہے اور کشادگی مشقت کے ساتھ ہے۔ اور مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی کے سامنے مشکل حالات آئیں یا اُس کو کوئی تلخ تجربہ پیش آئے تو وہ گھبرا اُٹھتا ہے اور بعض اوقات تشدد پر اُتر آتا ہے۔ مگر اس قسم کا ردِّ عمل فطرت سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کا قانون ہمیشہ اُن لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو حق اور انصاف پر ہوں۔ حق پرست فرد یا گروہ اگر جلد بازی نہ کرے اور صبر سے کام لے تو کامیابی اپنے آپ اُس کی طرف چلی آتی ہے۔

بیشتر حالات میں ناکامی اُن لوگوں کے حصہ میں آتی ہے جو جلد بازی سے کام لیں اور قبل از وقت پُر جوش اقدام کر بیٹھیں۔ اس کے برعکس جو لوگ صبر کا طریقہ اختیار کریں اُن کے لیے ہمیشہ ایسے اسباب پیدا ہوتے ہیں جو اُن کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیں۔

قرآن کے مطابق، صبر کا اُلٹا عجلت ہے (الاحقاف ۳۵)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص صبر کی روش اختیار کرتا ہے تو وہ فطرت کے نقشہ کی پیروی کر رہا ہوتا ہے۔ اور جب وہ عجلت کا

طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ فطرت کے نقشہ سے ہٹ جاتا ہے اور جو آدمی فطرت کے نقشہ سے ہٹ جائے اُس کے لیے خدا کی اس دنیا میں کامیابی کا حصول ممکن نہیں۔

نزاع نہیں

قرآن کی سورہ نمبر ۲۲ میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے: **فلاینازعنك فی الامر وادع الی ربك** (الحج ٦٧) یعنی وہ تم سے امر میں ہرگز نزاع نہ کریں اور لوگوں کو تم اپنے رب کی طرف بُلاؤ۔

اس آیت میں نزاع نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم اُنہیں نزاع کا موقع نہ دو۔ یعنی جب بھی تمہارے اور فریقِ ثانی کے درمیان کوئی اختلافی بات پیش آئے تو اُس کو پُر امن بات چیت کے دائرہ میں محدود رکھو۔ ایسا ہرگز نہ ہونے دو کہ اختلاف اپنی ابتدائی حد سے گذر کر عملی نزاع بن جائے۔ اور متشددانہ مقابلہ آرائی کی نوبت آ جائے۔

موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی بات پر دو فریقوں کے درمیان تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ تناؤ بذات خود ایک فطری چیز ہے۔ وہ ہر حال میں اور ہر مقام پر پیدا ہوگا۔ اصل قابل لحاظ بات یہ ہے کہ اس تناؤ یا اس اختلاف کو حد سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ اختلاف کا امن کے دائرہ میں رہنا اُس کا حد کے اندر رہنا ہے۔ اختلاف کا عملی ٹکراؤ یا تشدد کے دائرہ میں پہنچ جانا اُس کا حد سے تجاوز کرنا ہے۔ حد کے اندر کوئی بھی اختلاف بُرا نہیں، مگر حد کے باہر چلے جانے کے بعد ہر اختلاف بُرا بن جاتا ہے۔

قرآن کی اس آیت میں با مقصد انسان کا طریق عمل بتایا گیا ہے۔ ایک انسان جو ایک سنجیدہ مقصد کے لیے اُٹھا ہو، اُس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اُس کے اور دوسروں کے درمیان صرف وہی چیز زیر بحث آئے جو کہ اس کا اصل مقصد ہے۔ دونوں کے درمیان کسی اور چیز کا زیر بحث آنا با مقصد انسان کے لیے زہر کی حیثیت رکھتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ دونوں کے درمیان عدم نزاع کی یہ فضا کیسے قائم ہو۔ جواب یہ ہے کہ یہ فضا صرف اُس انسان کے یک طرفہ صبر کے ذریعہ قائم ہوسکتی ہے جو ایک مثبت مقصد اپنے ساتھ لے کر

اُٹھتا ہے۔ عملی اعتبار سے اس کے سوا کوئی اور صورت ممکن نہیں۔ با مقصد انسان کو یہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ یک طرفہ اعراض کے ذریعہ اپنے اور فریقِ ثانی کے درمیان معتدل ماحول قائم رکھے۔ تاکہ اُس کا سفر کسی توقف کے بغیر مسلسل جاری رہے۔

جنگ صرف دفاع کے لئے

قرآن کی سورہ نمبر ۲۲ میں ارشاد ہوا ہے کہ: اُذِنَ للذین یُقَاتَلون بأنهم ظُلِمُوا (الحج ۳۹) یعنی اُن لوگوں کو جنگ کی اجازت دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے، کیوں کہ وہ مظلوم ہیں۔

قرآن کی یہ آیت صرف ایک آیت نہیں وہ ایک بین اقوامی قانون کا بیان ہے۔ اس میں یہ بات طے کردی گئی ہے کہ جائز جنگ صرف وہ ہے جو واضح جارحیت کے مقابلہ میں دفاع کے طور پر لڑی جائے۔ جنگ کی ہر دوسری قسم ظلم کی حیثیت رکھتی ہے اور ظالموں کے لیے خدا کی اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں۔ اس آیت کے مطابق، دفاعی جنگ کے سوا کسی اور جنگ کے حق میں کوئی وجہِ جواز نہیں۔

قرآن کے مطابق، دفاعی جنگ بھی صرف اعلان کے ساتھ لڑی جاسکتی ہے، بلا اعلان نہیں۔ مزید یہ کہ دفاعی جنگ بھی صرف ایک قائم شدہ حکومت لڑسکتی ہے۔ غیر حکومتی افراد کو کسی بھی عذر کی بنا پر لڑائی چھیڑنے کی اجازت نہیں۔ ان تعلیمات کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ قرآن کے مقرر کیے ہوئے قانونِ جنگ کے مطابق، مجبورانہ نوعیت کی دفاعی جنگ کے سوا ہر جنگ ناجائز ہے ـــــ مثلاً گوریلا وار، پراکسی وار، بلا اعلان وار اور جارحانہ وار، یہ سب کی سب بلاشبہہ اسلام میں ناجائز ہیں۔

جنگ ایک حیوانی فعل ہے، جنگ کوئی انسانی فعل نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے ابدی قانون کے مطابق، امن ایک عموم (rule) ہے، اور جنگ صرف ایک استثناء (exception)۔ امن ہر حال میں ایک قابل اختیار چیز ہے، جب کہ جنگ صرف شدید ضرورت کے وقت اپنے بچاؤ کے لیے اختیار کی جاتی ہے، وہ بھی اُس وقت جب کہ ٹکراؤ سے اعراض کی تمام پُر امن تدبیریں ناکام ہوگئی ہوں۔

صبر کا طریقہ حمایت یافتہ طریقہ

قرآن کی سورہ نمبر ۸ میں کہا گیا ہے کہ: **واصبروا ان اللہ مع الصابرین** (الانفال ۴۶)
یعنی تم لوگ صبر کی روش اختیار کرو، بیشک اللہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو صبر کی روش اختیار کریں۔

صابرانہ طریقِ کار کو دوسرے لفظوں میں پُر امن طریقِ کار کہا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا طریقِ کار متشددانہ طریقِ کار ہے۔ مذکورہ آیت فطرت کے اس قانون کو بتاتی ہے کہ موجودہ دنیا میں جو لوگ پُر امن طریقِ کار اختیار کریں اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ فطرت کے تمام اسباب اُن کی حمایت میں مستعد ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ متشددانہ طریقِ کار اختیار کریں وہ قوانین فطرت کی تائید سے محروم ہو جاتے ہیں، اور جو لوگ قوانین فطرت کی تائید سے محروم ہو جائیں اُن کے لیے خدا کی اس دنیا میں ناکامی اور بربادی کے سوا اور کچھ نہیں۔

صبر کے طریقہ کا مطلب کیا ہے۔ صبر کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی ناخوش گوار باتوں پر اپنی برداشت نہ کھوئے۔ تا کہ اس کی مثبت سوچ درہم برہم نہ ہونے پائے۔ وہ ممکن اور ناممکن میں فرق کرے اور ممکن کو اپنا نقطۂ آغاز بنائے۔ وہ اچانک انجام کا خواہش مند نہ ہو بلکہ تدریج کا انداز اختیار کرے۔ وہ نقصان پر مایوس نہ ہو بلکہ مستقبل کے پیش نظر اپنا عمل جاری رکھے۔ جو کچھ آج ملنے والا ہے اُس کو وہ آج حاصل کرے اور جو کچھ کل ملنے والا ہے اُس کے لیے وہ انتظار کی پالیسی اختیار کرے۔ وہ اپنی خواہش کو فطرت کے قانون کے ماتحت رکھے، نہ کہ فطرت کے قانون کو اپنی خواہش کے ماتحت بنانے کی کوشش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر مکمل طور پر ایک مثبت عمل ہے، صبر کوئی سلبی یا انفعالی روش نہیں۔

پر امن نظریاتی اشاعت

قرآن کی سورہ نمبر ۲۵ میں اہل حق کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: **وجاھدھم بہ جھاداً کبیراً** (الفرقان ۵۲) یعنی تم اُن کے اوپر جہاد کرو، بڑا جہاد، قرآن کے ذریعہ۔

جیسا کہ معلوم ہے، قرآن ایک کتاب ہے، ایک نظریاتی کتاب۔ وہ کوئی تلوار نہیں۔ ایسی حالت میں قرآن کے ذریعہ جہاد کا مطلب صرف یہی ہوسکتا ہے کہ قرآن کے افکار کو لوگوں تک پہنچاؤ۔

قرآن کے پیغام کو پُر امن انداز میں لوگوں کے درمیان عام کرو۔قرآن کے نظریات کو مدلّل انداز میں بیان کر کے اُس کو لوگوں کے لیے قابلِ قبول بناؤ۔

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جس چیز کو جہاد کہا گیا ہے وہ پُر امن جدوجہد (peaceful struggle) ہے، اُس کا تشدد سے کوئی تعلق نہیں۔ جہاد کا لفظ عربی زبان میں مبالغہ آمیز کوشش کے لیے بولا جاتا ہے، یعنی بہت زیادہ محنت کرنا۔کسی مقصد کے حصول کے لیے اپنی آخری کوشش صرف کر دینا۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پُرتشدد کوشش کے مقابلہ میں پُر امن کوشش زیادہ عظیم ہے۔کوئی آدمی جب متشددانہ طریقِ کار اختیار کرے تو کوشش کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔لیکن جب وہ پر امن طریقِ کار اختیار کرے تو اُس کا دائرہ کار لامحدود حد تک بڑھا ہوا ہوتا ہے۔متشددانہ طریقِ کار میں صرف تلوار یا گن کارآمد ہے لیکن پُر امن طریقِ کار میں ہر چیز آدمی کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بن جاتی ہے، حتیٰ کہ بند کمرہ میں استعمال ہونے والا ایک قلم بھی۔

دشمن کو دوست بنانا

قرآن کی سورہ نمبر ۴۱ میں ارشاد ہوا ہے: بھلائی اور بُرائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (حٰم السجدہ ۳۴)۔

قرآن کی اس آیت میں فطرت کا ایک راز بتایا گیا ہے ــــــ وہ راز یہ ہے کہ ہر دشمن انسان کے اندر ایک دوست انسان چھپا ہوا ہے۔اس دوست انسان کو دریافت کرو۔اور پھر یہ معجزاتی واقعہ پیش آئے گا کہ جو آدمی بظاہر تمہارا دشمن دکھائی دیتا تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن جائے گا۔

اصل یہ ہے کہ دشمنی کوئی فطری چیز نہیں، وہ ایک مصنوعی ردعمل ہے۔ جب بھی کسی وجہ سے کوئی شخص بظاہر تمہارا دشمن بن جائے تو تم اُس کے ساتھ ردعمل کا طریقہ اختیار نہ کرتے ہوئے اُس کے ساتھ بہتر سلوک کرنے کی کوشش کرو، خواہ یہ بہتر سلوک تم کو مفروضہ دشمن کی اشتعال انگیز

کارروائیوں کے باوجود یک طرفہ بنیاد پر کرنا پڑے۔

تمہارا ایک طرفہ سلوک یہ کرے گا کہ وہ دشمن کے اندر پیدا ہونے والے منفی جذبات کو دبا دے گا۔ تمہارا ایک طرفہ سلوک دشمن کی سوئی ہوئی انسانیت کو جگا کر اُس کو ایک نیا انسان بنا دے گا۔ اور یہ نیا انسان وہی ہوگا جس کو قرآن میں قریبی دوست کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر پیدا ہونے والا آدمی ایک ہی مشترک فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ ہر آدمی پہلے مسٹر نیچر ہے، اُس کے بعد وہ مسٹر دشمن یا مسٹر دوست بنتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو آپ ہیں وہی آپ کا مفروضہ دشمن بھی ہے۔ اور جو آپ کا مفروضہ دشمن ہے وہی خود آپ بھی ہیں۔ اس لیے آدمی کو چاہئے کہ بظاہر دشمنی کے باوجود وہ فریقِ ثانی کے اندر اپنے مشترک انسان کو تلاش کرے۔ وہ دوسروں سے بھی وہی اُمید رکھے جو امید وہ اپنے آپ سے کیے ہوئے ہے۔

خود اپنے عمل کا نتیجہ

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں کہا گیا ہے کہ: جو مصیبت بھی تمہارے اوپر پڑتی ہے وہ صرف تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے (الشوریٰ ۳۰)

قرآن کی اس آیت میں اس حقیقت کو بتایا گیا ہے کہ موجودہ دنیا اسباب وعلل کے اصول پر قائم ہے۔ جیسے اسباب ویسا نتیجہ۔ یہ آیت یہ تعلیم دیتی ہے کہ کسی آدمی پر جب بھی کوئی مصیبت پڑے تو اُس کو چاہیے کہ اُس کا سبب وہ خود اپنے اندر دریافت کرے، نہ کہ وہ اپنے سے باہر اس کا سبب تلاش کرنے لگے۔

زندگی کی یہ حقیقت جس آدمی کے ذہن میں بیٹھ جائے وہ ایسا نہیں کرسکتا کہ کسی کو اپنی مصیبت کا ذمہ دار بتا کر اُس کے خلاف تشدد کا معاملہ کرنے لگے۔ اس کے بجائے وہ صرف یہ کرے گا کہ بے لاگ طور پر اپنی زندگی کا جائزہ لے گا۔ وہ خود اپنی غلطیوں کو دریافت کرے گا تا کہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کرکے وہ مصیبت کا شکار ہونے سے بچ جائے۔ مصیبت کا حوالہ دے کر دوسرے کے خلاف کارروائی کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض اپنے مرض کا ذمہ دار اپنے پڑوسی کو بتا کر اُس سے لڑنے لگے۔

ایک شہر جہاں کا ٹریفک ضابطہ دائیں چلو (keep right) کے اصول پر قائم ہو، وہاں اگر کوئی شخص بائیں چلو(keep left) کے اصول پر اپنی گاڑی دوڑانے لگے تو یقینی طور پر اُس کی گاڑی حادثہ کا شکار ہو جائے گی۔

یہ حادثہ اگر چہ بظاہر فریقِ ثانی کی گاڑی کے ٹکرانے سے پیش آیا ہوگا مگر آپ یہ کہنے کا حق نہیں رکھتے کہ فریقِ ثانی نے ٹکر مار کر آپ کو زخمی کر دیا۔ اس کے برعکس صحیح طور پر آپ کو صرف یہ کہنا چاہئے کہ میں غلط رُخ پر چل رہا تھا اور فریقِ ثانی کی گاڑی صحیح رخ پر۔ اس لیے فریق ثانی کی گاڑی میری گاڑی سے ٹکرا گئی۔

یہی معاملہ زندگی کے دوسرے تمام پہلوؤں کا بھی ہے۔ آپ کو جب بھی اپنی زندگی میں کسی نقصان سے دوچار ہونا پڑے تو پیشگی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ جو کچھ ہوا وہ خود آپ کی غلطی کی بنا پر ہوا۔ یہی زندگی کے معاملات میں صحیح سوچ ہے۔ اگر آپ صحیح انداز میں سوچیں تو آپ اپنی اصلاح کر کے اپنے مستقبل کو بچالیں گے۔ اور اگر آپ اس کے برعکس یہ کریں کہ اپنی مصیبت کا الزام دوسروں کو دیتے رہیں تو آپ اپنے مستقبل کو بھی برباد کریں گے، اور آپ کا ماضی اور حال تو پہلے ہی برباد ہو چکا ہے۔

غصہ ایک کمزوری ہے

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں سچے انسانوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ: **و اذا مـــا غضبوا هم يغفرون** (الشوریٰ ۳۷) یعنی جب اُنہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔

اس کا مطلب سادہ طور پر صرف غصہ کو معاف کرنا یا اُس کو بھلا دینا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب غصہ کی نفسیات سے اوپر اُٹھ کر معاملہ کرنا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ غصہ دلانے کے باوجود آدمی بے غصہ ہو کر سوچے۔ وہ غصہ سے متاثر ہوئے بغیر اس کا جواب دے۔

غصہ ایک کمزوری ہے، اور غصہ نہ کرنا ایک طاقت ہے۔ آدمی اگر غصہ نہ ہو تو وہ ہر صورت حال کو مینیج کر سکتا ہے۔ وہ ہر معاملہ کو اپنے موافق بنا سکتا ہے۔ غصہ آدمی کی عقل کو مختل کر دیتا ہے۔ ایسا آدمی صورت معاملہ کو نہ تو صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور نہ صحیح طور پر اُس کا جواب دے سکتا ہے۔ کوئی آدمی غصہ

ہو جائے تو فوراً وہ تشدد کی طرف جاتا ہے۔ حالاں کہ تشدد کسی مسئلہ کا حل نہیں۔ اور جو آدمی اپنے غصہ کو قابو میں رکھے، وہ مسئلہ کا پُر امن حل تلاش کرے گا۔ اور پُر امن حل ہی کسی مسئلہ کا واحد یقینی حل ہے۔

انسان کے ذہن میں غیر معمولی صلاحیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ آدمی اگر غصہ نہ ہو تو وہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنے ذہن کی بھر پور صلاحیتوں کو اپنے حق میں استعمال کرے۔ مگر آدمی جب غصہ ہو جائے تو اُس کے ذہن کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ اس قابل نہیں رہتا کہ اپنی ذہنی صلاحیت کو بھر پور طور پر اپنے حق میں استعمال کرے۔ غصہ نہ ہونا جیت ہے، اور غصہ ہونا اُس کے مقابلہ میں ہار۔

حق پر صبر کے ساتھ جمنا

قرآن کی سورہ نمبر ۱۰۳ میں بتایا گیا ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو گھاٹے سے بچتے ہیں اور کامیاب زندگی حاصل کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قرآن کے الفاظ یہ ہیں: **وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر** (العصر ۳) یعنی وہ لوگ جنہوں نے ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور جنہوں نے ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔

جب بھی کوئی آدمی سچائی کے راستہ پر قائم ہوتا ہے یا لوگوں کو سچائی کی طرف بلاتا ہے تو ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اُس کے مخالف بن جاتے ہیں۔ اُس کو لوگوں کی طرف سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے وقت میں حق پرست آدمی کا کام یہ ہے کہ وہ صبر کا طریقہ اختیار کرے، وہ پیش آنے والی مشکلات کو اپنے اوپر سہے، وہ اُن کو دوسروں کے اوپر انڈیلنے کی کوشش نہ کرے۔

صبر غیر جارحانہ طریقہ کا دوسرا نام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق پرست آدمی کو چاہئے کہ وہ تشدد کے مقابلہ میں جوابی تشدد نہ کرے۔ وہ یک طرفہ طور پر اپنے آپ کو پُر امن طریقِ کار کا پابند بنائے۔ اسی روش کا دوسرا نام صبر ہے۔

حق اور تشدد دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ جو آدمی حق کو لینا چاہے تو اُس کو تشدد کو چھوڑنا پڑے گا۔ تشدد، خواہ کسی بھی عذر کی بنا پر استعمال کیا جائے، وہ تشدد ہے۔ ہر تشدد یکساں طور پر تباہ کُن ہے۔ کوئی خوب صورت عذر تشدد کو اُس کے تباہ کن اثرات سے بچا نہیں سکتا۔

حق کے حصول کے نام پر تشدد کرنا خود حق کی نفی ہے۔ جو لوگ حق کے نام پر تشدد کریں وہ اپنے بارے میں یہ ثابت کرتے ہیں کہ اُن کا کیس حق کا کیس نہیں۔ حق پسند آدمی کبھی تشدد پسند نہیں ہوسکتا۔ جو آدمی تشدد کو پسند کرے وہ یقینی طور پر حق پسند نہیں، خواہ وہ بطور خود اپنے آپ کو حق کا چیمپین کیوں نہ سمجھتا ہو۔

امن کی قیمت

ہر چیز کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ کوئی چیز آدمی کو اُسی وقت ملتی ہے جب کہ وہ اُس کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہو۔ ضروری قیمت ادا کیے بغیر اس دنیا میں کسی کو اپنی مطلوب چیز نہیں ملتی۔ یہی معاملہ امن کا بھی ہے۔ امن کی بھی ایک قیمت ہے۔ کوئی فرد یا گروہ اُسی وقت امن کو حاصل کرسکتا ہے جب کہ وہ اس کی مطلوب قیمت ادا کرے۔ امن کی یہ قیمت نقصان کو برداشت کرنا ہے۔

یہ حقیقت قرآن کی سورہ نمبر ۲ میں اس طرح بیان کی گئی ہے: ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے۔ اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو جن کا حال یہ ہے کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ (البقرہ ۱۵۵-۱۵۶)

قرآن کی اس آیت میں زندگی کی ایک حقیقت کو بتایا گیا ہے۔ موجودہ دنیا کا نظام جس قانون کے تحت بنا ہے، اُس کے مطابق، ایسا ہونا ضروری ہے کہ لوگوں کو مختلف قسم کا نقصان اٹھانا پڑے۔ کبھی انہیں دوسروں کی طرف سے چیلینج پیش آئے، کبھی انہیں اقتصادی تنگی کا شکار ہونا پڑے، کبھی اُنہیں ملک ومال میں کمی کا تجربہ ہو، کبھی وہ کسی حادثہ کا شکار ہوجائیں، کبھی وہ کسی ایسے فائدے سے محروم ہوجائیں جس کو وہ اپنا حق سمجھتے تھے، وغیرہ۔

اس قسم کے ناخوش گوار تجربات عین فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں ہر ایک کو کبھی نہ کبھی پیش آئیں گے۔ ایسی حالت میں لوگ اگر نقصان کو برداشت نہ کریں تو اسی کے نتیجہ کا نام تشدد ہے۔ اور اگر وہ اس کو برداشت کرلیں تو اسی کے نتیجہ کا نام امن ہے۔

نقصان پیش آنے پر صبر اور برداشت کا رویہ اختیار کرنا کوئی پسپائی کی بات نہیں۔ یہ ہمت و حوصلہ کی بات ہے۔ یہ حقیقتِ واقعہ کو اختیارانہ طور پر تسلیم کرنا ہے۔ اس کا مطلب، ایک چیز کھونے کے بعد یہ یقین رکھنا ہے کہ بہت سی دوسری چیزیں اب بھی اُس کے پاس موجود ہیں جن کے سہارے وہ ازسرِنو اپنی زندگی کی تعمیر کرسکتا ہے۔

صبر و برداشت کا فائدہ یہ ہے کہ چیز کو کھونے کے باوجود آدمی اپنے اعتدال کو نہیں کھوتا۔ وہ وقتی ناکامی کے باوجود اپنی اس صلاحیت کو باقی رکھتا ہے کہ وہ صورت حال پر معتدل انداز میں غور کرے۔ وہ معاملہ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لے کر ازسرِنو اپنی زندگی کا منصوبہ بنائے۔ وہ کھوئے ہوئے کو بھلا کر باقی رہنے والی چیزوں کی بنیاد پر دوبارہ اپنے کام کو منظّم کرے۔ وہ مایوسی کے بجائے تدبیر سے کام لے کر پھر سے زندگی کا سفر شروع کردے۔

موجودہ دنیا کی ایک صفت یہ ہے کہ یہاں ہر شام کے بعد دوبارہ صبح طلوع ہوتی ہے۔ دنیا امکانات و مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ایک موقع کھونے کے بعد آدمی کو دوسرا موقع مل جاتا ہے۔ ایک زینہ سے محرومی کے بعد اُس کے لیے دوسرے زینہ کے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ اس طرح اس دنیا میں بار بار یہ امکان موجود رہتا ہے کہ ایک نقشہ ٹوٹنے کے بعد آدمی دوسرے نقشہ کو استعمال کرکے اپنی زندگی کی نئی تعمیر کرلے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر بُری خبر کے ساتھ ایک اچھی خبر شامل رہتی ہے۔ ہر حادثہ آدمی کو خاموش زبان میں یہ خوش خبری دیتا ہے کہ تم مایوس اور بددل نہ ہو۔ بلکہ ہمت سے کام لے کر نئے مواقع کی تلاش کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو فطرت کا نظام پیشگی طور پر تم کو یہ خوش خبری دیتا ہے کہ تمہاری محرومی مستقل محرومی نہیں بنے گی۔ جلد ہی تم اپنے لیے ایک نئی اور زیادہ بہتر دنیا کی تعمیر کرلوگے۔ جلد ہی تمہاری شکست ایک نئی قسم کا رہنما ثابت ہوگی۔

جو لوگ نقصان کو برداشت نہ کریں وہ منفی سوچ کا شکار ہوکر اپنی زندگی کو ایک بوجھ بنالیتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی بوجھ بن جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ صبر اور ہمت سے کام لیں وہ ماضی

کے کھنڈر پر اپنے لیے ایک نیا محل تعمیر کر لیتے ہیں۔ وہ ایک شام کے بعد دوبارہ اپنے لیے ایک نئی صبح تلاش کر لیتے ہیں جس کی روشنی میں وہ اپنا سفرُ کے بغیر جاری رکھ سکیں۔

صلح کی پیشکش کو قبول کرنا

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قریش کی جارحیت کے نتیجہ میں، قریش اور مسلمانوں کے درمیان حالتِ جنگ قائم ہوگئی تھی۔ اس موقع پر جو احکام قرآن میں دیے گئے اُن میں سے ایک حکم یہ تھا: **وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله انه هو السميع العليم، وان يريدوا أن يخدعوك فإنّ حسبك الله (الانفال ٦١ ـ ٦٢)** یعنی اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔ بے شک وہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اور اگر وہ تم کو دھوکا دینا چاہیں گے تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔

قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں امن آخری حد تک مطلوب ہے۔ حتیٰ کہ اگر رسک (risk) لے کر امن قائم ہوتا ہو تو رسک لے کر بھی امن قائم کیا جائے گا۔ جیسا کہ قرآن کی اس آیت میں تعلیم دی گئی ہے۔ حالت جنگ کے دوران اگر فریقِ ثانی صلح کی پیش کش کرے تو بلا تاخیر اُس کو قبول کر لینا چاہیے۔ بالفرض اگر یہ اندیشہ ہو کہ صُلح کی اس پیش کش میں کوئی دھوکہ چھپا ہوا ہے تب بھی اس اعتماد پر فریقِ ثانی سے صُلح کی جائے گی کہ خدا ہمیشہ امن پسندوں کے ساتھ ہوتا ہے، نہ کہ فریب دینے والوں کے ساتھ۔

اس سے مزید یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ اس دنیا میں امن ہمیشہ وہ لوگ قائم کرتے ہیں جو اعلیٰ حوصلہ کے مالک ہوں۔ موجودہ دنیا میں ہمیشہ ایک اور دوسرے فریق کے درمیان مسائل موجود رہتے ہیں۔ ہمیشہ حقوق اور بے انصافی کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں وہی لوگ امن قائم کر سکتے ہیں جو ہر دوسرے تقاضہ سے بُلند ہو کر سوچیں، جو کسی بھی چیز کو عذر نہ بنائیں۔ صرف ایسے باحوصلہ لوگ ہی دنیا میں امن قائم کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے اندر یہ حوصلہ نہ ہو وہ صرف لڑتے رہیں گے، وہ امن کی تاریخ نہیں بنا سکتے۔

زیادہ بڑا رزق

قرآن کی سورہ نمبر ۲۰ میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے زندگی کی ایک حقیقت کو اس طرح بتایا گیا ہے: **ولا تمدن عینیك إلیٰ ما متعنا به ازواجاً منهم زهرة الحیوة الدنیا، لنفتنهم فیه ورزق ربك خیر وابقیٰ** (طٰہ ۱۳۱) یعنی تم ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے اُن کے کچھ گروہوں کو اُن کی آزمائش کے لیے اُنھیں دے رکھا ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔

اصل یہ ہے کہ زندگی کی دو مختلف صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی مادی دنیا کو اپنا نشانہ بنائے۔ وہ ملک و مال میں اپنی کامیابی تلاش کرے۔ ان چیزوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک اور دوسرے کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ یہی مادّی چیزیں ہیں جن میں چھین جھپٹ کا معاملہ چلتا رہتا ہے۔ اس لیے جو لوگ مادیّات میں جیتے ہوں وہ یکسر حق تلفی یا محرومی کے احساس کا شکار رہتے ہیں۔ یہ احساس بار بار حسد اور انتقام اور تشدد کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

زندگی کی دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی یافت (achievement) کے احساس میں جیتا ہو۔ ایسا آدمی اپنے آپ میں مطمئن ہوگا۔ اُس کے اندر پانے کا احساس اُس کو اس سے بچائے گا کہ وہ دوسروں کے خلاف نفرت کرے یا اُن کے خلاف تشدد کا منصوبہ بنائے۔

یافت کا یہ احساس کن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو قرآن کے الفاظ میں، رزق رب مل رہا ہو۔ رزق رب سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو یہ یقین حاصل ہو کہ اُس نے سچائی کو پالیا ہے۔ اُس نے اس حقیقت کو دریافت کیا ہو کہ خالق نے اُس کو جو وجود دیا ہے وہ سونے چاندی کے تمام ذخیروں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ اس طرح بیدار ذہن کے ساتھ دنیا میں رہے کہ پوری کائنات اُس کے لیے فکری اور روحانی خوراک کا دسترخوان بن جائے۔

جو آدمی دنیا سے اس طرح کا رزقِ رب پا رہا ہو وہ اتنا زیادہ اوپر اُٹھ جاتا ہے کہ ملک و مال جیسی چیزیں اُس کے لیے حقیر بن جاتی ہیں۔ اُس کی یہ نفسیات اپنے آپ اُس کو امن پسند بنا دیتی ہے۔

نفرت اور تشدد جیسی چیزیں اُس کو اتنا زیادہ بے معنیٰ معلوم ہونے لگتی ہیں کہ اُس کے پاس اس کا وقت نہیں رہتا کہ وہ کسی کے خلاف نفرت کرے یا کسی کے خلاف تشدد کا منصوبہ بنائے ـــــ جس آدمی کو زیادہ بڑی چیز مل جائے وہ کبھی چھوٹی چیز کی طرف نہیں دوڑے گا۔

امن پسندی تحفظ کا ذریعہ

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایک پیغمبر سے اُس کی قوم نے کہا: **ولولا رهطك لرجمناك (هود ٩١)**۔ یہ رہط پیغمبر کے مومنین کا نہ تھا بلکہ پیغمبر کی قوم کا تھا جو ایمان نہ لانے کے باوجود قبائلی روایت کی بنا پر، پیغمبر کا تحفظ کرتے تھے۔ یہی حقیقت حدیث میں ان الفاظ میں آئی ہے: **ما بعث الله نبيا الا فى منعةٍ من قومه** (مسند احمد ۲/ ۵۳۳) یعنی ہر پیغمبر کو خدا نے اپنی قوم کی منعت (محافظ قوت) کے ساتھ بھیجا۔

قدیم زمانہ میں جب کہ جدید طرز کا حکومتی نظام موجود نہ تھا لوگ قبائل کی حمایت میں رہا کرتے تھے۔ قبائلی روایات کے مطابق، ہر قبیلہ اس کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے افراد کا تحفظ کرے۔ قدیم زمانہ میں یہی قبائلی روایت پیغمبروں کے لیے محافظ قوت بنی رہی۔ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ہاشم کے سردار ابو طالب کی طرف سے یہ منعہ حاصل تھا۔ ابو طالب اگر چہ آخر وقت تک ایمان نہیں لائے مگر وہ قبائلی روایات کی بنا پر، پیغمبر اسلام کے مخالفین کے مقابلہ میں آپ کے لیے منعہ (محافظ قوت) بنے رہے۔ (ملاحظہ ہو سیرت ابن ہشام، الجزء الاول صفحہ ۲۸۱)

موجودہ زمانہ میں قبائلی نظام ختم ہو چکا ہے۔ مگر جدید تصور ریاست کے تحت سیکولر نظام اہل ایمان اور اہل دعوت کو یہی منعہ فراہم کر رہا ہے۔ موجودہ زمانہ کی سیکولر حکومت اپنے ہر شہری کو یہ گارنٹی دیتی ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے اور جس مذہب کی چاہے تبلیغ کرے، اُس کو کوئی روک نہیں سکتا، صرف ایک شرط کے ساتھ کہ اہل مذہب یا اہل دعوت کسی کے خلاف تشدد نہ کریں۔

پیغمبروں کو قدیم زمانہ میں جو منعہ ملا وہ قبائلی منعہ تھا، نہ کہ اسلامی منعہ۔ اس کے باوجود پیغمبروں نے اُس کو قبول کیا۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کو جو منعہ ملا وہ بھی سیکولر منعہ ہے، نہ کہ اسلامی منعہ۔

پیغمبروں کی سنت کے مطابق، مسلمانوں کو چاہئے تھا کہ وہ اس منعہ کو قبول کرتے ہوئے اس کے ماتحت پُر امن طور پر دعوت کا کام کریں۔ مگر ساری دنیا کے مسلم رہنماؤں نے سیکولرزم کو لادینیت قرار دے کر اُس کے خلاف لفظی اور عملی لڑائی چھیڑ دی۔ اس طرح وہ غیر ضروری طور پر سیکولرزم کے حریف بن گئے۔ سیکولر نظام کے تحت ملا ہوا قیمتی منعہ استعمال ہونے سے رہ گیا۔

انسانوں کے لئے رحمت

قرآن کی سورہ نمبر ۲۱ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: **و ما ارسلنٰك الا رحمة للعالمین** (الأنبیاء ۱۰۷) یعنی ہم نے تم کو تو بس دنیا والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا آنا ساری دنیا کے انسانوں کے لیے خدا کی رحمت کا ظہور تھا۔ آپ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے زندگی کے وہ اصول بتائے جن کو اختیار کر کے انسان 'دارالسلام' (یونس ۲۵) میں آباد ہوسکتا ہے، یعنی امن وسلامتی کی کالونی میں۔ آپ کے ذریعہ وہ تعلیمات اُتاری گئیں جو انسانی معاشرہ کو پُر امن معاشرہ بناسکتی ہیں۔ آپ نے تاریخ میں پہلی بار امن (peace) کے تصور پر مبنی مکمل آئیڈیالوجی پیش کی۔ آپ نے زندگی کا وہ فارمولا بتایا جو آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نفرت اور تشدد سے بچتے ہوئے اپنے لیے ایک صحت مند زندگی کی تعمیر کر سکے۔ آپ کے ذریعہ دنیا میں وہ انقلاب آیا جس نے اس بات کو ممکن بنایا کہ ٹکراؤ اور جنگ سے بچتے ہوئے انسان ایک پُر امن سماج بنا سکے۔

پیغمبر اسلام کو اگر چہ مجبور کن حالات میں بعض ایسی لڑائیاں لڑنی پڑیں جو اتنی چھوٹی تھیں کہ اُن کو جنگ کے بجائے جھڑپ کہنا زیادہ صحیح ہے۔ پیغمبر اسلام نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا جس کو بجا طور پر غیر خونی انقلاب (bloodless revolution) کہا جاسکتا ہے۔

پیغمبر اسلام نے امن کو مکمل نظریۂ حیات کی حیثیت دی۔ آپ نے بتایا کہ تشدد تخریب کا ذریعہ ہے اور امن تعمیر کا ذریعہ۔ آپ نے صبر کو سب سے بڑی عبادت بتایا جس کا مطلب مکمل طور پر امن کی روش پر قائم رہنا ہے۔ آپ نے فساد کو سب سے بڑا جرم بتایا جس کا مطلب فطرت کے پُر امن نظام کو

درہم برہم کرنا ہے۔آپ نے امن کو اتنی زیادہ اہمیت دی کہ ایک انسان کے قتل کو سارے انسانوں کے قتل کے برابر قرار دیا۔

ملاقات میں السلام علیکم کہنے کو رواج دینا، اس کا مطلب یہ تھا کہ باہمی تعلقات کی بنیاد امن و سلامتی پر ہے۔آپ نے آخرت کی کامیابی کو انسانی جدوجہد کی منزل بتایا، اس طرح آپ نے دنیوی ترقی کو نشانہ بنانے کی جڑ کاٹ دی جس کی وجہ سے ٹکراؤ اور تشدد کی تمام صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔آپ نے انسان کے لیے بہتر زندگی کا یہ فارمولا دیا ـــــ لوگوں کو نفع دینے والے بنو، اور اگر تم نفع نہیں دے سکتے ہو تو لوگوں کے لیے بے ضرر (harmless) بن جاؤ۔آپ نے بتایا کہ کسی کو اپنا دشمن نہ سمجھو۔تم دشمن کے ساتھ بھی اچھا سلوک کرو، پھر تم کو معلوم ہوگا کہ ہر دشمن امکانی طور پر (potentially) تمہارا دوست تھا۔ ہر دشمن انسان کے اندر ایک دوست انسان چھپا ہوا تھا۔

جہاد پُر امن عمل کا نام ہے

ملاّ علی قاری مشہور عالم اور فقیہہ ہیں۔اُن کا پورا نام یہ ہے: علی بن (سلطان) محمد، نورالدین الملاّ الہروی القاری۔ملاّ علی قاری ہرات میں پیدا ہوئے۔اُن کی وفات ۱۰۱۴ھ (۱۶۰۶ء) میں مکہ میں ہوئی۔انہوں نے مختلف اسلامی موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں لکھیں۔(کتاب الأ علام)

ملاّ علی قاری کی ایک کتاب کا نام مرقاۃ المصابیح ہے جو مشکاۃ المصابیح کی شرح میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب میں ملا علی قاری کتاب الجہاد کے تحت لکھتے ہیں کہ جہاد کے لفظ میں لغوی طور پر جدوجہد اور مشقت کا مفہوم ہے۔اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: **ثم غلب فی الإسلام علی قتال الکفار** ۔یعنی پھر جہاد کا لفظ اسلام میں اہل کفر سے جنگ کے لیے استعمال ہونے لگا۔

ہر لفظ کا ایک لغوی مفہوم ہوتا ہے اور دوسرا استعمالی مفہوم۔یہی معاملہ جہاد کا بھی ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے۔لغوی طور پر اس کے معنیٰ کوشش کے ہیں۔ اس میں مبالغہ کا مفہوم ہے۔ استعمال میں یہ لفظ مختلف قسم کی جدوجہد کے لیے لکھا یا بولا جاتا ہے۔اُنہی میں سے ایک جنگ بھی ہے، تاہم اس کا استعمال صرف اس استثنائی جنگ کے لیے خاص ہے جو فی سبیل اللہ کی گئی ہو، ملک و مال

کے لیے جو جنگ کی جائے اُس کو جہاد نہیں کہا جائے گا۔

قرآن میں اس سلسلہ میں دو مختلف لفظ استعمال کئے گئے ہیں ـــــ جہاد اور قتال۔ جب پُر امن جدوجہد مراد ہو تو وہاں قرآن میں جہاد کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن کے ذریعہ پُر امن دعوتی جدوجہد (الفرقان ۵۲)۔ اور جب باقاعدہ جنگ مراد ہو تو وہاں قرآن میں قتال کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً آل عمران ۱۲۱۔ تاہم بعد کے زمانہ میں جہاد کا لفظ اکثر قتال کے ہم معنیٰ لفظ کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ جہاد کے لفظ کے اس استعمال کو اگر بالفرض درست مانا جائے تب بھی وہ جہاد کے لفظ کا ایک توسیعی استعمال ہوگا، نہ کہ اُس کا حقیقی استعمال۔

اپنے حقیقی مفہوم کے اعتبار سے جہاد ایک پُر امن عمل کا نام ہے، نہ کہ متشددانہ عمل کا نام۔ جہاد کا عمل انسان کو ذہنی اور روحانی طور پر بدلنے کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ انسان کو قتل کرنے کے لیے۔

ہر حال میں امن

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی حد تک ایک امن پسند آدمی تھے۔ آپ کے مخالفین نے بار بار آپ کو لڑائی میں الجھانا چاہا مگر ہر بار آپ اعراض کر کے لڑائی سے بچتے رہے۔ تاہم چند بار یک طرفہ جارحیت کی بنا پر آپ کو وقتی طور پر دفاعی جنگ کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ انہی چند دفاعی جنگوں میں سے ایک بدر کا غزوہ ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ عین اُس وقت جب کہ دونوں طرف کی فوجیں آمنے سامنے کھڑی تھیں، پیغمبر اسلام کے پاس خدا کا فرشتہ آیا۔ اُس نے کہا کہ اے محمد، اللہ نے آپ کو سلام (سلامتی) کا پیغام بھیجا ہے۔ یہ سُن کر پیغمبر اسلام نے فرمایا: **هو السلام ومنه السلام واليه السلام**۔ (البدایۃ والنہایۃ، الجزء الثالث، صفحہ ۲۶۷) یعنی اللہ سلامتی ہے اور اُس سے سلامتی ہے اور اُسی کی طرف سلامتی ہے۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ عین لڑائی کے وقت بھی پیغمبر اسلام ایک امن پسند انسان بنے ہوئے تھے۔ اُس ہنگامی وقت میں بھی ایسا نہ تھا کہ آپ کا ذہن نفرت اور تشدد سے بھر جائے بلکہ اُس وقت

بھی آپ امن اور سلامتی کی اصطلاحوں میں سوچتے تھے، اُس وقت بھی آپ کا دل اس آرزو سے تڑپ رہا تھا کہ اللہ کی مدد سے وہ دنیا میں امن اور سلامتی کا ماحول قائم کرسکیں۔ سچا انسان وہ ہے جو جنگ کے وقت بھی امن کی بات سوچے، جو لڑائی کے ہنگاموں میں بھی سلامتی کا جذبہ اپنے دل میں لیے ہوئے ہو۔

یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ مثبت سوچ (positive thinking) کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، جنگ تمام منفی واقعات میں سب سے بڑا منفی واقعہ ہے۔ پیغمبر عین اس کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر اُس کی زبان سے خون اور تشدد کے بجائے امن اور سلامتی کے الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہ بلاشبہہ اعلیٰ ترین انسانی صفت ہے۔ اعلیٰ انسان وہ ہے جو تشدد کے درمیان بھی امن کی بات سوچے، جو جنگ کے حالات میں بھی صُلح کا منصوبہ بنائے۔

اللہ کا نام سلامتی

قرآن میں اللہ کے مختلف نام (یا صفات) بتائے گئے ہیں۔ اُن میں سے ایک السلام ہے، یعنی سلامتی۔ گویا خدا خود سلامتی کا مظہر ہے، خدا خود سلامتی کا پیکر ہے۔ خدا کو امن وسلامتی اتنا زیادہ پسند ہے کہ اُس نے اپنا ایک نام السلام رکھا۔

اس آیت کی تفسیر میں الخطابی نے لکھا ہے کہ: **معناه الذی سلم الخلق من ظلمہٖ** (الجامع لأحکام القرآن للقرطبی، الجزء ۱۸، صفحہ ۴۶) یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہستی جس کے ظلم سے لوگ محفوظ رہیں۔ لوگوں کو جس سے سلامتی کا تجربہ ہو، نہ کہ تشدد کا۔

خدا کی حیثیت اعلیٰ ترین معیار کی ہے۔ جب خدا کا برتاؤ انسانوں سے امن اور سلامتی پر مبنی ہو تو انسانوں کو بھی دوسرے انسانوں کے ساتھ اسی برتاؤ کا معاملہ کرنا چاہیے۔ ہر انسان کو دوسرے انسان کے ساتھ امن وسلامتی کا برتاؤ کرنا چاہئے، نہ کہ اس کے خلاف سختی اور تشدد کا۔

طاقتور کون

ایک حدیث کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لیس الشدید بالصرعة، انما الشدید الذی یملك نفسه عند الغضب** (البخاری، کتاب الادب، مسلم، کتاب البرّ،

موطا کتاب الجامع، مسند احمد)۔ یعنی طاقت ور وہ نہیں ہے جو کُشتیمیں لوگوں کو پچھاڑ دے۔ طاقتور صرف وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

غصہ کے وقت غصہ کو روکنا سلف کنٹرول (self control) کی علامت ہے۔ اور سلف کنٹرول بلاشبہہ سب سے بڑی طاقت ہے۔ ایسے موقع پر سلف کنٹرول آدمی کو غلط کارروائیوں سے بچاتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر سلف کنٹرول کی طاقت نہ ہو، وہ غصہ کے وقت بپھر اُٹھے گا، یہاں تک کہ وہ متشددانہ کارروائی کرنے لگے گا۔ غصہ کو قابو میں رکھنا امن پسند انسان کا طریقہ ہے اور غصہ کے وقت بے قابو ہو جانا تشدد پسند انسان کا طریقہ۔

ایک آدمی کی لڑائی دوسرے آدمی سے ہو اور وہ اُس کو لڑائی میں پچھاڑ دے تو یہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ دوسرے آدمی کے مقابلہ میں پہلا آدمی جسمانی اعتبار سے زیادہ طاقتور تھا۔ مگر جسمانی طاقت ایک محدود طاقت ہے۔ اس کے مقابلہ میں جس شخص کا یہ حال ہو کہ اُس کے اندر غصہ بھڑکے مگر وہ اپنے غصہ پر کنٹرول کرلے اور غصہ دلانے والے کے ساتھ معتدل انداز میں معاملہ کرے، ایسا آدمی زیادہ بڑی طاقت کا مالک ہے۔ اُس کی یہ روش اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ عقل کی طاقت رکھتا ہے، اور عقل کی طاقت بلاشبہہ جسم کی طاقت سے بہت زیادہ بڑی ہے۔ ایسا آدمی اپنی دانش مندانہ منصوبہ کے ذریعہ ہر جنگ کو جیت سکتا ہے، بغیر اس کے کہ اُس نے ایک انسان کا بھی خون بہایا ہو۔

سماجی امن کا فارمولا

سماجی امن کا فارمولا کیا ہے اور کسی سماج میں معتدل حالات کو کس طرح برقرار رکھا جاسکتا ہے، اس کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان الفتنة نائمة لعن الله مَن أيقظها** (حدیث) یعنی فتنہ سویا ہوا ہے۔ اس شخص پر اللہ کی لعنت ہے جو سوئے ہوئے فتنہ کو جگائے۔

یہ سماجی امن کا ایک فطری فارمولا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے اندر اَنا (ego) کا جذبہ موجود ہے۔ اور اَنا کا جذبہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کو چھیڑا جائے تو وہ بہت جلد بھڑک اٹھے گا اور فساد برپا

کرے گا۔ مگر فطرت نے اس جذبہ کو ہر آدمی کے سینہ میں سُلا دیا ہے۔ وہ ہر انسان کے اندر موجود ہے مگر تخلیقی نظام کے تحت وہ خوابیدہ حالت میں ہے۔ ایسی حالت میں کسی سماج کو پُر امن سماج بنانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ لوگوں کے سینے میں سوئی ہوئی انانیت کو سویا رہنے دیا جائے۔

سماجی امن کو وہی لوگ درہم برہم کرتے ہیں جن کی انانیت کو بھڑکا دیا گیا ہو۔ اگر اَنانیت کو بھڑکانے سے بچا جائے تو سماج کا امن بھی تباہ نہ ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ سماجی امن کا قیام خود آپ کے اپنے بس میں ہے، نہ کہ دوسروں کے بس میں۔ آپ اپنے مثبت رویہ سے دوسروں کی اَنا کو نہ چھیڑیے، اور پھر یقینی طور پر آپ اُن کے شر سے محفوظ رہیں گے۔

خاموشی میں نجات

حدیثوں میں مختلف انداز سے خاموشی کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلمنے فرمایا: من صمت نجا (الترمذی، کتاب القیامۃ، الدارمی، کتاب الرقاق، مسند احمد) یعنی جو شخص چُپ رہا اُس نے نجات پائی۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی بولنا چھوڑ دے، وہ بالکل خاموش رہے۔ اس کا مطلب دراصل یہ ہے کہ آدمی خاموش رہ کر سوچے، وہ پہلے خاموش رہ کر معاملہ کو سمجھے، اس کے بعد وہ بولے۔ یہ بلاشبہہ ایک بہترین طریقہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ باقاعدہ اپنی تربیت کرکے یہ عادت ڈالے کہ وہ بولنے سے زیادہ خاموش رہے۔ وہ بولے تو اُس وقت بولے جب کہ وہ سوچنے کا کام کر چکا ہو۔

یہ تربیت اس طرح کی جاسکتی ہے کہ روزانہ کے معمول کی بات چیت میں وہ بالقصد اپنے آپ کو اس کا عادی بنائے۔ اگر آدمی اپنی روزمرہ کی معمولی بات چیت میں یہ عادت ڈال لے تو اپنی اس عادت کی بنا پر وہ اس وقت بھی ایسا ہی کرے گا جب کہ خلاف معمول کوئی بات پیش آگئی ہو۔

عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ جب اُن کے سامنے کوئی بات آتی ہے تو فوری طور پر اُس کا جو جواب اُن کے ذہن میں آتا ہے، اُس کو اپنی زبان سے بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے سوچنے کا عمل کیا جائے اور پھر اُس کے بعد بولنا شروع

کیا جائے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ اس انجام سے بچ جائیں گے کہ وہ اپنے بولے ہوئے الفاظ پر پچھتائیں۔ وہ اپنے کہے ہوئے بول کو لوٹانا چاہیں، حالاں کہ کسی کا کہا ہوا بول دوبارہ اُس کی طرف لوٹنے والا نہیں۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ جب کوئی خلاف مزاج بات سامنے آتی ہے تو آدمی بھڑک کر ناپسندیدہ انداز میں کلام کرنے لگتا ہے۔ اس سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ روزمرہ کی معمولی بات چیت میں آدمی اس کی عادت ڈالے کہ وہ پہلے سوچے اور پھر بولے۔ جب ایسا ہوگا کہ معمول کی بات چیت میں وہ بولنے سے پہلے سوچنے کا عادی ہوجائے گا تو وہ اپنی اس عادت کی بنا پر خلاف معمول بات چیت میں بھی اسی طریقہ پر کاربند رہے گا۔ عام بات چیت میں اپنے آپ پر کنٹرول رکھ کر بولنے کی عادت اُس کو اس قابل بنا دے گی کہ وہ ہنگامی مواقع پر بھی اپنے آپ پر کنٹرول رکھ کر بولے، وہ ذہنی ڈسپلن کے ساتھ بات چیت کرے۔

دنیا کے اکثر فتنے الفاظ کے فتنے ہیں۔ کچھ الفاظ نفرت اور تشدد کے جذبات کو بھڑکاتے ہیں۔ اور کچھ دوسرے الفاظ امن اور انسانیت کا ماحول قائم کرتے ہیں۔ اگر آدمی صرف یہ کرے کہ وہ بولنے سے پہلے سوچے اور اپنے جذبات کو قابو میں رکھ کر بولے تو بیشتر فتنے پیدا ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجائیں گے۔

اپنے آپ کو قابو میں رکھ کر کلام کرنا ایک اعلیٰ انسانی صفت ہے۔ یہ صفت ان لوگوں میں ہوتی ہے جو اپنے آپ پر نظر ثانی کرتے رہیں، جو اپنے قول وعمل کا حساب لیتے رہیں۔

آدمی کو چاہیے کہ جب وہ کوئی بات سُنے تو وہ فوراً اُس کا جواب نہ دے، وہ فوراً اپنا ردعمل پیش نہ کرے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر سوچے کہ کہنے والے نے کیا بات کہی ہے اور میری طرف سے اس کا بہتر جواب کیا ہوسکتا ہے۔ بات کو سن کر ایک لمحہ کے لیے ٹھہرنا اس بات کی یقینی ضمانت ہے کہ وہ سنی ہوئی بات کا درست جواب دے گا، وہ پتھر کا جواب پتھر سے دینے کے بجائے پتھر کا جواب پھول سے دینے میں کامیاب ہوجائے گا۔

دشمن سے ٹکراؤ نہیں

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **لا تتمنّوا لقاء العدو، وسلوا اللہ العافیة** (صحیح البخاری، کتاب الجہاد والسیر)۔ یعنی دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہ کرو، تم اللہ سے امن مانگو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص اگر تمہارا دشمن بن جائے تو ایسا نہ کرو کہ تم بھی اُس کے دشمن بن کر اُس سے لڑنا شروع کر دو۔ بلکہ فریق ثانی کی دشمنی کے باوجود تم اُس کے ساتھ اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ دشمنی کے حالات کے باوجود تمہارا طریقہ لڑائی سے بچنے کا ہونا چاہیے، نہ کہ اپنے آپ کو لڑائی میں پھنسا لینے کا۔

اللہ سے امن مانگو ـــــــ کا مطلب یہ ہے کہ تم ٹکراؤ کے بجائے امن کا راستہ اختیار کرو اور اپنی امن پسندانہ کوششوں کے ساتھ خدا کو بھی دعاؤں کے ذریعہ اُس میں شامل کرو۔ تمہاری دعا یہ نہیں ہونی چاہیے کہ خدایا، دشمن کو ہلاک کر دے بلکہ یہ ہونی چاہیے کہ خدایا، مجھے توفیق دے کہ میں لوگوں کی دشمنی کے باوجود تشدد اور ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کروں بلکہ امن کے راستہ پر اپنی زندگی کا سفر طے کرتا رہوں۔

اس سے معلوم ہوا کہ فطرت کے نقشہ کے مطابق، اس دنیا میں امن کی حیثیت عموم (rule) کی ہے اور تشدد کی حیثیت صرف ایک استثناء (exception) کی۔ مزید اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر بظاہر کوئی شخص یا گروہ آپ کا دشمن ہو تو اُس سے نپٹنے کی صرف یہی ایک شکل نہیں ہے کہ اُس سے مڈبھیڑ کی جائے۔ زیادہ بہتر اور مؤثر شکل یہ ہے کہ امن کی تدبیر سے دشمن کے مسئلہ کا حل نکالا جائے۔ امن کی طاقت تشدد کی طاقت کے مقابلہ میں، زیادہ کارگر بھی ہے اور زیادہ مفید بھی۔

نان وائلنس کا طریقہ

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **ان اللہ یعطی علی الرفق ما لا یعطی علی العنف** (مسلم، کتاب البر، ابوداؤد، کتاب الأدب، سنن ابن ماجہ، کتاب الادب، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، مسند احمد ۱/ ۱۱۲) یعنی اللہ نرمی پر وہ چیز دیتا ہے جو وہ سختی پر نہیں دیتا۔ یہ دراصل فطرت کے اُس قانون کا بیان ہے جو خُدا نے موجودہ دنیا میں قائم کر رکھا ہے۔ اسی قانون کی بنا

پر ایسا ہے کہ جب کوئی شخص نرمی اور عدم تشدد کے حدود میں رہ کر کام کرے تو اُس کا کام زیادہ نتیجہ خیز بن جاتا ہے۔ اور جو شخص سختی اور تشدد کا طریقہ اختیار کرے اُس کا کام آگے بڑھنے کے بجائے اور پیچھے کی طرف چلا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص سختی اور تشدد کا طریقہ اختیار کرے تو اُس کی کوششیں غیر ضروری طور پر دو محاذوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک محاذ، اپنی داخلی تعمیر کا۔ اور دوسرا محاذ، خارجی حریف سے لڑنے کا۔ اس کے برعکس جو شخص نرمی اور عدم تشدد کا طریقہ اختیار کرے، اُس کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی تمام موجود طاقتوں کو صرف ایک محاذ، داخلی تعمیر کے محاذ پر لگائے، اور اُس کے فطری نتیجہ کے طور پر زیادہ بڑی ترقی حاصل کر لے۔

اس حدیث میں فطرت کے اس قانون کا ذکر ہے جس پر ہماری دنیا کا نظام چل رہا ہے۔ یہاں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ اسی نظام کے تحت ملتا ہے، اس کے بغیر نہیں۔ فطرت کا یہ نظام تمام تر امن اور عدم تشدد کے اصول پر قائم ہے۔ اس لیے یہاں جب بھی کسی کو کچھ ملے گا، امن اور عدم تشدد کے اصول پر ملے گا، اُس سے انحراف کر کے کسی کو کچھ ملنے والا نہیں۔

اختلاف کی حد

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طرف یہ فرمایا کہ: **افضل الجهاد كلمة عدل عند سلطان جائر، افضل الجهاد كلمة عدل عند امير جائر** (ابوداؤد، کتاب الملاحم، الترمذی، کتاب الفتن، النسائی، کتاب البیعۃ، ابن ماجہ، کتاب الفتن، مسند احمد) یعنی ظالم حکمراں کے سامنے حق وعدل کی بات کہنا افضل جہاد ہے۔

دوسری طرف حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام نے فرمایا: **من رأى من اميره شياً فكرهه فليصبر** (البخاری، کتاب الأحکام، مسلم، کتاب الامارہ، الدارمی، کتاب السیر، مسند احمد) یعنی جو شخص اپنے حاکم میں ایسی چیز دیکھے جو اُس کو پسند نہ ہو تو وہ اُس پر صبر کرے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: **تسمع وتطيع الأمير وإن ضرب ظهرك وأخذ مالك** (صحیح مسلم، کتاب الایمان) یعنی تم

اپنے حاکم کی بات سُنو اور اس کی اطاعت کرو، خواہ وہ تمہاری پیٹھ پر کوڑ امارے اور تمہارا مال چھین لے۔

ان حدیثوں میں بظاہر دو قسم کے احکام ہیں۔ ایک طرف یہ حکم ہے کہ تم اپنے حاکم میں کوئی غلط بات دیکھو تو کھُلے طور پر اُس کا اعلان کرو۔ دوسری طرف حدیث یہ بتاتی ہے کہ امیر کے اندر تمہیں کوئی غلط بات دکھائی دے تو اُس پر صبر کرو، اگر وہ تمہارے اوپر ظلم کرے تب بھی تم اُس کو برداشت کرو۔

یہ ایک بے حد اہم ہدایت ہے جس سے دو چیزوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ ہے، اعلان اور اقدام کا فرق۔ یہ ایک مطلوب بات ہے کہ آدمی حکمراں کے اندر کوئی غلط بات دیکھے تو وہ نصیحت اور خیر خواہی کے انداز میں اُس کا اعلان کرے۔ مگر جہاں تک عملی اقدام کا تعلق ہے تو آدمی کو اُس سے مکمل طور پر باز رہنا چاہئے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ نصیحت اور ٹکراؤ کی سیاست میں فرق کرے۔ نصیحت کے جائز حق کو استعمال کرتے ہوئے وہ سیاسی ٹکراؤ سے مکمل طور پر بچے۔

فرق کا یہ اصول بے حد اہم ہے۔ سماج میں جب بھی تشدد کا ماحول بنتا ہے، وہ اُس وقت بنتا ہے جب کہ لوگ حکمراں کے خلاف عملی ٹکراؤ کی مہم شروع کر دیں۔ وہ اصلاح سیاست کے نام پر حکمراں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ لیکن اگر اس قسم کی نزاعی سیاست سے بچتے ہوئے صرف قولی نصیحت پر اکتفا کیا جائے تو ہمیشہ ایسا ہوگا کہ سماج میں امن قائم رہے گا، سماج کبھی بھی تشدد کا جنگل نہیں بنے گا۔

پُر امن طریق کار زیادہ بہتر

ایک روایت میں بتایا گیا ہے کہ معاملات میں پیغمبر اسلام کی پالیسی کیا تھی۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں: **ماخیر رسول الله صلى الله عليه وسلم بين امرين الااختار أيسرهما** (صحیح البخاری، کتاب الأدب) یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی کسی معاملہ میں دو میں سے ایک طریقہ کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ دونوں میں سے آسان تر کا انتخاب کرتے تھے۔

اختیار أیسر کے اس اصول کو اگر متشددانہ طریقِ کار اور پُر امن طریقِ کار کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پیغمبر کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی معاملہ پیش آئے تو اُس سے نپٹنے کے لیے

متشددانہ طریقِ کار کو اختیار نہ کیا جائے بلکہ پُر امن طریقِ کار کو اختیار کیا جائے۔ کیوں کہ متشددانہ طریقِ کار یقینی طور پر مشکل ہے اور پُر امن طریقِ کار یقینی طور پر آسان۔

تاہم یہ سادہ طور پر صرف آسان اور مشکل کا معاملہ نہیں۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ معاملات میں پُر امن طریقہ ہمیشہ نتیجہ خیز ہوتا ہے اور متشددانہ طریقہ یقینی طور پر بے نتیجہ ہے۔ وہ مسئلہ کو حل نہیں کرتا البتہ اُس میں کچھ اور اضافہ کر کے اُس کو مزید پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ حدیث میں مشکل طریقہ سے مراد وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ مقصد کا حصول مشکل ہو۔ اس کے مقابلہ میں آسان سے مراد وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ مقصد کا حصول آسان اور یقینی ہو۔

لچک کا طریقہ، نہ کہ اکڑ کا طریقہ

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے ـــــــ صحیح البخاری، کتاب التوحید، صحیح مسلم، کتاب المنافقین، سنن الدارمی، کتاب الرقاق، مسند احمد۔ اس حدیث میں مومن، بالفاظ دیگر، خدا پرست انسان کی مثال خامہ سے دی گئی ہے۔ خامہ نرم پودے کو کہتے ہیں۔ حدیث میں بتایا گیا ہے کہ مومن کا حال نرم پودے کی طرح ہے۔ جب بھی ہوا کا کوئی جھونکا آتا ہے تو وہ اُس کے مطابق، جھک جاتا ہے۔ اور جب جھونکا چلا جائے تو وہ دوبارہ اُٹھ جاتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو بلا اور مصیبت سے بچا لیتا ہے۔

اس حدیث کے مطابق، کسی طوفان کا سامنا کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کے مقابلہ میں اکڑ دکھائی جائے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اُس کے مقابلہ میں لچک کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ مقابلہ کا ایک طریقہ متشددانہ طریقہ ہے اور دوسرا طریقہ پُر امن طریقہ۔ خدا کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے طریقہ کو چھوڑ دیا جائے اور دوسرے طریقہ کو اختیار کیا جائے۔

طوفان کے مقابلہ میں جو لوگ اکڑ کا طریقہ اختیار کریں وہ اپنے اس عمل سے ثابت کرتے ہیں کہ وہ انانیت میں مبتلا ہیں۔ اس کے مقابلہ میں امن کا طریقہ تواضع پر مبنی ہے۔ خدا کی اس دنیا

میں اَنانیت کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے تباہی ہے اور تواضع کی روش اختیار کرنے والوں کے لیے کامیابی۔ یہی بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے: **من تواضع رفعه الله**۔ یعنی جس نے تواضع کی روش اختیار کی، خدا اُس کو بلندی عطا فرمائے گا۔

پُر امن شہری

حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ: **المؤمن من أمنه الناس علی دمائهم واموالهم** (الترمذی، کتاب الایمان، النسائی، کتاب الاِیمان، ابنِ ماجہ، کتاب الفتن، مسند احمد) یعنی مومن وہ ہے جس سے لوگ اپنے خون اور اپنے مال کے معاملہ میں مامون ہوں۔

کسی سماج میں رہنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی لوگوں کے درمیان امن کے ساتھ رہے۔ اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے لڑائی جھگڑا کرتا رہے۔ اس حدیث کے مطابق، ایمانی طریقہ یہ ہے کہ آدمی لوگوں کے درمیان پُر امن شہری بن کر رہے۔ دوسروں کی جان اور مال اور عزت کے لیے وہ مسئلہ نہ بنے۔ وہ کسی حال میں دوسروں کے خلاف تشدد کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

زندگی کا وہ طریقہ کیا ہے جس میں سماج کے افراد ایک دوسرے کی زیادتیوں سے محفوظ ہوں۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ شکایت کے باوجود آدمی اپنی معتدل روش کو برقرار رکھے۔ دوسروں سے شکایت کو وہ اپنے سینے میں دفن کر دے، وہ اپنے سینے کی آگ کو دوسروں کے اوپر انڈیلنے سے بچے۔ اسی قسم کا سماج وہ سماج ہے جہاں لوگ ایک دوسرے سے مامون رہ کر زندگی گذاریں۔ پُر امن سماج معیاری انسانی سماج ہے۔ اس کے برعکس جس سماج میں تشدد ہو وہ حیوانی سماج ہے، نہ کہ انسانی سماج۔

امن پسندی ایک اعلیٰ اخلاق ہے۔ اس کے مقابلہ میں تشدد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی انسانی اخلاق کی سطح سے گر کر حیوانی اخلاق کی سطح پر آ گیا ہو۔

انتظار بھی حل ہے

پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: **أفضل العبادة انتظارُ الفرج** (الترمذی، کتاب الدعوات)۔

یعنی کشادگی کا انتظار کرنا ایک افضل عبادت ہے۔

ہر فرد اور ہر گروہ پر ہمیشہ ایسے حالات آتے ہیں جن میں وہ اپنے آپ کو تنگی میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ ایسے موقع پر بیشتر لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر تنگی کو ایک مستقل حالت سمجھ لیتے ہیں اور اُس کو فوراً اپنے آپ سے دور کرنے کے لیے حالات سے لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی لڑائی ہمیشہ بے فائدہ ثابت ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ تنگی پر کچھ اور مشکلات کا اضافہ کرلیا جائے۔

تنگی کبھی ہمیشہ کے لیے نہیں آتی، وہ صرف وقتی طور پر آتی ہے۔ ایسی حالت میں تنگی کے مسئلہ کا آسان حل صرف یہ ہے کہ انتظار کی پالیسی اختیار کی جائے۔ یعنی غیر ضروری طور پر حالات سے لڑائی نہ چھیڑی جائے بلکہ سادہ طور پر انتظار کرو اور دیکھو (wait and see) کی پالیسی اختیار کی جائے۔ اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی کا ذہنی سکون برباد نہ ہوگا۔ اور جو کچھ ہونے والا ہے وہ اپنے آپ اپنے وقت پر ہو جائے گا۔

جب کوئی مسئلہ پیش آتا ہے تو آدمی یہ چاہنے لگتا ہے کہ فوراً اُس کا حل نکل آئے۔ یہی اصل غلطی ہے۔ آدمی اگر پیش آئے ہوئے مسئلہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دے تو کوئی مسئلہ مسئلہ نہیں۔

خدائی انتباہ، نہ کہ انسانی ظلم

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو بعد کے جن حالات سے پیشگی طور پر آگاہ کیا ہے اُن میں سے ایک یہ ہے کہ بعد کے زمانہ میں مسلم امت دوسری قوموں کی زد میں آجائے گی۔ چنانچہ فرمایا: **یوشك الامم أن تداعىٰ عليكم كما تداعى الأكلة الى قصعتها** (ابوداؤد، کتاب الملاحم، مسند احمد) یعنی قریب ہے کہ قومیں تمہارے خلاف ایک دوسرے کو پکاریں جس طرح کھانا کھانے والے ایک دوسرے کو دسترخوان پر پکارتے ہیں۔

قرائن بتاتے ہیں کہ یہ واقعہ اٹھارویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پیش آیا۔ ابتداءً یورپ کی نو آبادیاتی قوموں کے ذریعہ یہ واقعہ ہوا۔ اس کے بعد دوسری قومیں اس میں شریک ہوتی چلی گئیں۔

اس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ایسا کیوں ہوا۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ براہ راست خدا کی سنت کے تحت پیش آیا۔ خدا کی سنت یہ ہے کہ قوموں کو جگانے کے لیے اُن پر تنبیہات نازل کی جاتی ہیں۔ یہ گویا شاک ٹریٹمنٹ (shock treatment) ہوتا ہے تاکہ وہ چونکیں اور اپنی اصلاح کریں۔ چنانچہ فرمایا: **فلولا اذجاء ھم باسنا تضرعوا ولکن قست قلوبھم و زین لھم الشیطان ما کانوا یعملون** (الأنعام ۴۳) یعنی پس جب ہماری طرف سے اُن پر سختی آئی تو کیوں نہ وہ گڑگڑائے۔ بلکہ اُن کے دل سخت ہوگئے۔ اور شیطان اُن کے عمل کو ان کی نظر میں خوش نما کرکے دکھاتا رہا۔

اس آیت میں تزئین کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے ——— ایک بُرے کام کو خوبصورت الفاظ میں بیان کرنا تاکہ اُس کی بُرائی چھپ جائے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے ساتھ عین یہی واقعہ پیش آیا۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنماؤں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر عین وہی کام کیا جس کو مذکورہ آیت میں تزئین کہا گیا ہے۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے ساتھ غیر قوموں کی طرف سے جو مسائل پیش آئے وہ خدائی انتباہ (warning) تھے۔ مگر مسلم رہنماؤں نے ان مسائل کو ظلم اور سازش کی اصطلاحوں میں بیان کرنا شروع کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو واقعہ اس لیے تھا کہ مسلمان اپنی کوتاہیوں کو محسوس کریں اور اپنی داخلی اصلاح میں سرگرم ہوجائیں۔ اس کے بجائے مسلم رہنماؤں کی غلط رہنمائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ساری سوچ غیر اقوام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ جس واقعہ سے احتسابِ خویش کا ذہن پیدا ہونا چاہئے تھا، اس سے احتسابِ غیر کا ذہن جاگ اُٹھا، جو بڑھتے بڑھتے تشدد تک جا پہنچا۔

خاموشی کی طاقت

حضرت عمر فاروق اسلامی تاریخ کے دوسرے خلیفہ ہیں۔ اُن کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: **أمیتوا الباطل بالصمت عنه**۔ (تم لوگ باطل کو ہلاک کرو اُس کے بارے میں چپ رہ کر)۔

فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں حق کو زندگی ملتی ہے اور باطل کے لیے موت مقدر

ہے۔ ایسی حالت میں باطل کی ہلاکت کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ اُس کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی جائے۔ باطل کے خلاف بولنا یا اُس کے خلاف ہنگامہ کرنا اُس کو زندگی دیتا ہے۔ اور باطل کو نظر انداز کر کے اُس کے بارے میں چپ رہنا اُس کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔

باطل کے بارے میں چپ رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کو نظر انداز کیا جائے۔ اُس کے خلاف کسی ردعمل کا اظہار نہ کیا جائے۔ اُس کے مقابلہ میں احتجاج اور صف آرائی کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔ تاہم ایسا کرنا صرف اُن لوگوں کے لیے ممکن ہے جو فطرت کی طاقت کو جانیں اور اُس پر بھروسہ کر سکیں۔ جو لوگ فطرت کی طاقت کو نہ جانیں، وہی لوگ باطل کے خلاف ہنگامہ آرائی کر کے اُس کو زندگی دینے کا سبب بن جاتے ہیں۔

تشدد مایوسی کا نتیجہ

تشدد محرومی کے احساس کا نتیجہ ہے، اور امن یافت کے احساس کا نتیجہ۔ جو لوگ اس احساس میں مبتلا ہوں کہ وہ محروم ہیں، دوسروں نے اُن کی چیز اُن سے چھین لی ہے، ایسے لوگ ہمیشہ منفی نفسیات میں مبتلا رہتے ہیں۔ اور اُن کا یہی احساس اکثر تشدد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ اس احساس میں جیتے ہوں کہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں یافت کا تجربہ کیا ہے، ایسے لوگ ذہنی سکون سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ پُر امن زندگی گذارتے ہیں۔

جو فرد یا گروہ دوسروں کے خلاف نفرت کرے، جو دوسروں کے خلاف تشدد پر اُتر آئے، وہ اپنے عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو محروم سمجھ رہا ہے۔ اس کے برعکس جو فرد یا گروہ امن پسندی کی زندگی گذارے وہ اپنے عمل سے اس بات کا ثبوت دے رہا ہے کہ اُس نے اپنی زندگی میں وہ چیز پالی ہے جو اُس کو پانا چاہیے۔

اب سوال یہ ہے کہ محرومی کا احساس کسی کو کیوں پیدا ہوتا ہے اور وہ کون لوگ ہیں جو ہمیشہ یافت کے احساس میں جیتے ہیں۔

اس دنیا میں سب سے بڑا پانا یہ ہے کہ آدمی نے خدا کو پالیا ہو اور سب سے بڑی محرومی یہ ہے

کہ آدمی خدا کو پانے سے محروم ہو۔ خدا کو پانے کے بعد کوئی اور چیز پانے کے لیے باقی نہیں رہتی، اور جو لوگ خدا کو پانے سے محروم ہوں وہ گویا محرومی کی اس آخری حالت پر پہنچ گئے ہیں جہاں محرومی ہی محرومی ہے، اول بھی اور آخر بھی، کوئی بھی چیز اُن کی محرومی کے احساس کو ختم کرنے والی نہیں۔

پازیٹیو اسٹیٹس کوازم

جب بھی کوئی آدمی عمل کرنا چاہے تو اُس کو فوراً محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے راستہ میں کچھ رکاوٹیں حائل ہیں۔ ایسا ایک فرد کے لیے بھی ہوتا ہے اور پوری قوم کے لیے بھی۔ اب عمل کا ایک طریقہ یہ ہے کہ پہلے رکاوٹوں سے لڑکر اُن کو راستہ سے ہٹا دیا جائے اور اُس کے بعد اپنا مطلوب عمل شروع کیا جائے۔ اس طریقہ کو عام طور پر ریڈیکلزم (radicalism) کہا جاتا ہے۔

ریڈیکلزم کا طریقہ جذباتی لوگوں کو یا انتہا پسند لوگوں کو بظاہر پسند آتا ہے، مگر وہ کسی مثبت مقصد کے لیے مفید نہیں۔ ریڈیکلزم کا طریقہ تخریب کے لیے کارآمد ہے، وہ تعمیر کے لیے کارآمد نہیں۔ ریڈیکلزم کے طریقہ میں صرف موجودہ سسٹم ہی نہیں ٹوٹتا، بلکہ اس عمل کے دوران وہ سماجی روایات ٹوٹ جاتی ہیں جو صدیوں کے درمیان بنی تھیں۔ قتل وخون اور توڑ پھوڑ کی وجہ سے بے شمار لوگ طرح طرح کی مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ تجربہ بتاتا ہے کہ ریڈیکلزم کا طریقہ نظریاتی طور پر بظاہر خوب صورت معلوم ہوتا ہے، مگر عملی انجام کے اعتبار سے اُس میں کوئی خوبی نہیں۔

اس کے مقابلہ میں دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صورت موجودہ سے ٹکراؤ نہ کرتے ہوئے ممکن دائرہ میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کی جائے۔ صورت موجودہ (statusquo) کو وقتی طور پر قبول کرتے ہوئے اُن مواقع کو استعمال کیا جائے جو اب بھی موجود ہیں۔ اس طریقہ کو ایک لفظ میں پازیٹیو اسٹیٹس کوازم (positive statusquoism) کہا جاسکتا ہے۔

ریڈیکلزم کا طریقہ ہمیشہ تشدد پیدا کرتا ہے۔ اس کے برعکس پازیٹیو اسٹیٹس کوازم سماج کے امن کو باقی رکھتے ہوئے اپنا کام انجام دیتا ہے۔ ریڈیکلزم کا طریقہ ہمیشہ مسئلہ میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کے برعکس پازیٹیو اسٹیٹس کوازم کا طریقہ سماج میں کوئی مسئلہ پیدا کئے بغیر اپنا عمل انجام

دیتا ہے۔ ایک اگر بگاڑ کا راستہ ہے تو دوسرا بناؤ کا راستہ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے قدیم عرب میں اصلاح کا جو طریقہ اختیار کیا اُس کو ایک لفظ میں، پازیٹیو اسٹیٹس کو ازم کہا جا سکتا ہے۔ مثلاً اُس زمانہ میں خانۂ کعبہ کے اندر ۳۶۰ بُت رکھے ہوئے تھے۔ یہ ایک بڑا مسئلہ تھا۔ مگر قرآن کے ابتدائی دور میں اس قسم کا حکم نہیں اُترا کہ **طھر الکعبۃ من الاصنام** (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو)۔ اس کے بجائے اس ابتدائی دور میں قرآن میں جو آیت اُتری وہ یہ تھی: **وثیابك فطھر** (المدثر ۴) یعنی اپنے کپڑے کو پاک کرو۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنے اخلاق کو اور دوسروں کے اخلاق کو درست بناؤ۔

تشدد کا کوئی جواز نہیں

تشدد انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ تشدد انسانیت کا قتل ہے۔ تشدد تمام جرموں میں سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کے باوجود لوگ کیوں تشدد کرتے ہیں۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ ایسے لوگ خودساختہ طور پر اپنے لیے تشدد کا ایک جواز (justification) ڈھونڈ لیتے ہیں۔ وہ بطور خود یہ خیال قائم کر لیتے ہیں کہ فلاں وجہ سے اُن کے لیے تشدد کرنا جائز ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ تشدد کا ہر جواز جھوٹا جواز ہے۔ کوئی فرد یا گروہ جب بھی تشدد کرتا ہے، عین اُسی وقت اُس کے لیے عدم تشدد یا پُرامن طریقِ کار موجود ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں تشدد کیوں۔ جب تشدد کے بغیر عمل کرنے کا موقع موجود ہو تو تشدد کیوں کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تشدد مطلق طور پر قابل ترک ہے اور امن مطلق طور پر قابل اختیار۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ کسی بھی عذر کی بنا پر تشدد نہ کرے، وہ ہر صورت حال میں پرامن طریقِ عمل پر قائم رہے۔

عداوت کے مسئلہ کا حل

بہت سے لوگ یہ خیال کر لیتے ہیں کہ فلاں قوم ہماری دشمن ہے۔ پھر اس مفروضہ کے تحت وہ اُس قوم کے خلاف متشددانہ لڑائی چھیڑ دیتے ہیں تاکہ اُس کی دشمنی کے انجام سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ مگر یہ مفروضہ بھی غلط ہے اور اس مفروضہ کی بنیاد پر بنایا جانے والا نقشۂ کار بھی غلط۔

دشمنی ہاتھ کی انگلی کی طرح انسانی وجود کا کوئی مستقل حصہ نہیں۔ وہ انسانی وجود کا ایک اوپری حصہ ہے۔ مثبت تدبیر کے ذریعہ ہر دشمنی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ دشمنی کی مثال ایسی ہے جیسے گلاس کے اوپر لگی ہوئی مٹی۔ ایسی مٹی کو نہایت آسانی کے ساتھ پانی سے دھوکر صاف کیا جاسکتا ہے۔ گویا کہ گلاس میں مٹی کا لگنا مسئلہ نہیں۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے پاس مٹی کو دھونے کے لیے صاف پانی نہ ہو۔

تالی ہمیشہ دو ہاتھ سے بجتی ہے، ایک ہاتھ سے کبھی تالی نہیں بجتی۔ اسی طرح دشمنی ایک دوطرفہ عمل ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کا دشمن بنے تو آپ خود اُس کے دشمن نہ بنیں۔ اس کے بعد دشمنی اپنے آپ ختم ہوجائے گی۔ دشمن کے ساتھ دشمنی نہ کرنا ہی دشمنی کے مسئلہ کا سب سے زیادہ کارگر عمل ہے۔

ہتھیار جمع کرنا بے فائدہ

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ وہ ایک کامیاب تاجر ہیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ میرا گھر شہر کے ایک ایسے کنارہ پر ہے جہاں سے غیر قوم کی آبادی شروع ہوجاتی ہے۔ میں نے سوچا کہ مجھے اپنی اور اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے پیسہ خرچ کرکے اپنے گھر کے ہر فرد کے لیے لائسنس بنوایا اور پھر گھر کے ہر فرد کے نام گن اور ریوالور حاصل کرلیا۔ اب میں اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کو محفوظ سمجھتا ہوں۔ اب مجھے دنگے اور فساد کا کوئی ڈر نہیں۔

میں نے کہا کہ آپ تجارت کا اصول جانتے ہیں مگر آپ سماجی زندگی کے اصول کو نہیں جانتے۔ سماجی تحفظ کا ذریعہ گن اور ریوالور نہیں ہے۔ سماجی تحفظ کا اصول یہ ہے کہ آپ دوسروں کے لیے بہترین پڑوسی بن کر رہیں۔ آپ دوسروں کو اپنے شر سے بچائیں۔ اس کے بعد لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ آپ دوسروں کے شر سے محفوظ رہیں گے۔ اگر آپ دوسروں سے نفرت کریں تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو نفرت ملے گی اور اگر آپ کے دل میں دوسروں کے لیے خیر خواہی ہو تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو محبت اور خیر خواہی کا تحفہ ملے گا۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کے گھر کے سامنے غیر قوم کی بھیڑ اکٹھا ہوجائے اور آپ اپنی بالکنی پر کھڑے ہو کر اُس کے اوپر گولی چلادیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بس اتنے ہی پر معاملہ ختم ہوجائے گا۔

ہرگز نہیں۔ آپ کو جاننا چاہیے کہ انسانوں کے اوپر گولی چلانا آپ کے لیے قابل دست اندازی پولیس جرم (cognizable offence) کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ جب بھی ایسا ہوگا تو پولیس فوراً وہاں آجائے گی اور آپ ہرگز پولیس سے لڑ نہیں سکتے۔

آپ کو جاننا چاہیے کہ آپ کے پاس گن ہونا اور پولیس کے پاس گن ہونا دونوں میں بے حد بنیادی فرق ہے۔ آپ گن رکھنے کے باوجود کسی کو گولی مارنے کا قانونی حق نہیں رکھتے۔ لیکن پولیس کے پاس گن ہے تو وہ گولی مارنے کا قانونی حق بھی رکھتی ہے۔ غیر قوم کے مقابلہ میں بظاہر مقابلہ دو مساوی فریق کے درمیان نظر آتا ہے مگر جب معاملہ آپ کے اور پولیس کے درمیان کا ہو جائے تو یہ مقابلہ مکمل طور پر غیر مساوی ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ کا گولی چلانا اپنے نتیجہ کے اعتبار سے، آبیل مجھے مار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا اقدام تحفظ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف ہلاکت کی حیثیت رکھتا ہے۔

ضمیر بہترین جج ہے

ایک شہر میں ایک مسلمان نے اپنے لیے نیا گھر بنایا۔ گھر سے ملی ہوئی ایک زمین کو انہوں نے حصار بنا کر اپنے گھر میں داخل کر لیا۔ اُن کے پڑوس میں ایک ہندو ٹھیکہ دار تھا۔ اس ہندو ٹھیکہ دار کا دعویٰ تھا کہ یہ زمین اُس کی ہے۔ چنانچہ اُس نے شہر کے کٹّر ہندوؤں سے مل کر انہیں بھڑکایا۔ یہاں تک کہ ایک دن ہندوؤں کی ایک بھیڑ گھر کے سامنے سڑک پر اکٹھا ہو گئی، اور نعرے لگانے لگی۔

مذکورہ مسلمان کے پاس اُس وقت دو بندوقیں تھیں۔ مگر اُنہوں نے بندوق نہیں اُٹھائی۔ وہ تنہا اور خالی ہاتھ گھر سے نکل کر باہر آئے۔ انہوں نے نعرہ لگانے والی بھیڑ سے کچھ نہیں کہا۔ اُنہوں نے صرف یہ پوچھا کہ آپ کا لیڈر کون ہے۔ ایک صاحب جن کا نام مسٹر سونڈ تھا، آگے بڑھے اور کہا، وہ میں ہوں، بتائیے کہ آپ کو کیا کہنا ہے۔ مسلمان نے بھیڑ سے کہا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریئے اور مسٹر سونڈ کو لے کر گھر کے اندر آگئے۔ اُن کو کمرہ میں لا کر اُنہیں کُرسی پر بٹھا دیا۔

اس کے بعد مسلمان نے کہا کہ مسٹر سونڈ آپ لوگ کس سلسلہ میں یہاں آئے۔ مسٹر سونڈ نے غصہ میں کہا کہ آپ نے ایک ہندو بھائی کی زمین پر قبضہ کر لیا ہے، ہم اسی کے لیے یہاں آئے ہیں۔ مسلمان

نے نرمی کے ساتھ کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ زمین کاغذ پر ہوتی ہے۔ زمین کا فیصلہ کاغذ کو دیکھ کر کیا جاتا ہے۔ آپ ایسا کیجئے کہ میرے پاس جو کاغذات ہیں اُن کو لے لیجئے اور ٹھیکہ دار صاحب کے پاس جو کاغذات ہیں اُن کو بھی لے لیجئے۔ اور پھر نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے گھر چلے جائیے۔ اس معاملہ میں میں آپ ہی کو جج بناتا ہوں۔ آپ کاغذات کو دیکھنے کے بعد جو بھی فیصلہ کر دیں وہ مجھے بلاشرط منظور ہوگا۔

یہ سُن کر مسٹر سونڈ بالکل نارمل ہو گئے۔ وہ غصہ کی حالت میں اندر گئے تھے اور ہنستے ہوئے باہر نکلے۔ اُنہوں نے سڑک پر کھڑی ہوئی بھیڑ سے کہا کہ تم لوگ اپنے گھروں کو واپس جاؤ۔ میاں جی نے خود ہم کو جج بنا دیا ہے۔ اب ہم دونوں کے کاغذات دیکھ کر فیصلہ کریں گے۔ مسٹر سونڈ نے اس کے بعد گھر جا کر دونوں کے کاغذات کو دیکھا اور معاملہ کو اچھی طرح سمجھا۔ چند دن کے بعد اُنہوں نے صد فی صد مسلمان کے حق میں اپنا فیصلہ دے دیا۔

مذکورہ مسلمان اگر اپنی بندوق کو لے کر بھیڑ کے اوپر گولی چلاتے تو وہ بھیڑ کے نفس امارہ (انانیت) کو جگا دیتے۔ اور پھر یقینی طور پر سارا معاملہ مسلمان کے خلاف ہو جاتا۔ مگر جب انہوں نے گن کے بجائے معقولیت کو استعمال کیا تو اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کا نفس لوّامہ (ضمیر) جاگ اُٹھا۔ اور جب ضمیر جاگ اُٹھے تو اُس کا فیصلہ ہمیشہ انصاف کے حق میں ہوتا ہے، ضمیر کبھی ظلم اور بے انصافی کا فیصلہ نہیں کرتا۔

فتح بھی شکست ہے

شاہ پائرس (King Pyrrhus) تیسری صدی قبل مسیح کا ایک یونانی بادشاہ تھا۔ اُس کی لڑائی رومیوں سے ہوئی۔ اس جنگ میں آخر کار شاہ پائرس کو رومیوں کے اوپر فتح حاصل ہوئی۔ مگر لڑائی کے دوران شاہ پائرس کی فوج اور اُس کے ملک کی اقتصادیات بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ شاہ پائرس کے لیے یہ بظاہر فتح تھی مگر وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے شکست کے ہم معنیٰ تھی۔ اس تاریخی واقعہ کی بنا پر ایک اصطلاح مشہور ہوئی ہے جس کو پرک وکٹری (Pyrrhic Victory) کہا جاتا ہے، یعنی بظاہر فتح مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے مکمل شکست۔

جنگوں کی تاریخ کو دیکھا جائے تو یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اکثر فتح پرک فتح ہی ہوتی ہے۔ ہر فاتح

کے حصہ میں دو نقصان کا پیش آنا لازمی ہے۔ ایک، جان اور مال کی تباہی۔ دوسرے، مفتوح کے دل میں فاتح کے خلاف نفرت۔ کوئی بھی فاتح ان نقصانات سے بچ نہیں سکتا۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ کوئی فاتح اس نقصان کو فوراً بھگتتا ہے، اور کسی فاتح کے حصہ میں یہ نقصان کسی قدر دیر کے بعد آتا ہے۔

نقصان کا یہ معاملہ صرف پُر تشدد طریقِ کار کے ساتھ وابستہ ہے۔ پُر امن طریقِ کار کا معاملہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ پُر امن طریقِ کار میں صرف فتح ہے، پُر امن طریقِ کار میں شکست کا کوئی سوال نہیں۔ حتیٰ کہ اگر پُر امن طریقِ کار کا نتیجہ بظاہر شکست کی صورت میں نکلے تب بھی وہ فتح ہے۔ اس لیے کہ پُر امن طریقِ کار کی صورت میں آدمی جنگ کو کھوتا ہے مگر وہ مواقع کو نہیں کھوتا۔ مواقع اور امکانات اب بھی اُس کے پاس موجود ہوتے ہیں۔ وہ ان مواقع کو استعمال کر کے دوبارہ ایک نئی جدوجہد شروع کر سکتا ہے اور از سرِ نو اپنی کامیابی کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

شکایت کو فوراً ختم کرنا

شکایتی مزاج ایک قاتلانہ مزاج ہے۔ شکایتی مزاج آدمی کے اندر منفی سوچ پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو مثبت سوچ سے محروم کر دیتا ہے۔ اور اس قسم کا مزاج بلاشبہہ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اکثر تشدد کے پیچھے شکایتی مزاج ہی کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

موجودہ دنیا کا تخلیقی نظام کچھ اس طرح بنا ہے کہ یہاں لازماً ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ایسے موقع پر کرنے کا کام یہ ہے کہ شکایت کا خیال آتے ہی فوراً اُس کو اپنے دماغ سے نکال دیا جائے۔ شکایت جب پیدا ہوتی ہے تو پہلے وہ آدمی کے شعوری ذہن (conscious mind) میں ہوتی ہے۔ اگر اُس کو یاد رکھا جائے یا بار بار دہرایا جائے تو وہ دھیرے دھیرے آدمی کے غیر شعوری ذہن (unconscious mind) میں چلی جاتی ہے۔ اور اس طرح بیٹھ جاتی ہے کہ اس کے بعد کسی طرح اُس کو نکالا نہیں جا سکتا۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ شکایت کے معاملہ میں وہ ''گُربہ کشتن روزِ اول'' کا معاملہ کیا جائے۔ شکایت پیدا ہوتے ہی اس کو فوراً ختم کر دیا جائے۔ اگر پہلے ہی مرحلہ میں اُس کو ختم نہ کیا

جائے تو دھیرے دھیرے وہ آدمی کی نفسیات کا مستقل جزء بن جائے گی۔ اس کے بعد آدمی کی سوچ منفی سوچ بن جائے گی۔ وہ دوسروں کو اپنا دشمن سمجھ لے گا۔ اگر موقع ہو تو وہ دوسروں کے خلاف تشدد پر اُتر آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ زیر شکایت لوگوں سے عملی ٹکراؤ شروع کر دے گیا، خواہ اس کا نتیجہ برعکس صورت میں کیوں نہ ظاہر ہو۔

شکایت کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کرنے کا فارمولا کیا ہے، وہ فارمولا قرآن کے الفاظ میں یہ ہے: **وما أصابكم من مصيبة فبما كسبت ايديكم** (الشوریٰ ۳۰) یعنی جو مصیبت بھی تم پر آتی ہے وہ تمہارے اپنے ہی ہاتھوں کی کمائی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی آپ کو دوسرے کے خلاف شکایت پیدا ہو تو فوراً آپ کو یہ کرنا چاہیے کہ شکایت کا رُخ اپنی طرف کرلیں۔ معاملہ کی کوئی ایسی توجیہہ ڈھونڈیں جس میں قصور خود آپ کا نکلتا ہو۔ جب آپ کو یہ احساس ہوگا کہ کوتاہی خود آپ کی ہے، نہ کہ کسی غیر کی تو ایسی حالت میں یہ ہوگا کہ آپ اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے میں لگ جائیں گے، نہ کہ کسی مفروضہ دشمن کے خلاف فریاد اور احتجاج میں وقت ضائع کریں گے۔

دہشت گردی کیا ہے

موجودہ زمانہ میں ایک برائی ظاہر ہوئی ہے جس کو دہشت گردی (terrorism) کہا جاتا ہے۔ دہشت گردی کو عام طور پر کنڈم کیا جاتا ہے مگر دہشت گردی کیا ہے، اس کی کوئی واضح تعریف غالباً ابھی تک سامنے نہ آسکی۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے میں نے سمجھا ہے کہ دہشت گردی نام ہے، غیر حکومتی تنظیموں کا ہتھیار اُٹھانا (armed action by NGOs)۔

اسلام کے متفقہ اصول کے مطابق، جنگ کا اعلان صرف ایک قائم شدہ حکومت کا کام ہے (الرحیل للإمام) وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں دہشت گردی کہا جاتا ہے، وہ سب کی سب غیر حکومتی تنظیموں کے مسلّح اقدام کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہیں۔ اس قسم کی مسلّح تحریک بلاشبہہ اسلام میں ناجائز ہے۔ عوام کو پُر امن انداز میں اپنی بات کہنے کا حق ہے مگر کسی بھی عذر کی بنا پر مسلح تحریک چلانا عوام کے لئے ہرگز جائز نہیں۔

مزید یہ کہ ایک قائم شدہ حکومت کے لیے بھی جنگی اقدام کی کئی لازمی شرطیں ہیں۔ مثلاً ایک

قائم شدہ حکومت بھی صرف دفاعی جنگ کرسکتی ہے، جارحانہ جنگ چھیڑنے کا حق حکومت کو بھی نہیں۔ اسی طرح ایک جائز جنگ بھی اعلان کے ساتھ لڑی جائے گی۔ بلا اعلان جنگ (undeclered war) کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں۔ اسی طرح ایک جائز دفاعی جنگ میں بھی حکومت صرف مقاتل (combatants) پر وار کرسکتی ہے، غیر مقاتل (non-combatants) کو مارنا یا اُن کو نقصان پہنچانا جنگ کی حالت میں بھی ہرگز جائز نہیں۔

ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم کا جواز ہے، اور وہ دفاعی جنگ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی جنگ، مثلاً —— جارحانہ وار، پراکسی وار، گوریلا وار اور پھر بلا اعلان وار، یہ سب کی سب اسلام میں قطعی ناجائز ہیں۔ کسی بھی عذر کی بنا پر اس قسم کی جنگوں کو اسلامی جنگ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مذکورہ تعریف کے مطابق، دہشت گردی کی ہر تحریک یقینی طور پر ناجائز ہے، ایسی کسی تحریک کو اسلامی جہاد کا نام دینا اُس کو جائز نہیں بناتا۔ ایسی ہر کوشش گُناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے، وہ یقینی طور پر ایسی کسی جنگ کا اسلامی جواز نہیں۔

کھلی مذمت ضروری

قرآن وحدیث میں اہل ایمان کو جو احکام دیے گئے ہیں اُن میں سے ایک حکم وہ ہے جس کو انکار منکر کہا جاتا ہے۔ یعنی برائی کو دیکھنے کے بعد کھلے الفاظ میں اُس کی مذمت کرنا۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ کسی سماج میں اگر بُرائی ہو رہی ہو تو اُس کو دیکھ کر چپ رہنا ایک سنگین جرم ہے۔ کسی آدمی کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ وہ براہِ راست طور پر بُرائی میں شریک نہیں۔ اگر وہ برائی کو دیکھنے کے باوجود چپ رہے تو وہ بالواسطہ طور پر اُس کا مجرم قرار پائے گا۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں مسلمان جگہ جگہ جہاد کے نام پر وہ کام کر رہے ہیں جس کو ساری دنیا کا پریس دہشت گردی کے عنوان سے رپورٹ کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس معاملہ میں دنیا کے تقریباً تمام مسلمان خدا کی نظر میں مجرم ثابت ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے علم کے مطابق، ساری

دنیا میں کوئی بھی قابلِ ذکر مسلمان نہیں جو تشدد کی اس برائی کو کھلے طور پر کنڈم کرتا ہو۔

مسلمانوں کی ایک تعداد وہ ہے جو اس متشددانہ سرگرمی کو عین اسلامی جہاد قرار دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ خودکُش بمباری (suicide bombing) کو استشہاد (طلب شہادت) کا نام دے کر اُس کو عین درست بتاتی ہے۔ مسلمانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو مذمت کے الفاظ بولتا ہے مگر حقیقت میں وہ مذمت نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ کہیں گے کہ اسلام میں دہشت گردی نہیں، اسلام دہشت گردی کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر وہ یہ نہیں کہیں گے کہ فلاں فلاں مقام پر مسلمان جو متشددانہ تحریک چلا رہے ہیں وہ دہشت گردی ہے اور وہ اسلام کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں اُن کی مذمت ایک خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کا ایک اور گروہ ہے جو بظاہر نام لے کر مذمت کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ ایسے دفاعی الفاظ بھی بولتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ اس دہشت گردی کی اصل ذمہ داری مسلم دشمنوں کی ہے، نہ کہ خود مسلمانوں کی۔

مذمت کے یہ طریقے یقینی طور پر غیر اسلامی ہیں۔ مذمت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نہ صرف دہشت گردی کو خلاف اسلام بتایا جائے بلکہ مختلف مقامات پر جہاد کے نام پر جو دہشت گردی ہو رہی ہے اُس کو کھلے لفظوں میں رد کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ جہاد نہیں ہے بلکہ فساد ہے۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کی یہی مجرمانہ خاموشی ہے جس کی بنا پر یہ ہو رہا ہے کہ جہاد کے نام پر ہونے والا تشدد کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ اس مجرمانہ تشدد میں خود ساختہ مجاہدین اگر براہ راست شریک ہیں تو بقیہ مسلمان بالواسطہ طور پر اس میں شریک ہیں۔ اور اسلامی نقطۂ نظر سے، براہ راست شرکت اور بالواسطہ شرکت کے درمیان صرف ڈگری کا فرق ہے، اُن کے درمیان نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔

ناکامی کا کیس

امن کی طاقت تشدد کی طاقت سے زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ امن دانش مندوں کا طریقہ ہے اور تشدد نادانوں کا طریقہ۔ ایسی حالت میں جب کوئی شخص تشدد کرتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ طاقتور طریقہ استعمال کرنے میں ناکام رہا۔ اسی طرح ایسا آدمی

اپنے متشددانہ عمل سے یہ بھی ثابت کررہا ہے کہ وہ اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے معاملہ میں ایک نادان آدمی ثابت ہوا، نہ کہ دانش مند آدمی۔

امن اور تشدد سادہ طور پر صرف دو طریقے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ انسانیت کے دو مختلف معیار ہیں۔ امن کا طریقہ اختیار کرنے والا آدمی اپنی انسانیت کو بلند کرتا ہے اور تشدد کا طریقہ اختیار کرنے والا آدمی اپنے آپ کو انسانیت کے اعلیٰ معیار سے نیچے گرالیتا ہے۔

کوئی مسئلہ پیش آنے کے بعد جب ایک آدمی امن کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر مثبت سوچ کو فروغ دیتا ہے۔ وہ اپنے اخلاقی معیار کو بلند کرتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو عملی طور پر ثابت شدہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس جب ایک آدمی اپنے مسئلہ کے حل کے لیے تشدد کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو انسانیت کے نچلے درجہ کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو عملی طور پر مشتبہ بنارہا ہے۔

امن اور تشدد دونوں کسی انسان کی اصل حیثیت کی پہچان ہیں۔ ایک طریقہ اگر انسان کو انسان ثابت کرتا ہے تو دوسرا طریقہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک حیوان تھا، اگرچہ ظاہری طور پر وہ ایک انسان دکھائی دے رہا تھا۔

مذہب خطرہ میں ہے

نفرت اور تشدد کا ایک سبب وہ جذباتی سیاست ہے جو اس نعرہ پر چلتی ہے کہ مذہب خطرہ میں ہے۔ کچھ لکھنے اور بولنے والے لوگ غلط یا مبالغہ آمیز تصویر پیش کرکے عوام کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ اُن کا مذہب دوسروں کی طرف سے خطرہ میں ہے۔ اب تحفظ مذہب کے نام پر جلسہ اور جلوس اور نعرے اور جھنڈے کی سیاست چل پڑتی ہے۔ یہ سیاست مذہب کو تو خطرہ سے نہیں بچاتی البتہ مذہب کو خطرہ سے بچانے کے نام پر پورے سماج کے امن کو تباہ کرکے اُس کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔

اگر مذہب خطرہ میں ہو تو ظاہر ہے کہ کوئی غیر ہوگا جو مذہب کو خطرہ میں ڈالے ہوئے ہوگا۔ اس طرح ''مذہب خطرہ میں'' جیسی سیاست ایک گروہ کے دل میں دوسرے گروہ کے خلاف نفرت پیدا

کرتی ہے۔ پھر نفرت کی سیاست سے جب مذہب کے خلاف مفروضہ خطرہ ختم نہیں ہوتا تو اس کے بعد لوگوں کے اندر مایوسی کی سیاست شروع ہوتی ہے۔ مایوسی کی سیاست اپنی آخری تدبیر کے طور پر تشدد کی سیاست جاری کر دیتی ہے۔ پھر جب تشدد کی سیاست کارگر ثابت نہیں ہوتی تو خودکُشی کی سیاست شروع ہو جاتی ہے۔ جوش میں بھرے ہوئے نوجوان اپنی بڑھی ہوئی نفرت کو اپنے مفروضہ دشمن کے خلاف خودکش بمباری کی صورت میں انڈیل دیتے ہیں۔ مذہبی خطرہ کی سیاست اپنی آخری حد پر پہنچ کر مذہبی خودکُشی کی سیاست بن جاتی ہے۔ زندگی کے نام پر اُٹھنے والے لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے صرف موت کا پیغام ثابت ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تباہ کن سیاست سے نکلنے کا واحد حل یہ ہے کہ تشدد کو ایک ایسا فعل قرار دیا جائے جو ہر حال میں قابل ترک ہو۔ کوئی بھی عذر، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی بڑا ہو، تشدد کے طریقہ کو استعمال کرنے کے لیے کافی نہ سمجھا جائے۔

موجودہ دنیا اختلافات کی دنیا ہے۔ ہر آدمی مسٹر ڈفرنٹ اور ہر عورت مز ڈفرنٹ ہے۔ اس لیے اس دنیا میں لازمی طور پر لوگوں کے درمیان طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی اختلاف جذباتی صورت اختیار کر کے لوگوں کو نفرت اور تشدد تک پہنچا تا ہے۔ اور پھر سارا سماج قبرستان کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ تم کو ہر حال میں امن کے دائرہ میں کام کرنا ہے۔ کسی بھی حال میں تم کو امن کے دائرہ سے باہر نہیں جانا ہے۔ یہ ذہن اُس وقت بن سکتا ہے جب کہ لوگوں کو اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کیا جائے کہ اس دنیا میں کوئی کام صرف امن کے ذریعہ بنتا ہے، تشدد کے ذریعہ کبھی کوئی کام بننے والا نہیں۔ تشدد صرف تخریب میں معاون ہوتا ہے، تشدد کبھی تعمیر میں معاون نہیں ہوتا۔

''مذہب خطرہ میں'' جیسی سیاست کے ذریعہ کا یہ فائدہ تو ہوتا ہے کہ کچھ ہائی پروفائل میں بولنے والے لوگ قائد بن کر اُبھر آئیں۔ وہ وقتی طور پر لوگوں میں نمایاں ہو جائیں۔ اُن کے گرد عوام کی

بھیڑ اکٹھا ہو۔ مادّی رونقیں اُنہیں حاصل ہوجائیں۔مگر جہاں تک مذہب اوراہلِ مذہب کا تعلق ہے، اُن کے حصہ میں صرف یہ آتا ہے کہ معتدل ماحول سے محروم ہوکر وہ نفرت کے ماحول میں جینے پر مجبور ہوجائیں۔تشدد کا شکار ہوکر وہ اپنے مستقبل کو غیر محفوظ بنالیں۔

مذکورہ قسم کی سیاست کا آخری نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کچھ افراد ممتاز افراد (celebreties) بن کر نمایاں ہوجائیں۔مگر یہ طریقہ مثبت معنوں میں قوم کی تعمیر نہیں کرتا اور نہ کرسکتا ہے۔ یہ طریقہ لیڈر سازی کے لیے کارآمد ہے،مگر وہ ملت سازی کے لیے ہرگز کارآمد نہیں۔

انتقام سے تشدد تک

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کو دوسرے شخص سے کوئی تکلیف پہنچ جائے یا ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طرف سے کوئی ٹھیس پہنچے تو فوراً اُن کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ فریقِ ثانی سے انتقام لینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ایسے لوگ تاریخ کی اس وارننگ کو بھول جاتے ہیں جو ہرجگہ خاموش الفاظ میں گونج رہی ہے ـــــــ انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف انتقام کی کارروائی کرتا ہے۔ پھر دوسرا فریق دوبارہ پہلے فریق سے انتقام لیتا ہے۔اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے جو صرف اُس وقت ختم ہوتا ہے جب کہ دونوں اتنے تباہ ہوجائیں کہ وہ مزید انتقام لینے کے قابل نہ رہیں۔کسی فرد یا گروہ کے خلاف کوئی قابل شکایت بات پیش آئے تو اُس کا حل جوابی کارروائی نہیں ہے بلکہ اُس کو درگذر کرکے آگے بڑھ جانا ہے۔ درگذر کرنے سے معاملہ پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہوجاتا ہے۔ اور اگر درگذر نہ کیا جائے تو نفرت اور انتقام اور تشدد کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انتقام کا رُخ دوسرے کے خلاف ہوتا ہے مگر اس کا سب سے زیادہ شکار خود انتقام لینے والا بنتا ہے۔ انتقامی پالیسی کی بھاری قیمت اُس کو یہ دینی پڑتی ہے کہ اُس کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جائے۔ وہ اپنے وسائل کو اپنی تعمیر میں صرف کرنے کے بجائے اُنہیں صرف دوسرے کی تخریب

میں صرف کرنے لگے۔ دوسرے فریق نے اگر آپ کو پچاس فی صد نقصان پہنچایا تھا تو آپ اپنی انتقامی کارروائی کے نتیجہ میں اپنی بقیہ پچاس فی صد طاقت کو بھی ضائع کر دیتے ہیں۔

انتقام کا مطلب یہ ہے کہ قاتلانہ حملہ کے بعد کوئی شخص خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتقام ہر حال میں بُرا ہے اور انتقام نہ لیتے ہوئے معاملہ کو بھُلا دینا ہر حال میں اچھا ہے۔ انتقام لینے والا اگر آپ کا دشمن تھا تو انتقام لے کر آپ خود اپنے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے دشمن آپ بن جائیں اُن کو تباہی سے کون بچا سکتا ہے۔

جنگ کا زمانہ ختم

وسیع تر تقسیم میں جنگ کے دو دور ہیں۔ ایک وہ ابتدائی دور جب کہ جنگی مقابلہ کا فیصلہ تلوار کے ذریعہ ہوتا تھا۔ دوسرا دور جدید دور ہے جب کہ لڑائی میں بم کی طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ دونوں دوروں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ تلوار جب چلائی جاتی تھی تو وہ صرف ایک دشمن کی گردن کو کاٹتی تھی۔ اب بم کے زمانہ میں جنگ کا مطلب یہ نہیں۔ اب جنگ کا مطلب صرف تباہی ہے۔ جو بم دشمن کے اوپر ڈالا جاتا ہے وہ مختلف پہلوؤں سے خود ڈالنے والے کے لیے بھی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ ایسی حالت میں جنگ ایک بے فائدہ عمل بن چکی ہے۔ اب جنگ ایک دیوانگی ہے، نہ کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے اقدام۔

حقیقت یہ ہے کہ نئے ہتھیاروں کے ظہور کے بعد جنگ اب ایک قابلِ ترک چیز بن چکی ہے۔ جب جنگ مثبت معنوں میں بے نتیجہ ہو جائے تو ایسی حالت میں جنگ چھیڑنا ایک دیوانگی ہے، نہ کہ عقل مندی۔

زمانہ کے خلاف

موجودہ زمانہ گلوبلائیزیشن (globlisation) کا زمانہ ہے۔ ساری دنیا ایک گلوبل ویلیج کی مانند ہو گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو موجودہ زمانہ میں تشدد یا مسلّح جدوجہد ایک ایسی چیز بن چکی ہے جو زمانہ کے خلاف عمل (anachronism) کی حیثیت رکھتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ ہتھیار کی لڑائی لڑ رہے ہیں اُن سے پوچھئے کہ وہ کیوں جنگ کر رہے ہیں تو وہ بتائیں گے کہ قائم شدہ حکومت کو بدلنے کے لیے وہ جنگ کر رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہم ایک نیا نظام بنانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے حکومت پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ بات صرف زمانہ سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایسی تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ اب کسی کو حکومت پر قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ حکومت پر قبضہ کئے بغیر ہر وہ کام کر سکتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

برداشت کی ضرورت

عدم برداشت کا نتیجہ تشدد ہے، اور برداشت کا نتیجہ امن۔ انہی دو لفظوں میں امن اور تشدد کا خلاصہ پایا جاتا ہے۔ جس سماج میں برداشت کی صفت ہو، اس سماج میں امن کا ماحول رہے گا۔ اور جس سماج کے لوگوں میں برداشت کا مزاج نہ ہو وہاں تشدد ہونے لگے گا۔ اور تشدد نہ تشدد کرنے والے کے لیے مفید ہے اور نہ اُن لوگوں کے لیے مفید جن کے اوپر تشدد کیا گیا ہے۔

برداشت ایک اعلیٰ اخلاقی اور انسانی صفت ہے۔ اس کے مقابلہ میں برداشت نہ کرنا ایک حیوانی صفت ہے۔ برداشت مجبوری نہیں، برداشت ایک اعلیٰ ترین عمل ہے۔ لوگ جس مقصد کو بے برداشت طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کو برداشت کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آنے پر آدمی جب بے برداشت ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو مقابلہ کے لیے کمزور کر لے گا۔ لیکن جب وہ ناخوش گوار صورت حال میں برداشت کے رویّہ پر قائم رہے تو وہ اپنی ساری طاقتوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ وہ زیادہ مؤثر طور پر پیش آمدہ صورت حال کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

ناخوش گوار صورت حال پیش آنے کے باوجود بے برداشت نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اپنے آپ پر کنٹرول کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ طاقت ہو کہ وہ اپنے آپ پر کنٹرول کر سکے، وہ اتنا زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے کہ کسی کے لیے بھی اُس کو شکست دینا ممکن نہیں۔

امن کے فائدے

دنیا کے تمام اچھے کام پر امن کوشش کے ذریعہ ہوئے ہیں۔ تشدد کی طاقت سے کبھی کوئی اچھا کام نہیں ہوا۔ کوئی پُل، کوئی سڑک کبھی بھی تشدد کی طاقت سے نہیں بنے۔ سائنس کی دریافتیں اور ٹکنالوجی کی ترقیاں کبھی تشدد کی طاقت سے ظہور میں نہیں آئیں۔ تعلیم گاہیں اور تحقیق کے ادارے کبھی تشدد کی طاقت سے نہیں بنے۔ لوہے کا مشین میں ڈھلنا یا سٹی پلاننگ جیسے کام امن کے ذریعہ انجام پائے، نہ کہ تشدد کے ذریعہ۔ سماجی فلاح سے لے کر انفراسٹرکچر تک ہر کام ہمیشہ پُر امن تدبیروں کے ذریعہ تکمیل پذیر ہوئے ہیں۔

تشدد ایک تخریبی عمل ہے۔ اور ایک تخریبی عمل کے ذریعہ کبھی کوئی تعمیری واقعہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اور فطرت کے قانون میں تبدیلی ممکن نہیں۔

مسلم پالیسی کو بدلنے کی ضرورت

اپریل ۲۰۰۲ء کے آخری ہفتہ میں مکہ میں رابطہ عالم اسلامی کی چوتھی عالمی کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف ملکوں کے مسلم علماء اور دانشور تقریباً پانچ سو کی تعداد میں شریک ہوئے۔ اس کا موضوع ''اسلام اور گلوبلائزیشن'' بتایا گیا۔ اس کانفرنس کی ایک رپورٹ لاہور کے ماہنامہ محدث (مئی ۲۰۰۲) میں دیکھی۔ اس کا ایک حصہ یہاں کسی قدر تصرف کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے:

> بوسنیا کے رئیس العلماء مصطفیٰ سیرچ نے سابق صدر بوسنیا عزت بیگو وچ کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ ہم بوسنیا کے تلخ تجربہ کی روشنی میں یہ کہنا مناسب سمجھتے ہیں کہ عربوں کو اسرائیل سے صلح وآشتی کا راستہ اختیار کر لینا چاہئے۔ دکتور یوسف القرضاوی فوراً مائیک پر آئے اور نہایت شدید الفاظ میں عزت بیگوچ کے اس نظریہ کی تردید کی۔ رپورٹ کے مطابق، بظاہر پوری کانفرنس میں کوئی شخص بھی عزت بیگوچ کی حمایت میں بولنے کے لیے کھڑا نہیں ہوا (صفحہ ۵۴)۔

جس زمانہ میں عزت بیگو وچ نے بوسنیا کے آزاد مسلم مملکت ہونے کا اعلان کیا اور اس کے نتیجہ

میں وہاں خونی جنگ چھڑ گئی، اُس وقت ساری مسلم دنیا میں عزت بیگووچ ہیرو بن گئے۔ مگر آج یہی عزت بیگووچ جب امن اور صلح کی بات کرتے ہیں تو اب وہ مسلمانوں کے یہاں زیرو بنے ہوئے ہیں۔ اس واقعہ پر غور کیجئے تو کچھ سبق آموز باتیں سامنے آئیں گی۔

۱۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان محصور ذہنیت (beseaged mentality) میں جی رہے ہیں۔ اُن کے نااہل دانشوروں اور لیڈروں نے اُنہیں یہ بتا رکھا ہے کہ وہ مظلوم ہیں اور دشمنوں کی سازش کا شکار ہو رہے ہیں۔ جو لوگ ایسی نفسیات میں مبتلا ہوں اُن کا حال یہ ہوگا کہ وہ لڑائی کی زبان تو سمجھیں گے مگر وہ صُلح کی زبان سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

۲۔ مسٹر عزت بیگووچ نے جو پیغام بھیجا وہ ایک ادھورا پیغام تھا۔ اس بنا پر وہ کسی کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔ عزت بیگووچ کا پیغام اپنی موجودہ شکل میں صرف مجبوری کے ہم معنیٰ ہے۔ اور کوئی بھی مسلمان مجبوری کے تحت کسی پالیسی کو اختیار کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔ عزت بیگووچ کو چاہیے کہ وہ مسلح اقدام کے بجائے پُر امن اقدام کا طریقہ دریافت کریں۔ اس کے بعد لوگوں کے لیے اُن کا پیغام قابل فہم اور قابلِ قبول بن جائے گا۔

۳۔ مکہ کی مذکورہ کانفرنس کی روداد کو دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں بولنے والے تمام مسلمان صرف شکایت اور احتجاج کی بولی بولتے رہے، وہ مسائل پر تقریریں کرتے رہے۔ یہی موجودہ زمانہ میں تمام مسلم کانفرنسوں کا حال ہے۔ ہر کانفرنس میں صرف مسائل کا پُر شور تذکرہ ہوتا ہے۔ علماء اور دانشوروں کے اس مزاج نے موجودہ زمانہ کی تمام مسلم کانفرنسوں کو سراسر بے نتیجہ بنا دیا ہے۔ کانفرنس کا مقصد مواقع کار کی مثبت نشاندہی ہونا چاہئے، نہ کہ مسائل کے نام پر منفی چیخ و پکار، قرآن کے الفاظ میں، عُسر میں یُسر کی نشان دہی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے جب نبوت کے تیرہویں سال مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو اُس وقت آپ مسائل کے جنگل سے گذر کر وہاں پہنچے تھے۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے وہاں کے لوگوں کے سامنے جو پہلا خطبہ دیا وہ ابن ہشام نے اس عنوان کے ساتھ نقل کیا ہے:

أول خطبة خطبها رسول الله صلى الله عليه وسلم فى المدينة

(رسول اللہ ﷺ کا پہلا خطبہ جو آپ نے مدینہ میں دیا)۔

یہ پورا خطبہ سیرت ابن ہشام میں آج بھی موجود ہے۔ اُس کو پڑھیے تو اُس میں ایک لفظ بھی شکایت اور احتجاج کا نہیں ملے گا۔ اس پورے خطبہ کا خلاصہ اُن کے اس جملہ میں ہے: اتقوا النار و لو بشق تمرة (اپنے آپ کو آگ سے بچاؤ، خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو)۔

عجیب بات ہے کہ اسی رسول کے امتی آج رسول کی سنت کے برعکس شکایت اور احتجاج کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ حتیٰ کہ مکہ اور مدینہ میں بھی یہی خلاف سنت کام نہایت دھوم کے ساتھ جاری ہے۔ کوئی اللہ کا بندہ اگر اُنہیں اس روش کو ترک کرنے کی نصیحت کرے تو وہ اُس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی خلافِ سنت سرگرمیاں بلاشبہہ خدا کے غضبکو دعوت دینے والی ہیں، خواہ یہ سرگرمیاں مقدس مقامات پر کیوں نہ کی جارہی ہوں۔

اصل یہ ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے انسانوں کا ظلم نہیں ہے بلکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا انتباہ ہے۔ یہ سب مسلمانوں کو چوکنّا کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ مسلمانوں کے لیے فلاح کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ توبہ کریں۔ وہ تشدد کا راستہ مکمل طور پر چھوڑیں اور امن کا راستہ مکمل طور پر اختیار کرلیں۔ اسلام یا اہل اسلام کے نام پر وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اُس کو امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے انجام دیں۔ اس کے سوا اُن کے لیے فلاح اور کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔

متفرق مسائل

ہجر جمیل

قرآن کی سورہ نمبر ۷۳ میں ایک حکم ان الفاظ میں آیا ہے: **واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجراً جمیلاً** (المزمل ۱۰) اُردو مترجمین نے اس آیت کے جو ترجمے کئے ہیں اُن میں سے چند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

۱۔اور سہتارہ جو کہتے رہیں اور چھوڑ اُن کو بھلی طرح کا چھوڑنا (شاہ عبدالقادر)

۲۔اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اُن پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ اُن سے الگ ہو جاؤ۔ (اشرف علی تھانوی)

۳۔اور سہتارہ جو کچھ وہ کہتے رہیں اور چھوڑ دے اُن کو بھلی طرح کا چھوڑنا۔(محمود حسن، دیوبندی)

۴۔اور یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اُس پر صبر کر اور اُن کو خوبصورتی سے نظر انداز کر۔(امین احسن اصلاحی)

اس آیت کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا جائے تو وہ اس طرح ہوگا:

Endure patiently what ever they say,
and avoid them in a decent manner.

قرآن کی یہ آیت مکی دور میں اُتری۔ اُس وقت مکہ میں مشرکین کا غلبہ تھا۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ رسول اور اصحاب رسول نے اُن کے آبائی دین سے انحراف کیا ہے۔ اس بنا پر وہ لوگ رسول اور اصحاب رسول کو ستانے لگے۔ اُنہوں نے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ اس ماحول میں قرآن کی یہ آیت اُتری۔ اس میں خدا کی طرف سے یہ حکم دیا گیا کہ تم لوگ صبر کرو اور ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کرو۔

ہجر جمیل کے لفظی معنیٰ ہیں ــــ خوبصورتی کے ساتھ چھوڑنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ستانے والوں کے ساتھ حسن اعراض کا طریقہ اختیار کرو۔ ان کے معاملہ میں تمہارا طریقہ منفی ردعمل کا طریقہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ مثبت ردعمل کا طریقہ ہونا چاہئے۔ تم کو چاہئے کہ اُن کے معاملہ میں درگذر کرو اور اُن کے برے انداز کے مقابلہ میں تم اُن کے ساتھ اچھا انداز اختیار کرو۔

مفسرین نے عام طور پر یہ لکھا ہے کہ صبر اور ہجر جمیل کا یہ حکم آیات قتال کے نزول کے بعد منسوخ ہوگیا۔ مگر یہ ایک غلط تفسیر ہے۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) کوئی مجبوری کا فعل نہیں ہے، یہ اہل ایمان کا ایک مثبت رویہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن منفی ردعمل کا تحمل نہیں کرسکتا۔ شکایت کی نفسیات شکر کے جذبہ کی قاتل ہے اس لیے مومن یک طرفہ طور پر شکایت کے جذبات کو ختم کرتا ہے تاکہ اُس کے اندر شکر کا جذبہ مجروح نہ ہونے پائے۔ اسی طرح نفرت کی نفسیات محبت کے جذبہ کی قاتل ہے اس لیے مومن نفرت کی نفسیات کو اپنے اندر پنپنے نہیں دیتا تاکہ اُس کے اندر محبت الٰہی کا جذبہ پوری طرح باقی رہے۔ اس کام کو کبھی سختی سے کرنا پڑتا ہے اور کبھی حسن تدبیر سے۔

ہجر جمیل (حسن اعراض) بظاہر دوسرے کے مقابلہ میں ہوتا ہے مگر اُس کا تعلق خود اپنی ذات سے ہے۔ مومن آخری حد تک یہ چاہتا ہے کہ اُس کے اندر اعلیٰ اسلامی احساس ہمیشہ زندہ رہے۔ کسی بھی حال میں اُس کے اندر نقصان (erosion) نہ ہونے پائے۔

قرآن کے مطابق، اللہ نے کسی انسان کے اندر دو دل نہیں بنائے۔ (الاحزاب ۴) یعنی انسان کے دل میں بیک وقت دو متضاد نفسیات پرورش نہیں پاسکتیں۔ جو دل انسان سے نفرت کرے، عین اُسی وقت وہ خدا سے محبت نہیں کرسکتا۔ جس دل کے اندر انسانوں کے بارے میں شکایات بھری ہوئی ہوں وہ دل کبھی خدا کے شکر سے سرشار نہیں ہوسکتا۔ جس آدمی کا سینہ انتقامی نفسیات کا جنگل بنا ہوا ہو وہ خدا سے طلبِ عفو کی لذت کا تجربہ نہیں کرسکتا۔ جو انسان ظلم کی یادوں میں جی رہا ہو وہ خدائے رحمٰن ورحیم کی یادوں کا تجربہ نہیں کرسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ صبر اور حسن اعراض مومن کے لیے ایک خود حفاظتی تدبیر ہے۔ یہ اپنے آپ کو اس سے بچانا ہے کہ اُس کے سینے میں غیر مومنانہ نفسیات کی پرورش ہونے لگے۔ اس لیے جب بھی ایسا کوئی موقع پیش آتا ہے تو مومن کہہ اُٹھتا ہے کہ میں اس قسم کی منفی سوچ کا تحمل نہیں کرسکتا۔ یہاں اس معاملہ کی مزید وضاحت کے لیے رسول اور اصحاب رسول کی زندگی سے حسن اعراض کی کچھ عملی مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

ا۔ ابن اسحٰق کی روایت ہے کہ مکہ کے قریش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو کرتے تھے اور سبّ وشتم کرتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے آپ کا نام محمد کے بجائے مذمّم رکھ دیا تھا۔ محمد کا مطلب ہے، تعریف کیا ہوا۔ اس کے بجائے وہ آپ کو مذمّم (مذمت کیا ہوا) کہتے تھے۔ روایت کے مطابق، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: **ألا تعجبون لما صرف الله عني من اذى قريش، يسبون ويهجون مذمما وأنا محمد**۔ (سیرت ابن ہشام جلد ا، صفحہ ۳۷۹)
یعنی کیا تم کو تعجب نہیں کہ اللہ نے مجھے قریش کی اذیت سے کس طرح بچالیا، وہ سبّ وشتم کرتے ہیں اور مذمم کہہ کر ہجو کرتے ہیں، حالاں کہ میں محمد ہوں۔

پیغمبر اسلام کے اس قول کو اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ مثلاً قریش اگر یہ کہیں کہ ''مذمّم مجنون ہے'' تو رسول اللہ اس کا بُرا اثر نہ لیتے ہوئے یہ کہہ دیں گے کہ تمہاری یہ بات اُس کے اوپر پڑے گی جس کا نام مذمّم ہو، میرا نام تو محمد ہے۔ یہ حسن اعراض کی ایک لطیف مثال ہے۔ اس طرح مومن اپنے آپ کو اس نقصان سے بچاتا ہے کہ کسی کی بدگوئی اُس کے اندر منفی نفسیات پیدا کرنے کا سبب بن جائے۔ مومن کا قول یہ ہوتا ہے کہ میں منفی جذبات کا تحمل نہیں کرسکتا۔

اس طرح کے حسن اعراض کی ایک دلچسپ مثال ڈاکٹر ذاکر حسین کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ایک بار وہ دہلی کی ایک سڑک پر اپنی گاڑی چلا رہے تھے، اتفاق سے اُن کی گاڑی ایک اور شخص کی گاڑی سے معمولی طور پر ٹکرا گئی۔ اُن کی گاڑی میں رگڑ (dent) آ گیا۔ اُس آدمی نے ابھی نئی گاڑی لی تھی۔ وہ گاڑی روک کر اُترا۔ ذاکر صاحب بھی اپنی گاڑی روک کر اُتر گئے۔ اُس آدمی نے ذاکر صاحب کی طرف غصہ سے دیکھتے ہوئے کہا کہ ایڈیٹ (idiot)۔ اس انگریزی لفظ کے معنیٰ ہوتے ہیں، احمق۔ ذاکر صاحب نے جوابی غصہ نہیں دکھایا۔ اُنہوں نے اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا:

Sir, I am not Mr. Idiot, I am Zakir Husain.

جناب، میں مسٹر ایڈیٹ نہیں ہوں۔ میں ذاکر حسین ہوں۔ یہ سُن کر اُس آدمی کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا۔ ساری (sorry) کہہ کر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی گاڑی پر بیٹھا اور آگے کے لیے روانہ ہوگیا۔

۲۔ ہجرت کے بعد حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا۔ مکہ کے سرداروں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے صحابہ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اُس وقت حدیبیہ کے مقام پر دونوں فریقوں کے درمیان ایک معاہدۂ امن تیار کیا گیا۔ اس معاہدہ کے وقت قریش نے ضد کا مظاہرہ بھی کیا اور تشدد کا مظاہرہ بھی۔ اُنہوں نے اصرار کیا کہ اُن کی یک طرفہ شرطوں پر معاہدہ کیا جائے۔ اصحاب رسول کو اس سے بے حد تکلیف ہوئی۔ اس طرح کی شرطوں پر معاہدہ کرنا اُن کو بظاہر ایک ذلت کا معاہدہ معلوم ہوتا تھا۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ: قریش آج جو خاکہ بھی پیش کریں گے، بشرطیکہ اُس میں صلہ رحمی کو ملحوظ رکھا گیا ہو، میں ضرور اُس پر راضی ہو جاؤں گا (سیرت ابن ہشام، الجزء ۳، صفحہ ۳۵۸) دشمن کی یک طرفہ شرطوں کو ماننا ایک سخت ناگوار معاملہ تھا۔ مگر آپ نے مذکورہ بات کہہ کر اس ناگوار کو ایک گوارا معاملہ بنالیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ہجر جمیل کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔ قدیم عربوں کے نزدیک صلہ رحمی بہت بڑی انسانی قدر سمجھی جاتی تھی۔ اور قطع رحمی کو وہ بہت بُرا سمجھتے تھے۔ اس لیے اس کا سوال ہی نہ تھا کہ وہ معاہدہ کے لیے ایسا خاکہ پیش کریں جس میں قطع رحم کی دفعہ رکھی گئی ہو۔ باعتبار حقیقت رسول اللہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ میں ہر قیمت پر قریش سے صلح کرلوں گا۔ اس بات کو کہنے کے باعزت طریقہ کے طور پر آپ نے فرمایا کہ میں قریش کی طرف سے صُلح کے ہر خاکہ کو منظور کرلوں گا بشرطیکہ اُس میں قطع رحم نہ پایا جاتا ہو۔ حالاں کہ پیشگی طور پر یہ معلوم تھا کہ وہ قطع رحم کی شرط کبھی نہیں رکھیں گے۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تو جلد ہی یہاں کے باشندوں کی اکثریت اسلام میں داخل ہوگئی۔ اُس وقت مدینہ میں ایک شخص تھا جس کا نام عبداللہ بن اُبیّ تھا۔ وہ اپنے زمانہ کا ایک بڑا لیڈر تھا۔ وہ بھی اگر چہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ اسلام میں داخل ہوگیا مگر اُس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف حسد کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ اکثر آپ کے خلاف شر انگیز باتیں کیا کرتا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس معاملہ کا ذکر مدینہ کے ایک مسلمان اُسید بن حضیر سے کیا۔ اُنہوں نے

اس کا جواب دیتے ہوئے کہا: **یا رسول الله، ارفق به، فوالله لقد جاء نا الله بك وان قومه لینظمون له الخرز لیتوجّوه، فانه لیری أنك قد استلبته ملکاً**۔ (سیرت ابن ہشام، الجزء ۳، صفحہ ۳۳۶) یعنی اے خدا کے رسول، اُس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کیجئے، خدا کی قسم، اللہ آپ کو ہمارے پاس لے آیا اور اُس کی قوم کے لوگ اُس کے لیے تاج تیار کر رہے تھے تا کہ وہ اُس کو اپنا بادشاہ بنائیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ آپ نے اُس کا مقام اُس سے چھین لیا ہے۔

یہ حسن اعراض کی ایک حکیمانہ مثال ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ عبداللہ بن ابیّ کی شرانگیزی کا جواب سختی کے ساتھ دیا جاتا۔ صحابی نے گویا اپنے جواب میں یہ بتایا کہ اس معاملہ میں سختی کی ضرورت نہیں۔ حسن اعراض ہی اس مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے کافی ہے۔

۴۔ اوپر ہجر جمیل کی وہ مثالیں ہیں جو سطور میں ہوتی ہیں۔ اب ایک بین السطور کی مثال لیجئے۔ جب کسی معاملہ میں ہجر جمیل کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اُس میں ایک اور بات پوشیدہ ہوتی ہے جو اگر چہ زبان سے بولی نہیں جاتی مگر وہ حقیقی مطلوب کے طور پر اس میں شامل رہتی ہے۔ اس کی ایک مثال حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہفتہ قیام فرمایا۔ اس دوران قریش نے مختلف قسم کی زیادتیاں کیں۔ مثلاً ایک صحابی کو تنہا پا کر اُنہیں تیر مار کر ہلاک کر دیا۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کے ساتھ باجماعت نماز ادا کر رہے تھے، اتنے میں قریش کے کچھ لوگ آئے اور آپ پر تیر برسانے لگے۔ اس طرح کی اشتعال انگیز صورت حال کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے دس سال کا امن معاہدہ کر لیا۔

اس معاہدہ کی دفعات حضرت عمر پر سخت ناگوار تھیں۔ وہ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہا: **یا أبابکر ألیس برسول الله، قال: بلی، قال: أولسنا بالمسلمین، قال: بلیٰ، قال: أولیسوا بالمشرکین؟ قال: بلی، قال: فعلام نعطی الدنیة فی دیننا؟**۔ (السیرۃ النبویۃ لابن کثیر ۳/۳۲۰)۔ یعنی اے ابوبکر، کیا محمد اللہ کے رسول نہیں، اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ

کیا ہم مسلمان نہیں، اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ کیا وہ مشرک نہیں، اُنہوں نے کہا کہ ہاں۔ عمر نے کہا کہ پھر ہم اپنے دین میں یہ ذلت کیوں گوارا کریں۔ روایات کے مطابق، حضرت عمر نے یہی بات خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کہی۔

یہاں غور طلب امر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی زیادتیوں کے باوجود اُن کی یک طرفہ شرطوں پر دس سال کا جو امن معاہدہ کیا تھا، وہ ایک نہایت اہم اسلامی مصلحت کی بنا پر تھا۔ اور وہ مصلحت یہ تھی کہ دشمن سے معاہدہ امن کر کے معتدل حالات پیدا کئے جائیں تا کہ اسلامی دعوت کا عمل موثر طور پر جاری ہو سکے۔ مگر یہ نصیحت نہ امن معاہدہ کے اندر لکھی گئی اور نہ حضرت عمر اور دوسرے صحابہ کی شدید ناگواری کے باوجود آپ نے حدیبیہ کے مقام پر اس کا اعلان کیا۔

یہ ہجر جمیل (حسن اعراض) کا دوسرا پہلو ہے۔ یہ دوسرا پہلو ہمیشہ مخفی حالت میں ہوتا ہے۔ اس پہلو کو لفظوں میں پانا ممکن نہیں۔ اگر اُس کو لفظوں میں لکھا یا بولا جائے تو اُس کی ساری معنویت ختم ہو جائے گی۔

ایسی حالت میں لوگوں کے لیے صرف دو میں سے ایک رویّہ درست ہے۔ یا تو وہ اتنا زیادہ ہوش مند ہوں کہ سطور کے اندر بین السطور کو پڑھ لیں۔ وہ اعلان کے بغیر اُس کی اہمیت کو دریافت کر لیں۔ جن لوگوں کے اندر اتنی ہوش مندی نہیں ہے اُن کے لئے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنے لیڈر کی بصیرت پر اعتماد کریں۔ وہ صرف اعتماد اور حسن ظن کی بنا پر یہ عقیدہ رکھیں کہ اُن کے رہنما نے جو بات کہی ہے اُس کے پیچھے ضرور کوئی گہری مصلحت ہوگی۔ ہمارا کام اپنے رہنما کی اتباع کرنا ہے، نہ کہ اُس کی دیانت داری (integrity) پر شک کرنا۔

۵۔ صُلح حدیبیہ بظاہر ایک ایسی صُلح تھی جو دشمن کے مقابلہ میں دب کر کی گئی۔ مگر اس کے اندر ایک غیر اعلان شدہ مقصد چھپا ہوا تھا اور وہ تھا — ٹکراؤ کو اوائڈ کر کے اپنے لیے وقفۂ تعمیر حاصل کرنا۔ اگر یہ بات معاہدہ کے متن میں لکھ دی جاتی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے درمیان اُسی وقت اس کا اعلان کر دیتے تو صلح کے مقاصد سرے سے فوت ہو جاتے۔ اس قسم کے مقاصد ہمیشہ اعلان

کے بغیر ہوتے ہیں، نہ کہ اعلان کے ساتھ۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ یہاں تک کہ بعد کو جب اس کا عملی نتیجہ ظاہر ہو گیا، اُس وقت لوگوں نے جانا کہ اس صلح کے اندر کتنی بڑی مصلحت چھپی ہوئی تھی۔

یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابو بکر صدیق نے بعد کے زمانہ میں ان الفاظ میں بیان کی:
ما كان فتح اعظم في الإسلام من فتح الحديبية، ولكن الناس يومئذٍ قصر رأيهم عمّا كان بين محمد وربّه، والعباد يعجلون والله لا يعجل كعجلة العباد حتى يبلغ الامور ما أراد ۔(حیاۃ الصحابۃ، ۱/۱۵۷) یعنی اسلام میں حدیبیہ کی فتح سب سے بڑی فتح تھی۔ لیکن معاہدہ کے دن لوگوں کو اس بات میں رائے قائم کرنے میں کوتاہی ہوئی جو محمد اور آپ کے رب کے درمیان تھا۔ انسان عجلت پسند ہے اور اللہ انسانوں کی طرح عجلت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ امور کو وہاں تک پہنچا دے جو وہ چاہتا ہے۔

۶۔ ہجر جمیل (حسن اعراض) سادہ طور پر محض ایک بچاؤ کی تدبیر نہیں، بلکہ وہ با مقصد انسان کی سوچی سمجھی ایک مستقل اخلاقی روش ہے۔ با مقصد انسان کے سامنے ایک متعین منزل ہوتی ہے، جہاں پہنچنا اُس کا سب سے بڑا کنسرن (concern) ہوتا ہے۔ اس لیے وہ راستہ کے ہر اُلجھاؤ سے اپنے آپ کو دور رکھتا ہے تا کہ وہ کسی رُکاوٹ کے بغیر اپنی آخری منزل تک پہنچ سکے۔

جیسا کہ معلوم ہے، قدیم مکہ کے لوگوں نے پیغمبر اسلام کو بہت زیادہ ستایا تھا۔ آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اتنا زیادہ تشدد کیا کہ آپ کو اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ چھوڑ دینا پڑا۔ اس ترک وطن کے بعد بھی وہ آپ کے خلاف مسلسل جارحیت کرتے رہے۔

آخر کار وہ وقت آیا جب کہ پیغمبر اسلام اللہ کی مدد سے مکہ کے فاتح بن گئے۔ اب وقت تھا کہ ماضی کے ظلم کی اُنھیں سزا دی جائے۔ عام رواج کے مطابق، اُن کو قتل کر دینا عین جائز تھا۔ مگر پیغمبر اسلام نے اُن لوگوں کے ساتھ ہجر جمیل کی روش اختیار کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ فتح مکہ کے بعد جب قریش کے یہ مجرمین آپ کے سامنے حاضر ہوئے تو آپ نے اُن سے پوچھا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں

تمہارے ساتھ کیا سلوک کروں گا۔ اُنہوں نے کہا کہ: اخ کریم و ابن اخ کریم ۔(آپ شریف بھائی ہیں اور شریف بھائی کے بیٹے ہیں)۔

پیغمبر اسلام نے اس کے بعد فرمایا کہ ٹھیک ہے۔ میں تمہارے بارہ میں وہی کہوں گا جو پیغمبر یوسف نے اپنے بھائیوں کے بارے میں کہا۔ یعنی لاتثریب علیکم الیوم (یوسف ۹۲) آج تمہارے اوپر کوئی الزام نہیں۔ یہ کہہ کر آپ نے فرمایا کہ: جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو۔ اس طرح آپ نے اُن تمام لوگوں کو آزاد کر دیا جو اس سے پہلے آپ کے خلاف کھلے دشمن بنے ہوئے تھے۔

پیغمبر اسلام کا یہ عمل ایک بامقصد انسان کے عمل کی ایک اعلیٰ مثال تھی۔ پیغمبر اسلام کا مقصد یہ تھا کہ آپ بیت اللہ کو بتوں سے پاک کریں۔ مکہ کے لوگوں کو شرک سے نکال کر اُنہیں خدائے واحد کا پرستار بنائیں۔ اپنے دشمن انسان کو دوست انسان میں تبدیل کرکے، توجیہہ کی بنیاد پر وہ انقلاب لائیں جس کے لیے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔

پیغمبر اسلام کے یک طرفہ حسن سلوک کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکّہ کے یہ تمام لوگ اسلام میں داخل ہو گئے۔ راوی کہتے ہیں کہ: فخرجوا کانما نشروا من القبور، فدخلوا فی الإسلام (حیاۃ الصحابۃ ۱/۱۷۵) یعنی پھر وہ لوگ وہاں سے اس طرح نکلے جیسے کہ وہ قبروں سے نکلے ہوں اور وہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

پیغمبر اسلام اگر اس کے برعکس اُن دشمنوں سے اُن کی ظالمانہ روش کا انتقام لیتے تو اس کے بعد یہ ہوتا کہ وہاں انتقام در انتقام کا دور چل پڑتا۔ ایک انتقام کے بعد دوسرا انتقام شروع ہو جاتا اور پھر حالات ایسا منفی رُخ اختیار کر لیتے کہ سارا تعمیری منصوبہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔

غیر فطری ردّعمل

جب کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے تو اُس کے مقابلہ میں آدمی کی روش کی دو مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک جذباتی ردّعمل کا طریقہ، اور دوسرا غیر جذباتی ردّعمل کا طریقہ۔ جذباتی ردّعمل عین وہی چیز ہے جس کو میڈیکل اصطلاح میں الرجی (alergy) کہا جاتا ہے۔ الرجی کی تعریف اس طرح کی

جاتی ہے کہ الرجی نام ہے، معتدل حالات میں غیر معتدل ردعمل کا۔

Abnormal reaction to normal things.

مثلاً اپنے خلاف تنقید کوسُن کر غصہ ہونا، اسی قسم کی ایک الرجی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کی کسی بات پر تنقید کرتا ہے تو اُس کا معتدل اور فطری ردعمل یہ ہے کہ آپ کھلے ذہن کے ساتھ اُس کو سنیں اور کھلے ذہن کے ساتھ اُس پر غور کریں۔ اگر تنقید غلط ہے تو آپ کو چاہئے کہ آپ دلیل کے ساتھ اُس کا جواب دیں اور اگر تنقید درست ہے تو سیدھی طرح اُس کو مان لیں۔ اس کے برعکس تنقید کوسُن کر بگڑ جانا تنقید کا غیر معتدل اور غیر فطری انداز میں جواب دینا ہے۔ پہلی صورت مریضانہ ذہنیت کا ثبوت ہے اور دوسری صورت صحت مند ذہنیت کا ثبوت۔

اسی طرح مخالفانہ نعرہ کوسُن کر مشتعل ہو جانا، توہین کے کسی معاملہ پر بھڑک اُٹھنا، اپنے راستہ میں کوئی رکاوٹ دیکھ کر بگڑ جانا، اپنی سوچ کے خلاف سوچ کو برداشت نہ کرسکنا، یہ سب جذباتی ردعمل کی صورتیں ہیں۔ ایسے لوگ ہمیشہ دوسروں کے خلاف نفرت اور تشدد میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے مثبت اور تعمیری رخ کا تجربہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

اس کے برعکس دوسرا طریقہ غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ ہے۔ اسی کو قرآن میں ہجر جمیل کہا گیا ہے۔ یعنی جب اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات پیش آئے تو مشتعل نہ ہو کر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرنا، اور سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت معتدل انداز میں اس کا جواب دینا۔

اس معتدل جواب کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ سادہ طور پر بس اُس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ یعنی وہی رویہ جس کو عام زبان میں اس طرح بیان کیا جاتا ہے ——— کتّے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

اسی طرح کبھی ہجر جمیل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مخالف گروہ کی بدعملی کا جواب خوش عملی سے دیا جائے۔ اس کے پست اخلاق کے مقابلہ میں برتر اخلاق کا طریقہ اختیار کر کے اس کو مغلوب کر لیا جائے۔ اسی طرح کبھی حالات کا تقاضا یہ ہوسکتا ہے کہ دباؤ کی سیاست (pressure tactics) کا

طریقہ اختیار کرکے اس کو خاموش ہونے پر مجبور کردیا جائے۔

ہجر جمیل کی کوئی ایک لگی بندھی صورت نہیں۔ حالات کے اعتبار سے اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ تاہم جو صورت بھی اختیار کی جائے وہ سوچے سمجھے منصوبہ کی بنیاد پر ہوگی، نہ کہ بلاسوچے سمجھے ردعمل کی حیثیت سے۔ اس کا بنیادی مقصد اعراض کرنا ہوگا، نہ کہ اُلجھ جانا۔ وہ ہمیشہ امن کے اصول پر ہوگی، نہ کہ تشدد کے اصول پر۔ اس کے پیچھے کبھی بھی نفرت اور انتقام کا جذبہ نہیں ہوگا بلکہ صرف یہ جذبہ ہوگا کہ کسی نہ کسی طرح حسن تدبیر کے ذریعہ معاملہ کو ٹال دیا جائے تاکہ زندگی کی گاڑی معمول کے مطابق اپنے مطلوب رُخ پر چلنے لگے۔

ہجر جمیل کا نشانہ خارجی مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ آدمی کی خود اپنی ذات ہوتی ہے۔ ہجر جمیل کا نشانہ یہ نہیں ہوتا کہ خود مسئلہ کا خاتمہ کردیا جائے۔ اُس کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ مسئلہ کو اپنے خلاف مسئلہ بننے سے روک دیا جائے۔

جنگ سے امن تک

قرآن میں دو مقام پر یہ آیت آئی ہے کہ فتنہ کو ختم کرنے کے لئے جنگ کرو (و قاتلو هم حتى لا تكون فتنة)۔اس آیت میں فتنہ سے مراد مذہبی جبر (religious persecution) ہے۔اس آیت کے ذریعہ رسول اور اصحاب رسول کو حکم دیا گیا کہ تم لوگ مذہبی جبر کے موجودہ نظام کو توڑ دو تا کہ دنیا میں مذہبی آزادی کا ماحول قائم ہو جائے۔ جو لوگ اللہ کے دین کو اختیار کرنا چاہیں اُن کے راستہ میں کوئی پابندی باقی نہ رہے۔ واضح ہو کہ پیغمبر اسلام کے معاصر قوتوں نے آپ کے خلاف خود ہی بدء (التوبہ ۱۳) کا عمل کیا۔اس طرح اُنہوں نے جارحیت کا آغاز کر کے فتنہ کے خلاف آپ کے آپریشن کو دفاعی جنگ کی صورت دے دی۔

اس آیت میں ایک معلوم اور متعین مقصد کے لیے جنگ کا حکم دیا گیا تھا، اور وہ تھا، مذہبی جبر کا خاتمہ۔اس آیت کو لے کر کسی اور مقصد کے لیے جنگ چھیڑنا درست نہ تھا۔مگر بعد کے زمانہ میں ایسا کیا گیا کہ قتالِ فتنہ کے حکم کی توسیع کر کے اُس کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک انحراف (deviation) یا گاڑی کا اپنی پٹری سے اُترنا (derailment) تھا۔مگر ایسا ہوا، اور اس کا سلسلہ کسی نہ کسی عنوان سے آج تک جاری ہے۔

۱۔ اس سلسلہ میں پہلا انحراف اصحابِ رسول کی دوسری نسل (second generation) میں پیش آیا۔ اس معاملہ میں دو نام زیادہ نمایاں ہیں۔ ایک الحسین بن علی (م ۶۱ ھ) اور دوسرے عبداللہ بن الزبیر (م ۷۳ ھ)۔ دونوں حضرات نے اموی حکمراں یزید بن معاویہ کے خلاف خروج (بغاوت) کیا۔دونوں حضرات نے اپنے عمل کے وجہ جواز کے طور پر یزید کے ظلم کا حوالہ دیا۔دوسرے لفظوں میں یہ کہ جس قتال فتنہ کا تعلق مذہبی جبر سے تھا اُس میں تصرف کر کے اُس کو اُنہوں نے سیاسی بدعنوانی (political corruption) تک وسیع کر دیا۔

قتال فتنہ کے حکم کی یہ توسیع بلا شبہہ ایک اجتہادی خطا تھی۔اس کا قطعی ثبوت یہ ہے کہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے واضح طور پر یہ حکم دیا تھا کہ میرے بعد حکمرانوں کے بگاڑ کو لے کر ہرگز اُن کے خلاف خروج نہ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں حضرات کی جنگوں کے وقت صحابۂ کرام کی بڑی تعداد موجود تھی، مگر وہ ان جنگوں میں شریک نہیں ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے واضح طور پر اعلان کیا کہ بعد کے زمانہ کی یہ جنگ قتال فتنہ کے حکم سے انحراف ہے، نہ کہ اُس کا اتباع (صحیح البخاری، کتاب التفسیر)

۲۔ اس سلسلہ کا دوسرا انحراف زیادہ بڑے پیمانہ پر خلافت راشدہ کے بعد شروع ہوا اور پھر تقریباً ہزار سال تک جاری رہا۔ یہ انحراف مسلم حکمرانوں کی طرف سے کیا گیا۔ اُنھوں نے مذہبی جبر کے خلاف جنگ کے مفہوم میں اضافہ کر کے اُس کو مسلم سلطنت کی توسیع (political expansion) کے معنیٰ میں لے لیا۔ وہ پوری دنیا میں مسلم سلطنت کی توسیع کے لیے لڑائیاں لڑتے رہے۔

قتال فتنہ کے حکم کی یہ توسیع بھی بلاشبہہ ایک انحراف تھی۔ قرآن میں امت کو جو عالمی مشن دیا گیا تھا وہ شہادت علی الناس تھا، نہ کہ لوگوں کے اوپر اپنا سیاسی اقتدار قائم کرنا۔ یہی بات پیغمبر اسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس طرح فرمائی کہ اللہ نے مجھ کو سارے انسانوں کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ اس لیے تم میرے لائے ہوئے پیغام کو میری طرف سے تمام دنیا والوں تک پہنچا دو (فأدوا عنی) اس اعتبار سے بعد کے دور میں مسلمانوں کا اصل کام دعوت الی اللہ تھا، نہ کہ اقتدار کی سیاست چلانا۔

۳۔ اس سلسلہ کا تیسرا شدید تر انحراف وہ ہے جو موجودہ زمانہ میں پیش آیا۔ یہ کچھ مسلم مفکرین کی طرف سے مذکورہ قرآنی آیت کی نام نہاد انقلابی تفسیر تھی۔ ان لوگوں نے آیت کے حکم میں خود ساختہ توسیع کر کے اُس کو قتال برائے تنفیذ احکام کے معنیٰ میں لے لیا۔ اُنھوں نے کہا کہ اس آیت کے مطابق، ہر زمانہ کے مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ حکمرانوں سے جنگ کر کے اسلام کے احکام کو ہر جگہ نافذ کریں۔

قتالِ فتنہ کے حکم میں یہ توسیع ایک مہلک قسم کا انحراف ہے۔ اس نے مسلمانوں کے اندر غلط طور پر یہ ذہن پیدا کیا کہ ہر جگہ اسلامی حکومت قائم کرنا اُن کا مذہبی فریضہ ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر جگہ جہاد کے نام پر تشدد ہونے لگا۔ کچھ مسلمان گن اور بم لے کر دنیا والوں پر ٹوٹ پڑے۔ دوسرے مسلمان

جنھوں نے اس متشددانہ فعل میں عملاً شرکت نہیں کی، وہ بھی اس انقلابی نظریہ سے اتنا مسحور ہوئے کہ وہ اس کی ہمت نہ کر سکے کہ وہ کھُل کر اُس کی مذمت کریں اور اُس کے غیر اسلامی ہونے کا اعلان کریں۔

بیسویں صدی عیسوی پوری کی پوری اسلام کے نام پر اس غیر اسلام کا نمونہ بن گئی۔ اس کا نتیجہ دو مہلک صورتوں میں برآمد ہوا۔ ایک، اسلام کی بدنامی۔ ساری دنیا میں اسلام خلاف واقعہ طور پر نفرت اور تشدد کا مذہب سمجھا جانے لگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ لندن کے مشہور انگریزی روزنامہ میں اسلام کے بارے میں ایک آرٹیکل چھپا جس کا عنوان یہ تھا ـــــ ایک مذہب، جو تشدد کو جائز قرار دیتا ہے:

A religion that sanctions violence.

دوسری خرابی یہ ہوئی کہ موجودہ زمانہ میں اسلامی دعوت کے حق میں جو نئے قیمتی امکانات پیدا ہوئے تھے وہ استعمال ہونے سے رہ گئے۔ مسلمان خودساختہ جہاد کے نام سے اپنے آپ کو بے فائدہ طور پر ہلاک کرتے رہے، وہ جدید مواقع کو استعمال کرکے اسلام کا حیات بخش پیغام دوسروں تک نہ پہنچا سکے۔

اکیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے لیے پہلا ضروری کام اسی غلطی کی تصحیح ہے۔ کوئی بھی دوسرا کام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اسلام کے نام پر ہونے والے تشدّد کو فوری طور پر اور مکمل طور پر بند کر دیا جائے۔ اس معاملہ میں کسی بھی عذر کو، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی سنگین ہو، رکاوٹ نہ بنایا جائے۔ موجودہ زمانہ میں اسلام کے حقیقی احیاء کا نقطۂ آغاز یہی ہے۔ نفرت اور تشدد کے ماحول کو ختم کرکے اہلِ اسلام سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں، اس کے بغیر کچھ بھی نہیں۔

امن برائے امن

امن (peace) کیا ہے۔ اہلِ علم اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ امن عدمِ جنگ (absence of war) کا نام ہے۔ یعنی جنگ نہ ہو رہی ہو تو کہا جائے گا کہ امن قائم ہے۔ جنگ کی حالت نہ ہونے کا نام امن کی حالت ہے۔ جو لوگ اپنے کسی حق (right) کے نام پر متشددانہ جنگ کر رہے ہیں، وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ امن مع انصاف (peace with justice)

کا نام امن ہے۔ جس امن سے انصاف حاصل نہ ہو وہ امن بھی نہیں۔

یہ دوسرا نظریہ ایک غلط سوچ کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ اس طرح سوچیں اُن کو نہ کبھی امن ملے گا اور نہ کبھی انصاف۔ حقیقت یہ ہے کہ امن کا مقصد مواقع (opportunities) کو حاصل کرنا ہے، نہ کہ انصاف کو حاصل کرنا۔ امن بجائے خود کسی کو انصاف نہیں دیتا۔ امن صرف یہ کرتا ہے کہ وہ معتدل حالات قائم کر دیتا ہے جس میں عمل کر کے انصاف یا حق حاصل کیا جا سکے۔

موجودہ دنیا میں جب بھی کسی کو کوئی چیز ملتی ہے وہ اُس کے اپنے عمل کے نتیجہ میں ملتی ہے۔ امن کا فائدہ صرف یہ ہے کہ وہ آپ کے حق میں وہ معتدل حالات پیدا کر دے جس میں آپ کے لیے اپنے موافق منصوبہ بندی کرنا ممکن ہو جائے۔ جنگ وتشدد کے حالات کام کے مواقع کو برباد کرتے ہیں۔ جب کہ امن اور صلح کے حالات کام کرنے کے تمام دروازے اس طرح کھول دیتے ہیں کہ اُس کا کوئی دروازہ بند نہیں رہتا۔

جنگ کا دور ختم

پائرس (Pyrrhus) قدیم یونان کا ایک بادشاہ تھا۔ وہ ۳۱۹ ق م میں پیدا ہوا، اور ۲۷۲ ق م میں اُس کی وفات ہوئی۔ ۲۷۹ ق م میں اُس کی لڑائی رومیوں (Romans) سے ہوئی۔ اس جنگ میں شاہ پائرس جیت گیا۔ مگر جب لڑائی ختم ہوئی تو اُس کی اقتصادیات اور اُس کی سیاسی اور فوجی طاقت پوری طرح تباہ ہو چکی تھی۔ اسی واقعہ سے پِرک وکٹری (Pyrrhic Victory) کی اصطلاح بنی ہے، یعنی تباہ کن فتح۔

قدیم زمانہ میں پرک وکٹری یا تباہ کن فتح کا واقعہ بہت کم پیش آسکتا تھا۔ مگر موجودہ زمانہ میں جدید ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد ہر جنگ تباہ کن جنگ بن چکی ہے۔ اب جنگ جیتنے والے اور جنگ ہارنے والے کے درمیان اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ اخباروں میں دونوں کی خبریں الگ الگ الفاظ میں چھپتی ہیں، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں کا معاملہ ایک ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ہار بھی ہار ہے اور جیت بھی ہار۔

موجودہ زمانہ میں جنگ صرف خودکشی ہے، جنگ اب کسی مثبت مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں۔ کسی قوم سے کوئی چیز کھوئی گئی ہو تو اُس کے لیے صبر ہے، نہ کہ جنگ۔ کیوں کہ جنگ اب اس کے لیے محرومی پر ذلت کا اضافہ ہے۔ امن کا بدل جنگ نہیں، امن کا بدل گفت وشنید ہے۔

اس معاملہ کی ایک مثال پاکستان کی تاریخ میں ملتی ہے۔ پاکستان ۱۹۴۷ میں بنا۔ اس وقت بنگلہ دیش پاکستان کا مشرقی حصہ تھا۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ بنگلہ دیش پاکستان سے پوری طرح الگ ہوگیا۔ آخر کار پاکستان نے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے اس جغرافی محرومی پر صبر کرلیا۔ اگر پاکستان ایسا نہ کرتا تو وہ اپنے کھوئے ہوئے حصہ کی خاطر اپنے بقیہ حصہ کو بھی تباہ کرلیتا۔ جنگ کا مطلب نتیجہ کے اعتبار سے یہ ہے کہ جو کچھ بچا ہے اُس کو بھی کھودیا جائے، جزئی محرومی کو کلی محرومی بنادیا جائے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جنگ اب کسی کے لیے بھی کوئی انتخاب (option) نہیں۔ آج کی جنگ میں ہارنے والے کے لیے بھی ہار ہے اور جیتنے والے کے لیے بھی ہار۔ تاہم اس میں مایوسی کی کوئی ضرورت نہیں۔ دورِ جدید نے اگر ایک طرف جنگ کو ناممکن بنادیا ہے تو دوسری طرف جدید دور کے نتیجہ میں ایسی انقلابی تبدیلیاں ظہور میں آئی ہیں کہ کوئی بھی محرومی کسی کے لیے محرومی ثابت نہ ہو۔ آج کوئی فرد یا گروہ، خواہ وہ کسی بھی حال میں ہو، ازسرِ نو اپنی منصوبہ بندی کرکے دوبارہ پہلے سے زیادہ بڑی کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔ کھونے کے بعد وہ کامیابی کے نئے امکانات کو پاسکتا ہے

موجودہ زمانہ میں کمیونیکیشن نے چھوٹے ملک اور بڑے ملک کے فرق کو مٹا دیا ہے۔ گلوبلائزیشن کے جدید دور نے جغرافی محدودیت کے تصور کو عملاً غیر موثر بنادیا ہے۔ جدید تبدیلیوں کے بعد اب جنگ کی حیثیت کسی صحت مند انتخاب کی نہیں رہی۔

اب جنگ سادہ طور پر صرف جنگ نہیں، وہ غصہ اور نفرت اور مایوسی کے تحت پیش آنے والا ایک منفی واقعہ ہے، نہ کہ کسی تعمیری منصوبہ بندی کا مثبت نتیجہ۔ اب جنگ صرف خودکشی کی مایوسانہ چھلانگ ہے، وہ کسی صحت مند ذہن کے تحت کیا ہوا مفید اقدام نہیں۔

صحبت کا فلسفہ

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو اسلام میں جو امتیازی درجہ ملا وہ صحبت رسول کی بنا پر تھا۔ یہ بات بجائے خود صحیح ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ صحبت کوئی پُر اسرار (mysterious) چیز ہے اور اُس کی پُر اسرار تاثیر کے نتیجہ میں اصحاب رسول کو مجرد صحبت کی بنا پر خود بخود یہ فائدہ حاصل ہوا۔ یہ نظریہ علمی طور پر درست نہیں۔ وہ اس معاملہ کی پوری توجیہہ نہیں کرتا۔ مثلاً اس نظریہ میں اس واقعہ کی توجیہہ موجود نہیں کہ مدینہ کے سیکڑوں دوسرے لوگ جو بظاہر ایمان لائے اور پیغمبر کی صحبت میں بار بار بیٹھے، مگر وہ آپ کی صحبت سے فیض حاصل نہ کر سکے اور اسلام کی تاریخ میں منافق کہلائے گئے۔

اصل یہ ہے کہ کسی انسان کے لیے اعلیٰ ایمان حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایک ہے، اور وہ ہے معرفت یا ذہنی ارتقاء۔ ایمان قبول کرنے کے بعد آدمی کے اندر معرفت کے رُخ پر ایک تفکیری عمل (thinking process) جاری ہوتا ہے۔ یہ تفکیری عمل ہی دراصل کسی مومن کے لیے اعلیٰ ایمانی درجہ حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

پیغمبر کی صحبت میں دراصل یہی تفکیری عمل جاری رہتا تھا۔ لوگ آپ کی باتوں کو سنتے، وہ آپ کی باتوں کو اپنے ذہن میں اس طرح جگہ دیتے کہ وہ اُن کے ذہن میں ہلچل پیدا کر دیتا۔ اس طرح اُن کے اندر تفکیر کا عمل مسلسل ہر صبح و شام جاری رہتا۔ رسول اللہ کی صحبت اس تفکیری عمل کا ذریعہ تھی، اس لیے اُس کو صحبتِ رسول سے منسوب کیا گیا۔

تاہم پیغمبر کی باتیں سادہ طور پر صرف سننا کافی نہیں۔ پیغمبر کی باتیں صرف اُس انسان کے لیے مفید بنیں گی جو ریسپٹیو (receptive) ہو، جو یکسو ہو کر سنے اور پھر نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہو کر اُس کو قبول کر سکے۔ مخلص اہل ایمان میں یہ قبولیت (receptivity) پوری طرح موجود تھی اس لیے اُن کو صحبت رسول کا فائدہ حاصل ہوا۔ منافقین کے اندر یہ قبولیت موجود نہ تھی

اس لیے وہ صحبت رسول کے باوجود اُس کا فائدہ نہ پا سکے۔

صحابیت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ: **من رأى النبي صلى الله عليه وسلم مؤمنا به و مات على ذلك فهو صحابي** (جس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت ایمان میں دیکھا اور اس پر اس کی موت واقع ہوئی تو وہ صحابی ہے)۔ یہ تعریف صحابیت کی ایک ناقص تعریف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحبت کا مفہوم متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عملی طور پر صحبت کی صورت کیا تھی۔ وہاں ایسا نہ تھا کہ مجلس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش بیٹھے ہوں اور صحابہ بھی بعد از ایمان آپ کی صحبت میں خاموش بیٹھ کر صرف آپ کو دیکھتے رہتے ہوں۔ آپ کی صحبت میں ہمیشہ تفکر و تدبر کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ قرآن کے الفاظ میں یہ تعلیم حکمت کا ایک حلقہ ہوتا تھا۔

اس کے برعکس واقعات بتاتے ہیں کہ آپ کی صحبت ایک زندہ صحبت تھی۔ آپ ان لوگوں کے سامنے نعمت رب کی تحدیث فرماتے تھے (الضحیٰ)۔ آپ حاضرین کو اُس رزق رب سے باخبر کرتے تھے جس کی توفیق آپ کو اللہ کی طرف سے دی جاتی تھی (طٰہٰ) آپ قرآن کی آیتوں کی تشریح فرماتے تھے۔ آپ لوگوں کے سوال کا جواب دیتے تھے۔ آپ وہ باتیں فرماتے تھے جس سے لوگوں کا شک یقین میں بدل جاتا تھا۔ آپ لوگوں کو ذکر و دعا اور حمد و شکر کے کلمات کی تعلیم دیتے تھے۔ آپ لوگوں کو قرآن کے نازل شدہ حصّے سناتے تھے۔ آپ لوگوں کو پچھلے انبیاء اور پچھلے اہل ایمان کے پُر تاثیر واقعات کی خبر دیتے تھے، وغیرہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں بیٹھنے والے آپ سے اس قسم کی زلزلہ خیز باتیں سنتے تھے۔ آپ کی صحبت میں لوگوں کو اس طرح فکری ہلچل کی غذا ملتی تھی۔ آپ کی صحبت مکمل معنوں میں ایک زندہ صحبت تھی۔ آپ کی صحبت کا اس طرح زندگی بخش ہونا وہ اصل سبب تھا جس نے آپ کے ہم زمانہ اہل ایمان کو وہ عظیم درجہ دے دیا جس کو تاریخ میں اصحاب رسول کہا جاتا ہے۔ یہ فکری انقلاب کا ایک واقعہ تھا، نہ کہ سادہ طور پر صرف صحبت میں بیٹھنے کا۔

یہی معاملہ بعد کے دور کے علماء اور بزرگوں کا ہے۔ اُن میں سے کسی کی صحبت میں پُر اسرار تاثیر نہیں۔ یہ معاملہ تمام تر صحبت میں بیٹھنے والوں اور وہاں کی باتیں سننے والوں کی اپنی استعداد پر منحصر ہے۔ جن افراد کے اندر مادّہ قبولیت ہوگا وہ صحبت کا فائدہ حاصل کر سکیں گے۔ اور جن افراد کے اندر قبولیت کا مادّہ نہ ہوگا وہ فائدہ سے محروم رہیں گے۔ اس تشریح کی روشنی میں صحابی کی زیادہ صحیح تعریف یہ ہونا چاہئے: جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حالت ایمان میں دیکھا اور آپ کی صحبت سے استفادہ کیا اور اسی حال میں اُس کی موت ہوئی تو وہ صحابی ہے۔

عمومی صحبت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمومی صحبت جو اکثر مسجد میں یا کسی اور مجلس میں آپ کے اصحاب کو حاصل ہوتی تھی، اُس کی ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ آپ کی مجلسوں میں اصحابِ رسول کو کس طرح ذہنی تعمیر کی خوراک ملتی رہتی تھی۔

عن ابی ذر قال: قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: کیف أنتم و ائمة من بعدی، یستأثرون بهذا الفیٔ، قلت: اَمَا والذی بعثك بالحق، اضع سیفی علی عاتقی، ثم اضرب به حتی القاك، قال: اولا ادلك علی خیر من ذلك: تصبر حتی تلقانی (سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۲/ ۱۰۹۵)

ترجمہ: ابوذر کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اُس وقت تمہارا حال کیا ہوگا جب میرے بعد والے حکمراں آئیں گے۔ وہ فیٔ (اموال حکومت) کو اپنے لیے خاص کر لیں گے۔ میں نے کہا کہ اُس خدا کی قسم، جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے، میں تلوار کو اپنے کندھے پر رکھوں گا اور پھر اس سے اُنہیں ماروں گا یہاں تک کہ میں آپ سے مل جاؤں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا میں تم کو اس سے زیادہ بہتر بات نہ بتاؤں۔ تم صبر کرو، یہاں تک کہ تم مجھ سے مل جاؤ۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعہ اپنے اصحاب کو ایک نئی فکری روشنی دی۔ عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ جب اپنے حکمرانوں میں بگاڑ دیکھتے ہیں تو وہ اصلاح سیاست کے نام پر

اُن سے متشددانہ ٹکراؤ شروع کردیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ بگاڑ کے زمانہ میں حکمرانوں سے ٹکرا کر شہید ہوجانے سے زیادہ بہتر بات یہ ہے کہ اُن کے بگاڑ پر صبر کیا جائے، اور یہ سب اُس وقت تک جاری رکھا جائے جب کہ انسان کی موت آجائے۔

اس حدیث میں ''صبر'' سے مراد بے عملی نہیں ہے بلکہ اُس سے مراد ایک عظیم ترین عمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں سے نزاع کا طریقہ چھوڑ کر اپنے عمل کے لیے غیر نزاعی طریقہ ڈھونڈنا اور اُس پر کاربند ہوجانا۔ سیاسی نزاع کا طریقہ ہمیشہ بے صبری کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں نزاع کو ایوائڈ کرتے ہوئے عمل کرنا اُس وقت ممکن ہوتا ہے جب کہ آدمی اپنے جذبات پر کنٹرول کرکے صابرانہ انداز میں اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔

یہ ایک عظیم حکمت تھی جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کو تلقین فرمائی، صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین نے اس حکمت کو سمجھا اور اُس پر بھرپور عمل کیا۔ اس کے نتیجہ میں دوراوّل میں وہ عظیم اسلامی کام انجام پایا جو مذکورہ صابرانہ سیاست کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے، خلفائے راشدین کے بعد فوراً سیاست میں بگاڑ آگیا۔ مسلم حکمراں شریعت کے مقرر راستے سے ہٹ گئے۔ اُس زمانہ میں اگر اہلِ ایمان اپنے حکمرانوں سے متشددانہ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار کرتے تو اُس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پہلی اور دوسری نسل کے تمام بہترین لوگ قتل کردیئے جاتے۔ ابتدائی نسل کے وہ تمام تاریخ ساز لوگ قبروں میں دفن ہوجاتے۔ اسلام کی وہ عظیم تاریخ بننے کی نوبت ہی نہ آتی جو ان لوگوں کے ذریعہ بنی۔

مثلاً ابتدائی نسل کے یہی وہ لوگ ہیں جو سیاسی ٹکراؤ کے محاذ کو چھوڑ کر پُر امن دعوت کے میدان میں سرگرم ہوگئے اور کروڑوں لوگوں کو اسلام کے دائرہ میں داخل کردیا۔ اُنہوں نے دورِ پریس سے پہلے قرآن کی حفاظت اور اشاعت کا وہ عظیم کام انجام دیا جس کی مثال دوسری آسمانی کتابوں میں نہیں ملتی۔ اُنہوں نے لاکھوں حدیثوں کو جمع کرکے اُن کی چھان بین کی اور صحیح احادیث کے مجموعے تیار کرکے دنیا کو علم حدیث کا قیمتی تحفہ دیا۔ اُنہوں نے فقہ کی تدوین کا وہ عظیم

کام انجام دیا جس کی مثال کسی اور دین میں موجود نہیں۔

اسی طرح یہی ابتدائی نسل کے لوگ ہیں جنہوں نے حکومتی بگاڑ سے صرف نظر کرکے تمام اسلامی علوم کو مدون کیا۔ مثلاً سیرت، تاریخ، عقائد و کلام، عربی زبان کے لغات تیار کرنا، نحو اور صرف اور بلاغت اور دوسرے متعلق علوم کی ترتیب و تدوین۔

دور اول کے اہل ایمان کی انہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اسلام ہر اعتبار سے ایک محفوظ اور معتبر تاریخی دین بن گیا۔ جب کہ کسی بھی دوسرے مذہب کو یہ حیثیت حاصل نہیں۔ اور یہ تمام کارنامے صرف اس لیے انجام پائے کہ دور اول کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلام کی دی ہوئی رہنمائی کی بنا پر یہ حکیمانہ طریقہ اختیار کیا کہ انہوں نے سیاسی بگاڑ کے مقابلہ میں متشددانہ ٹکراؤ کا طریقہ چھوڑ دیا اور خدمتِ اسلام کے اُن بقیہ شعبوں میں پُر امن طور پر سرگرم عمل ہو گئے جو غیر نزاعی میدان میں اُنہیں حاصل تھا۔

توسیعی صحبت

قرآن کی سورہ نمبر ۲۶ میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت فرمایا ہے کہ وہ ساجدین کے درمیان تمہارے تقلّب کو دیکھ رہا ہے (الشعراء ۲۱۹) قرآن کی اس آیت میں ساجدین سے مراد مؤمنین ہیں۔ اور تقلّب کا مطلب ہے 'چلنا پھرنا۔ اس سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صبح وشام کی سرگرمیاں ہیں جو آپ اہل ایمان کی اصلاح کے لیے اور اُن کے اندر دینی شعور کو بیدار کرنے کے لیے انجام دیتےتھے۔ آپ کی یہ کوششیں بھی توسیعی مفہوم میں صحبت رسول کا ایک حصہ تھیں۔ ان کوششوں کے دوران آپ مسلسل اہل ایمان کے دینی شعور کو بیدار کرنے کی کوشش فرماتے تھے۔ توسیعی صحبت کے معاملہ کو سمجھنے کے لیے یہاں اس قسم کی ایک مثال نقل کی جاتی ہے:

عن ابی هریرہ ان رجلاشتم أبا بکر والنبی صلی الله علیه وسلم جالس فجعل النبی صلی الله علیه وسلم یعجب ویتبسم فلما اکثر رد علیه بعض قوله فغضب النبی صلی الله علیه وسلم وقام فلحقه ابوبکر فقال یا رسول الله کان

يشتمني وأنت جالس فلما رددت عليه بعض قوله غضبت وقمت قال انه كان معك ملك يردعنك فلما رددت عليه بعض قوله وقع الشيطان فلم أكن لأقعد مع الشيطان (مسند احمد، ۲/۴۳۶)

ترجمہ: ابوہریرہ بتاتے ہیں کہ ایک شخص نے ابوبکر کے خلاف سبّ وشتم کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر متعجب ہوتے رہے اور تبسم فرماتے رہے۔ جب اُس آدمی نے بہت زیادہ سخت کلامی کی تو ابوبکر نے اُس کی بعض باتوں کا جواب دے دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غصہ ہوگئے اور وہاں سے اُٹھ گئے۔ پھر ابوبکر چل کر اُن سے ملے۔ اُنہوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، وہ آدمی مجھ کو سبّ وشتم کر رہا تھا اور آپ بیٹھے رہے۔ پھر جب میں نے اُس کی بعض باتوں کا جواب دیا تو آپ غصہ ہوگئے اور وہاں سے اُٹھ کر چلے آئے۔ آپ نے فرمایا کہ پہلے تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے بول رہا تھا۔ پھر جب تم نے اُس کی بعض باتوں کا جواب دیا تو (فرشتہ چلا گیا) اور شیطان آ گیا۔ تو میں نے شیطان کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہیں کیا۔

یہ اُس چیز کی ایک اعلیٰ مثال ہے جس کو ہم نے پیغمبر کے ذریعہ ملی ہوئی شعوری بیداری کہا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہر انسان کے اندر پیدائشی طور پر دو قسم کی صفات ہوتی ہیں ــــــ نفس امّارہ اور نفس لوّامہ۔ نفس امّارہ شیطان کی علامت ہے اور نفس لوّامہ فرشتہ کی علامت۔ ایک آدمی آپ کو گالی دے اور آپ چُپ رہیں تو گالی دینے والے کا نفس لوّامہ بیدار ہو کر اندر ہی اندر اُس کو ملامت کرتا رہتا ہے۔ یہ گویا آپ کی طرف سے فرشتہ کا جواب دینا ہے۔ اس کے برعکس جب آپ ایسا کریں کہ سخت کلامی کے جواب میں آپ بھی سخت کلامی کریں تو دوسرے آدمی کا نفس امّارہ متحرک ہو جائے گا۔ یہ آدمی کا شیطان کے زیر اثر آ جانا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس تلقین کے ذریعہ صحابہ کو ایک عظیم حقیقت بتائی۔ آپ نے صحابہ کے اندر وہ فکری روشنی پیدا کی جو ہر معاملہ میں اُن کی کامیابی کی ضامن بن جائے، خواہ وہ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد کے ذریعہ اہل ایمان کو ایک گہری سوچ عطا کی۔ آپ نے بتایا کہ ہر انسان کے اندر پیشگی طور پر دو مختلف قسم کی شخصیتیں چھپی ہوئی ہیں۔ ایک، تمہاری دشمن شخصیت اور دوسری، تمہاری دوست شخصیت۔ یہ تمہارے اپنے اختیار میں ہے کہ تم فریقِ ثانی کو اپنا دوست بناتے ہو یا اپنا دشمن۔ اگر تم نے فریقِ ثانی کے نفسِ امّارہ کو جگایا تو اُس کی دشمن شخصیت تمہارے حصہ میں آئے گی۔ اور اگر تم نے اُس کے نفس لوّامہ کو جگایا تو اُس کی دوست شخصیت تمہارے حصہ میں آئے گی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد کے ذریعہ اس اہم حقیقت کی طرف نشان دہی فرمائی کہ اس دنیا میں کچھ نہ کرنے کا نام بھی کرنا ہے اور کچھ نہ بولنے کا نام بھی بولنا۔ اگر ایک شخص آپ کے خلاف سبّ وشتم کر رہا ہے اور آپ جواب نہیں دیتے، تو اس کا مطلب سادہ طور پر یہ نہیں ہے کہ آپ نے جواب نہیں دیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خاموش رہ کر زیادہ طاقتور متکلم کو بولنے کا موقع دیا۔ یعنی خدا کے فرشتہ کو۔ اس طرح یہ ممکن ہوا کہ آپ جو کام کم موثر انداز میں انجام دیتے، اُس کو خدا کے فرشتہ نے زیادہ موثر انداز میں انجام دے دیا۔

چند اسلامی مسائل

موجودہ زمانہ میں ایک برائی ظاہر ہوئی ہے جس کو دہشت گردی (terrorism) کہا جاتا ہے۔ دہشت گردی کو عام طور پر کنڈم کیا جاتا ہے مگر دہشت گردی کیا ہے، اس کی کوئی واضح تعریف غالباً ابھی تک سامنے نہ آسکی۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے میں نے سمجھا ہے کہ دہشت گردی نام ہے، غیر حکومتی تنظیموں کا ہتھیار اُٹھانا (armed action by NGOs)۔

اسلام کے متفقہ اصول کے مطابق، جنگ کا اعلان صرف ایک قائم شدہ حکومت کا کام ہے (الرحیل للإمام) وہ چیز جس کو موجودہ زمانہ میں دہشت گردی کہا جاتا ہے، وہ سب کی سب غیر حکومتی تنظیموں کے مسلّح اقدام کے نتیجہ میں پیدا ہوئی ہے۔ اس قسم کی مسلّح تحریک بلاشبہہ اسلام میں ناجائز ہے۔ عوام کو پُر امن انداز میں اپنی بات کہنے کا حق ہے مگر کسی بھی عذر کی بنا پر مسلّح تحریک چلانا عوام کے لئے ہرگز جائز نہیں۔

مزید یہ کہ ایک قائم شدہ حکومت کے لیے بھی جنگی اقدام کی کئی لازمی شرطیں ہیں۔ مثلاً ایک قائم شدہ حکومت بھی صرف دفاعی جنگ کرسکتی ہے، جارحانہ جنگ چھیڑنے کا حق حکومت کو بھی نہیں۔ اسی طرح ایک جائز جنگ بھی اعلان کے ساتھ لڑی جائے گی، بلا اعلان جنگ (undeclered war) کی کوئی گنجائش اسلام میں نہیں۔ اسی طرح ایک جائز دفاعی جنگ میں بھی حکومت صرف مقاتل (combatants) پر وار کرسکتی ہے، غیر مقاتل (non-combatants) کو مارنا یا اُن کو نقصان پہنچانا جنگ کی حالت میں بھی ہرگز جائز نہیں۔

ان حقیقتوں کو سامنے رکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام میں جنگ کی صرف ایک قسم کا جواز ہے، اور وہ دفاعی جنگ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی جنگ، مثلاً ـــــ جارحانہ وار، پراکسی وار، گوریلا وار اور پھر بلا اعلان وار، یہ سب کی سب اسلام میں قطعی ناجائز ہیں۔ کسی بھی عذر کی بنا پر اس قسم کی جنگوں کو اسلامی جنگ قرار نہیں دیا جاسکتا۔

مذکورہ تعریف کے مطابق، دہشت گردی کی ہر تحریک یقینی طور پر ناجائز ہے، ایسی کسی تحریک کو اسلامی جہاد کا نام دینا اُس کو جائز نہیں بناتا۔ ایسی ہر کوشش گُناہ پر سرکشی کا اضافہ ہے، وہ یقینی طور پر ایسی کسی جنگ کا اسلامی جواز نہیں۔

کھلی مذمت ضروری

قرآن و حدیث میں اہل ایمان کو جو احکام دیے گئے ہیں اُن میں سے ایک حکم وہ ہے جس کو انکار منکر کہا جاتا ہے۔ یعنی برائی کو دیکھنے کے بعد کھلے الفاظ میں اُس کی مذمت کرنا۔ اس سلسلہ میں بتایا گیا ہے کہ کسی سماج میں اگر بُرائی ہو رہی ہو تو اُس کو دیکھ کر چپ رہنا ایک سنگین جرم ہے۔ کسی آدمی کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ وہ براہِ راست طور پر بُرائی میں شریک نہیں۔ اگر وہ برائی کو دیکھنے کے باوجود چپ رہے تو وہ بالواسطہ طور پر اُس کا مجرم قرار پائے گا۔

مثلاً موجودہ زمانہ میں مسلمان جگہ جگہ جہاد کے نام پر وہ کام کر رہے ہیں جس کو ساری دنیا کا پریس دہشت گردی کے عنوان سے رپورٹ کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس معاملہ میں دنیا کے تقریباً تمام مسلمان خدا کی نظر میں مجرم ثابت ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے علم کے مطابق، ساری دنیا میں کوئی بھی قابل ذکر مسلمان نہیں جو تشدد کی اس برائی کو کھلے طور پر کنڈم کرتا ہو۔

مسلمانوں کی ایک تعداد وہ ہے جو اس متشددانہ سرگرمی کو عین اسلامی جہاد قرار دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ خودکُش بمباری (suicide bombing) کو استشہاد (طلب شہادت) کا نام دے کر اُس کو عین درست بتاتی ہے۔ مسلمانوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو مذمت کے الفاظ بولتا ہے مگر حقیقت میں وہ مذمت نہیں ہوتی۔ مثلاً وہ کہیں گے کہ اسلام میں دہشت گردی نہیں، اسلام دہشت گردی کی اجازت نہیں دیتا۔ مگر وہ یہ نہیں کہیں گے کہ فلاں فلاں مقام پر مسلمان جو متشددانہ تحریک چلا رہے ہیں وہ دہشت گردی ہے اور وہ اسلام کے خلاف ہے۔ ایسی حالت میں اُن کی مذمت ایک خود فریبی کے سوا اور کچھ نہیں۔ مسلمانوں کا ایک اور گروہ ہے جو بظاہر نام لے کر مذمت کرتا ہے مگر اسی کے ساتھ وہ ایسے دفاعی الفاظ بھی بولتا ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ اس دہشت گردی کی اصل ذمہ داری مسلم دشمنوں کی ہے، نہ کہ خود مسلمانوں کی۔

مذمت کے یہ طریقے یقینی طور پر غیر اسلامی ہیں۔ مذمت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نہ صرف دہشت گردی کو خلاف اسلام بتایا جائے بلکہ مختلف مقامات پر جہاد کے نام پر جو دہشت گردی ہو رہی ہے اُس کو کھلے لفظوں میں رد کیا جائے اور کہا جائے کہ یہ جہاد نہیں ہے بلکہ فساد ہے۔

مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے طبقہ کی یہی مجرمانہ خاموشی ہے جس کی بنا پر یہ ہو رہا ہے کہ جہاد کے نام پر ہونے والا تشدد کسی طرح ختم نہیں ہوتا۔ اس مجرمانہ تشدد میں خود ساختہ مجاہدین اگر براہ راست شریک ہیں تو بقیہ مسلمان بالواسطہ طور پر اس میں شریک ہیں۔ اور اسلامی نقطۂ نظر سے، براہ راست شرکت اور بالواسطہ شرکت کے درمیان صرف ڈگری کا فرق ہے، اُن کے درمیان نوعیت کا کوئی فرق نہیں۔

ناکامی کا کیس

امن کی طاقت تشدد کی طاقت سے زیادہ ہے۔ مزید یہ کہ امن دانش مندوں کا طریقہ ہے اور تشدد نادانوں کا طریقہ۔ ایسی حالت میں جب کوئی شخص تشدد کرتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے زیادہ طاقتور طریقہ استعمال کرنے میں ناکام رہا۔ اسی طرح ایسا آدمی اپنے متشددانہ عمل سے یہ بھی ثابت کر رہا ہے کہ وہ اپنے مسئلہ کو حل کرنے کے معاملہ میں ایک نادان آدمی ثابت ہوا، نہ کہ دانش مند آدمی۔

امن اور تشدد سادہ طور پر صرف دو طریقے نہیں ہیں۔ بلکہ وہ انسانیت کے دو مختلف معیار ہیں۔ امن کا طریقہ اختیار کرنے والا آدمی اپنی انسانیت کو بلند کرتا ہے اور تشدد کا طریقہ اختیار کرنے والا آدمی اپنے آپ کو انسانیت کے اعلیٰ معیار سے نیچے گرا لیتا ہے۔

کوئی مسئلہ پیش آنے کے بعد جب ایک آدمی امن کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر مثبت سوچ کو فروغ دیتا ہے۔ وہ اپنے اخلاقی معیار کو بلند کرتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو بلندیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو عملی طور پر ثابت شدہ بناتا ہے۔ اس کے برعکس جب ایک آدمی اپنے مسئلہ کے حل کے لیے تشدد کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو انسانیت کے نچلے درجہ کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ اپنے انسان ہونے کی حیثیت کو عملی طور پر مشتبہ بنا رہا ہے۔

امن اور تشدد دونوں کسی انسان کی اصل حیثیت کی پہچان ہیں۔ایک طریقہ اگر انسان کو انسان ثابت کرتا ہے تو دوسرا طریقہ یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک حیوان تھا، اگر چہ ظاہری طور پر وہ ایک انسان دکھائی دے رہا تھا۔

مذہب خطرہ میں ہے

نفرت اور تشدد کا ایک سبب وہ جذباتی سیاست ہے جو اس نعرہ پر چلتی ہے کہ مذہب خطرہ میں ہے۔ کچھ لکھنے اور بولنے والے لوگ غلط یا مبالغہ آمیز تصویر پیش کر کے عوام کو یہ تاثر دیتے ہیں کہ اُن کا مذہب دوسروں کی طرف سے خطرہ میں ہے۔اب تحفظ مذہب کے نام پر جلسہ اور جلوس اور نعرے اور جھنڈے کی سیاست چل پڑتی ہے۔ یہ سیاست مذہب کو تو خطرہ سے نہیں بچاتی البتہ مذہب کو خطرہ سے بچانے کے نام پر پورے سماج کے امن کو تباہ کر کے اُس کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔

اگر مذہب خطرہ میں ہو تو ظاہر ہے کہ کوئی غیر ہوگا جو مذہب کو خطرہ میں ڈالے ہوئے ہوگا۔اس طرح ''مذہب خطرہ میں'' جیسی سیاست ایک گروہ کے دل میں دوسرے گروہ کے خلاف نفرت پیدا کرتی ہے۔ پھر نفرت کی سیاست سے جب مذہب کے خلاف مفروضہ خطرہ ختم نہیں ہوتا تو اس کے بعد لوگوں کے اندر مایوسی کی سیاست شروع ہوتی ہے۔ مایوسی کی سیاست اپنی آخری تدبیر کے طور پر تشدد کی سیاست جاری کر دیتی ہے۔ پھر جب تشدد کی سیاست کارگر ثابت نہیں ہوتی تو خودکُشی کی سیاست شروع ہو جاتی ہے۔ جوش میں بھرے ہوئے نوجوان اپنی بڑھی ہوئی نفرت کو اپنے مفروضہ دشمن کے خلاف خودکش بمباری کی صورت میں انڈیل دیتے ہیں۔ مذہبی خطرہ کی سیاست اپنی آخری حد پر پہنچ کر مذہبی خودکُشی کی سیاست بن جاتی ہے۔زندگی کے نام پر اُٹھنے والے لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے لیے اور دوسروں کے لیے صرف موت کا پیغام ثابت ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس تباہ کن سیاست سے نکلنے کا واحد حل یہ ہے کہ تشدد کو ایک ایسا فعل قرار دیا جائے جو ہر حال میں قابل ترک ہو۔کوئی بھی عذر، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی بڑا ہو، تشدد کے طریقہ کو استعمال کرنے کے لیے کافی نہ سمجھا جائے۔

موجودہ دنیا اختلافات کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی مسٹر ڈفرنٹ اور ہر عورت مز ڈفرنٹ ہے۔ اس لیے اس دنیا میں لازمی طور پر لوگوں کے درمیان طرح طرح کے اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ یہی اختلاف جذباتی صورت اختیار کرکے لوگوں کو نفرت اور تشدد تک پہنچا تا ہے۔ اور پھر سارا سماج قبرستان کا نمونہ بن جاتا ہے۔

اس مسئلہ کا ایک ہی حل ہے۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کے اندر یہ ذہن بنایا جائے کہ تم کو ہر حال میں امن کے دائرہ میں کام کرنا ہے۔ کسی بھی حال میں تم کو امن کے دائرہ سے باہر نہیں جانا ہے۔ یہ ذہن اُس وقت بن سکتا ہے جب کہ لوگوں کو اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ کیا جائے کہ اس دنیا میں کوئی کام صرف امن کے ذریعہ بنتا ہے، تشدد کے ذریعہ کبھی کوئی کام بننے والا نہیں۔ تشدد صرف تخریب میں معاون ہوتا ہے، تشدد کبھی تعمیر میں معاون نہیں ہوتا۔

''مذہب خطرہ میں'' جیسی سیاست کے ذریعہ کا یہ فائدہ تو ہوتا ہے کہ کچھ ہائی پروفائل میں بولنے والے لوگ قائد بن کر اُبھر آئیں۔ وہ وقتی طور پر لوگوں میں نمایاں ہو جائیں۔ اُن کے گرد عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو۔ مادّی رونقیں اُنہیں حاصل ہو جائیں۔ مگر جہاں تک مذہب اور اہلِ مذہب کا تعلق ہے، اُن کے حصہ میں صرف یہ آتا ہے کہ معتدل ماحول سے محروم ہو کر وہ نفرت کے ماحول میں جینے پر مجبور ہو جائیں۔ تشدد کا شکار ہو کر وہ اپنے مستقبل کو غیر محفوظ بنا لیں۔

مذکورہ قسم کی سیاست کا آخری نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ کچھ افراد ممتاز افراد (celebreties) بن کر نمایاں ہو جائیں۔ مگر یہ طریقہ مثبت معنوں میں قوم کی تعمیر نہیں کرتا اور نہ کر سکتا ہے۔ یہ طریقہ لیڈر سازی کے لیے کارآمد ہے، مگر وہ ملت سازی کے لیے ہرگز کارآمد نہیں۔

انتقام سے تشدد تک

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر ایک شخص کو دوسرے شخص سے کوئی تکلیف پہنچ جائے یا ایک گروہ کو دوسرے گروہ کی طرف سے کوئی ٹھیس پہنچے تو فوراً اُن کے اندر انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھتا ہے۔ وہ فریقِ ثانی سے انتقام لینے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ تاریخ کی اس وارننگ کو بھول

جاتے ہیں جو ہر جگہ خاموش الفاظ میں گونج رہی ہے ـــــــ انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا۔

چنانچہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف انتقام کی کارروائی کرتا ہے۔ پھر دوسرا فریق دوبارہ پہلے فریق سے انتقام لیتا ہے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے جو صرف اُس وقت ختم ہوتا ہے جب کہ دونوں اتنے تباہ ہو جائیں کہ وہ مزید انتقام لینے کے قابل نہ رہیں۔ کسی فرد یا گروہ کے خلاف کوئی قابل شکایت بات پیش آئے تو اُس کا حل جوابی کارروائی نہیں ہے بلکہ اُس کو درگذر کرکے آگے بڑھ جانا ہے۔ درگذر کرنے سے معاملہ پہلے ہی مرحلہ میں ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر درگذر نہ کیا جائے تو نفرت اور انتقام اور تشدد کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انتقام کا رُخ دوسرے کے خلاف ہوتا ہے مگر اس کا سب سے زیادہ شکار خود انتقام لینے والا بنتا ہے۔ انتقامی پالیسی کی بھاری قیمت اُس کو یہ دینی پڑتی ہے کہ اُس کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جائے۔ وہ اپنے وسائل کو اپنی تعمیر میں صرف کرنے کے بجائے اُنہیں صرف دوسرے کی تخریب میں صرف کرنے لگے۔ دوسرے فریق نے اگر آپ کو پچاس فی صد نقصان پہنچایا تھا تو آپ اپنی انتقامی کارروائی کے نتیجہ میں اپنی بقیہ پچاس فی صد طاقت کو بھی ضائع کر دیتے ہیں۔

انتقام کا مطلب یہ ہے کہ قاتلانہ حملہ کے بعد کوئی شخص خود اپنے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتقام ہر حال میں بُرا ہے اور انتقام نہ لیتے ہوئے معاملہ کو بھلا دینا ہر حال میں اچھا ہے۔ انتقام لینے والا اگر آپ کا دشمن تھا تو انتقام لے کر آپ خود اپنے دشمن بن جاتے ہیں۔ اور جو لوگ اپنے دشمن آپ بن جائیں اُن کو تباہی سے کون بچا سکتا ہے۔

جنگ کا زمانہ ختم

وسیع تر تقسیم میں جنگ کے دو دور ہیں۔ ایک وہ ابتدائی دور جب کہ جنگی مقابلہ کا فیصلہ تلوار کے ذریعہ ہوتا تھا۔ دوسرا دور جدید دور ہے جب کہ لڑائی میں بم کی طاقت استعمال کی جاتی ہے۔ دونوں دوروں میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ یہ کہ تلوار جب چلائی جاتی تھی تو وہ صرف ایک دشمن کی گردن کو

کاٹتی تھی۔ اب بم کے زمانہ میں جنگ کا مطلب یہ نہیں۔ اب جنگ کا مطلب صرف تباہی ہے۔ جو بم دشمن کے اوپر ڈالا جاتا ہے وہ مختلف پہلوؤں سے خود ڈالنے والے کے لیے بھی تباہی کا سبب بنتا ہے۔ ایسی حالت میں جنگ ایک بے فائدہ عمل بن چکی ہے۔ اب جنگ ایک دیوانگی ہے، نہ کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے اقدام۔

حقیقت یہ ہے کہ نئے ہتھیاروں کے ظہور کے بعد جنگ اب ایک قابلِ ترک چیز بن چکی ہے۔ جب جنگ مثبت معنوں میں بے نتیجہ ہو جائے تو ایسی حالت میں جنگ چھیڑنا ایک دیوانگی ہے، نہ کہ عقل مندی۔

زمانہ کے خلاف

موجودہ زمانہ گلوبلائیزیشن (globlisation) کا زمانہ ہے۔ ساری دنیا ایک گلوبل ویلیج کی مانند ہو گئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو موجودہ زمانہ میں تشدد یا مسلّح جدوجہد ایک ایسی چیز بن چکی ہے جو زمانہ کے خلاف عمل (anachronism) کی حیثیت رکھتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ ہتھیار کی لڑائی لڑ رہے ہیں اُن سے پوچھئے کہ وہ کیوں جنگ کر رہے ہیں تو وہ بتائیں گے کہ قائم شدہ حکومت کو بدلنے کے لیے وہ جنگ کر رہے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ ہم ایک نیا نظام بنانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لیے حکومت پر قبضہ کرنا ضروری ہے۔ مگر یہ بات صرف زمانہ سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔

موجودہ زمانہ میں ایسی تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ اب کسی کو حکومت پر قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ حکومت پر قبضہ کئے بغیر ہر وہ کام کر سکتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

برداشت کی ضرورت

عدم برداشت کا نتیجہ تشدد ہے، اور برداشت کا نتیجہ امن۔ انہی دو لفظوں میں امن اور تشدد کا خلاصہ پایا جاتا ہے۔ جس سماج میں برداشت کی صفت ہو، اس سماج میں امن کا ماحول رہے گا۔ اور جس سماج کے لوگوں میں برداشت کا مزاج نہ ہو وہاں تشدد ہونے لگے گا۔ اور تشدد نہ تشدد کرنے والے کے

لیے مفید ہے اور نہ اُن لوگوں کے لیے مفید جن کے اوپر تشدد کیا گیا ہے۔

برداشت ایک اعلیٰ اخلاقی اور انسانی صفت ہے۔ اس کے مقابلہ میں برداشت نہ کرنا ایک حیوانی صفت ہے۔ برداشت مجبوری نہیں، برداشت ایک اعلیٰ ترین عمل ہے۔ لوگ جس مقصد کو بے برداشت طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس کو برداشت کے ذریعہ زیادہ بہتر طور پر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ کوئی ناخوش گوار صورت حال پیش آنے پر آدمی جب بے برداشت ہوجائے تو وہ اپنے آپ کو مقابلہ کے لیے کمزور کرلے گا۔ لیکن جب وہ ناخوش گوار صورت حال میں برداشت کے رویّہ پر قائم رہے تو وہ اپنی ساری طاقتوں کو محفوظ رکھتا ہے۔ وہ زیادہ مؤثر طور پر پیش آمدہ صورت حال کا مقابلہ کرسکتا ہے۔

ناخوش گوار صورت حال پیش آنے کے باوجود بے برداشت نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی اپنے آپ پر کنٹرول کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ طاقت ہو کہ وہ اپنے آپ پر کنٹرول کرسکے، وہ اتنا زیادہ طاقتور ہوجاتا ہے کہ کسی کے لیے بھی اُس کو شکست دینا ممکن نہیں۔

امن کے فائدے

دنیا کے تمام اچھے کام پرامن کوشش کے ذریعہ ہوئے ہیں۔ تشدد کی طاقت سے کبھی کوئی اچھا کام نہیں ہوا۔ کوئی پُل، کوئی سڑک کبھی بھی تشدد کی طاقت سے نہیں بنے۔ سائنس کی دریافتیں اور ٹکنالوجی کی ترقیاں کبھی تشدد کی طاقت سے ظہور میں نہیں آئیں۔ تعلیم گاہیں اور تحقیق کے ادارے کبھی تشدد کی طاقت سے نہیں بنے۔ لوہے کا مشین میں ڈھلنا یا سٹی پلاننگ جیسے کام امن کے ذریعہ انجام پائے، نہ کہ تشدد کے ذریعہ۔ سماجی فلاح سے لے کر انفراسٹرکچر تک ہر کام ہمیشہ پُرامن تدبیروں کے ذریعہ تکمیل پذیر ہوئے ہیں۔

تشدد ایک تخریبی عمل ہے۔ اور ایک تخریبی عمل کے ذریعہ کبھی کوئی تعمیری واقعہ ظاہر نہیں ہوسکتا۔ یہ فطرت کا قانون ہے۔ اور فطرت کے قانون میں تبدیلی ممکن نہیں۔